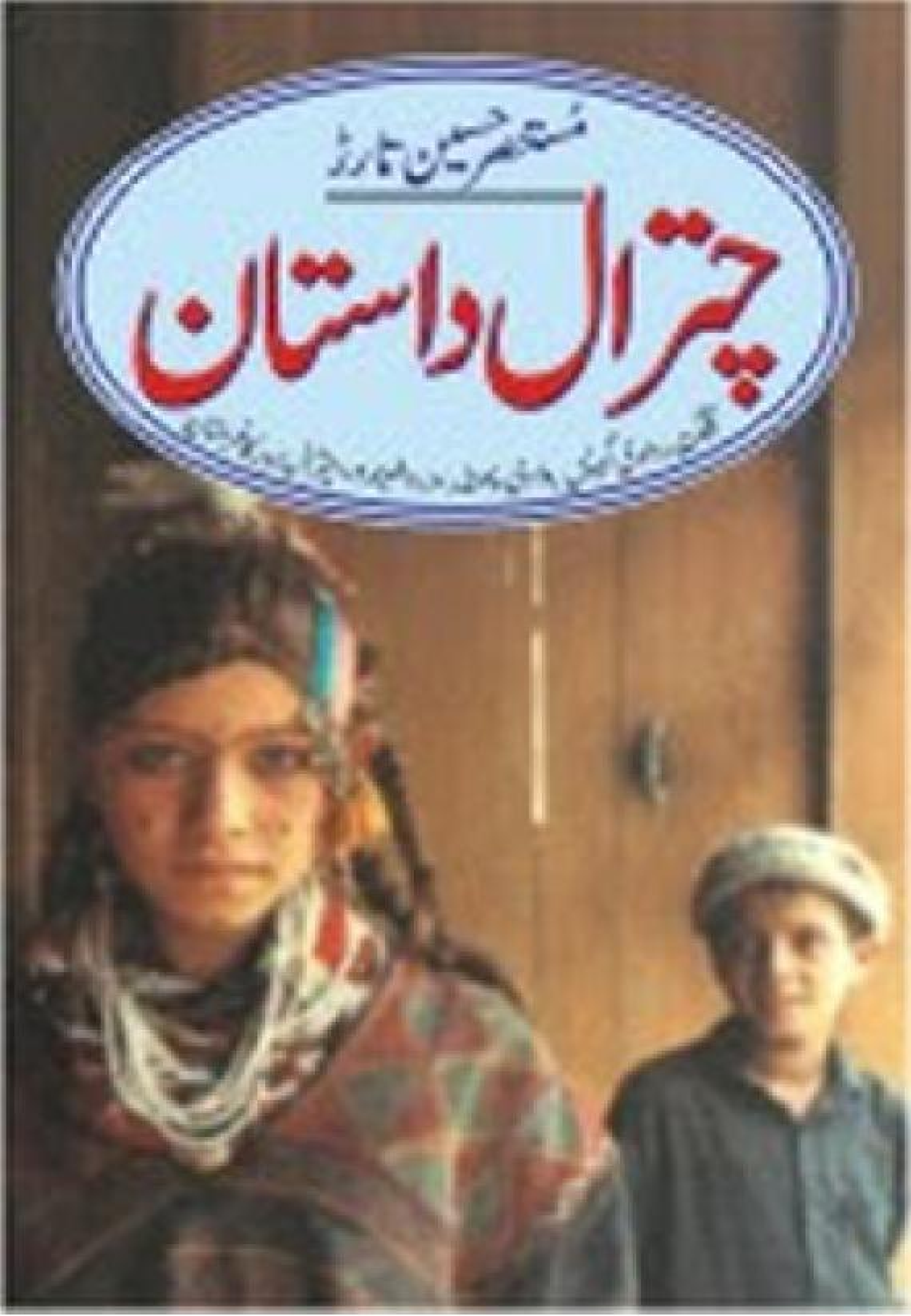

مستنصر حسین تارڑ
چترال داستان

فہرست

صفحہ نمبر	باب	مقام
7	"کچھ سفر بھولتے جاتے ہیں"	اسلام آباد
13	"پتن کی چرواہی اور سونے کا سترہ کلو وزنی ہار"	پتن
17	"وادی گوپس کے ڈائنا سورس اور سونے کے پرندے"	وادی گوپس
22	"وادی یاسین کا تختِ طاؤس اور اُس پر براجمان ایک دیوانہ"	وادی یاسین
28	"خلطی جھیل میں غرق چولہوں سے دھواں اُٹھتا تھا"	خلطی جھیل
38	"چھوٹا کشمیر اور کھڑکی میں فریم شدہ پھنڈر کی تصویر"	وادی پھنڈر
42	"وادی پھنڈر رحشر اور دریائے غذر 'غدر'"	وادی پھنڈر
46	"مغل منی ایچر تصویر اور کافر سلور ٹراؤٹ"	گلوغ
59	"لیل پوری پاگل خانہ اور بکرا نائٹ"	وادی پھنڈر
65	"بارست کے چشمے کا سیون اپ"	بارست
73	"لنگر کی شیشہ ندیوں میں تیرتے ہم.. اور مچھلیاں"	لنگر

چترال

صفحہ نمبر	باب	مقام
79	"ڈھلتی دوپہر میں درہ شندور کا آتش کدہ"	درہ شندور
86	"شندور ہٹ.. ایک سومنات جس میں شودر داخل ہو گئے تھے"	درہ شندور
94	"درہ شندور کے سنہری گھنے گم ہو گئے"	درہ شندور
98	"یور میجسٹی آپ ہرچین میں ہیں.. چترال میں ہیں"	ہرچین
105	"ہندوکش میں ایک کچا قلعہ 'توڑے دار بندوقیں اور رات"	ہرچین
111	"مستوج کا قلعہ - بلند چنار اور "یاک سرائے" کو جانے والا راستہ"	مستوج
116	"ترچ میر چوٹی کے قصے جو کرنل مبشر نے سنائے تھے"	ترچ میر
126	"بابا سیار - ریشن اور کوغزی کی مسجد"	کوغزی

چترال شہر	"چترال۔درہ لواری سرنگ اور بچھو"	132
چترال شہر	"قلعہ چترال میں ایک رائل ہینگوٹ اور پرنس چارمنگ"	139
سوئے بدخشاں	"لعل بدخشاں کی جانب ایک سفر"	145
گرم چشمہ	"گرم چشمہ اور اجڑتی بدخشانی بستی"	150
چترال شہر	"بیک ٹو چترال"	155

"کافرستان"

وادی بمبوریت	"کافرستان ایک سٹیج اور اس کے کردار۔۔کافر کردار"	158
وادی بمبوریت	"ریسٹ ہاؤس میں بنگالی بابا۔۔۔اخروٹ کا درخت اور برقعیں"	172
وادی بمبوریت	"ندی کنارے کالاش لڑکیوں کے سنگھار آئینے"	178
برون	"برون گاؤں اور بے شرم کافر لڑکیاں"	185
قربان گاہ	"کافر قربان گاہ اور گھوڑا نما خدا"	190
وادی بمبوریت	"کافر لڑکی پاکستانیوں کو سنگسار کرتی ہے۔۔ندی کے پار"	195
چترال شہر	"ڈرامہ سیریل "کالاش" اور ہیروئن کا بغل بچہ"	202
چترال شہر	"ایک بہاریہ اور خماریہ شب جس میں خمار نہ تھا"	207
چترال شہر	"شیخ جی اور جان جی۔۔گندی عورت اور قلی"	212
وادی بمبوریت	"جشن چلم جوش"	217
وادی بمبوریت	"کالاش قبرستان۔۔سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں"	228
وادی بمبوریت	"پہاڑوں پر برف گرنے لگتی ہے اور مارخور نیچے آتے ہیں"	233
برون	"کافر ہیں۔شراب پیتے ہیں۔۔رقص کرتے ہیں"	240
قلعہ چترال	"ہملٹ کا قلعہ اور ایک پرنس کی قید میں"	249

"کچھ سفر بھولتے جاتے ہیں"

کچھ سفر بھولتے جاتے ہیں۔۔

اُن کے منظروں پر اُن کاروانوں سے اُٹھنے والی دھول جمتی جاتی ہے جو اُن کے بعد ہر برس کبھی شاہ گوری، کبھی جھیل کرومبر اور کبھی سنولیک کے لیے کوچ کرتے تھے۔۔

جیسے پرانی برفوں پر ہر برس نئی برفیں پڑتی جاتی ہیں اور اُن کی خدوخال روپوش ہوتے جاتے ہیں۔۔

جیسے چہروں پر عمر کی جھریاں اُبھرتی جاتی ہیں اور انہیں پہچاننے میں دشواری ہوتی ہے۔۔

ایسے ہی پرانے سفر ہوتے ہیں۔۔

وہ راستے بھولتے جاتے ہیں کیونکہ ان پر تہہ در تہہ نئے راستے ہر برس بچھتے جاتے ہیں۔ وہ جھیلیں یادداشت سے محو ہونے لگتی ہیں کہ اُن کے بعد جو جھیلیں آنکھوں میں نیلگوں تصویریں ہوئیں۔۔۔ وہ اُن پر تصویر در تصویر ہو کر اُن کو چھپا دیتی ہیں۔۔

اُس سفر کی۔۔ اُس برس کی دیوانگی پر جب آئندہ سفروں اور برسوں کی دیوانگی اثر انداز ہوتی ہے تو یاد نہیں رہتا کہ تب بدن پر کیا گزری تھی اور کیفیت کیا تھی اور سوچ کن راستوں پر مسافر ہوئی تھی۔۔

تو جو سفر اس طرح بھولتے جاتے ہیں انہیں پھر سے یاد کرنے کا فائدہ۔۔ پرانی برفوں تک پہنچنے کے لیے تازہ برفوں کے انبار کریدنے سے حاصل۔۔ چہرے کو چشم تصور

میں جھریوں سے پاک کر کے اُسے پھر سے پہچاننے کی بے سود تمنا کیوں.. در جن بھر راستوں کی دُھول ہٹا کر اس راستے کو دیکھنے کی خواہش کیوں جو اب یادداشت سے محو ہو رہا ہے.. اُس جھیل تک اب کیا پہنچنا جس میں درجنوں جھیلوں کے پانی داخل ہو کر اُس کی شناخت گم کر چکے ہیں.. کسی ایک گزشتہ دیوانگی کا تذکرہ چہ معنی..

شائد میری تحریر سے گمان گزرتا ہو کہ میں کوئی تیس چالیس برس پیشتر کیے جانے والے کسی سفر کا بیان شروع کرنے کو ہوں.. نہیں.. ایسا نہیں..

فیری میڈو کے جنگل میں جو پتے اور بھوج پتر کے چھلکے خزاں میں گرتے ہیں اگر اُن کی تہوں کو پلٹا جائے تو صرف چھ سات تہوں کے نیچے وہ پتے یا اُن کی کھاد ملے گی جو تب گرے تھے... جب... میں نے وہ سفر کیا تھا جسے میں بھولتا جاتا ہوں..

جن سفروں کی مسافت میں ابھی بہت دن نہ گزرے ہوں.. ابھی آپ کے ٹریکنگ بوٹس کے تلووں میں چند ایک کنکر... کنکورڈیا کے.. کسی پامیری ندی کی تہہ کے، کسی بیافو گلیشیر کے یا کسی وادیٔ سوختر آباد کے.. پھنسے ہوئے ہوں... خیمے کے کپڑے میں کسی برالڈو یا ورگوتھ ندی کی نمی موجود ہو.. اسکولے میں خریدے گئے یاک کے چمڑے کے پھندنوں والے بوٹ موجود ہوں اور اُن میں سے ایک عجیب، دوسروں کے لیے ناگوار لیکن میرے لیے خوش کن بُو اُٹھتی ہو... تو ایسے سفروں کے قصے آسانی سے بیان کیے جا سکتے ہیں۔

اُن کی تصویروں کے رنگ ابھی پھیکے نہیں ہوتے.. سفری ڈائری کے ورق ابھی بکھرے نہیں ہوتے... یہ تصویریں، یہ ڈائری، سب کچھ بیان کرتی جاتی ہیں اور آپ لکھتے جاتے ہیں.... ابھی آپ اسی وارفتگی، اسی وجد اور آوارگی کی بے خودی میں ہوتے ہیں.. اور اک گونہ بے خودی ابھی دن رات میں ہوتی ہے اور آپ اسی حالتِ وجد میں لکھتے جاتے ہیں..

لیکن جو سفر بھولتے جاتے ہوں.. انہیں بیان کرنا دشوار ہو جاتا ہے.. جیسے ہر عظیم کھنڈر کی.. ہڑپہ، مہر گڑھ اور موہنجو ڈارو کی مختلف تہیں ہوتی ہیں... بالائی تہہ کو سمجھنا اور اُسے بیان کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے لیکن اُس کے نیچے پوشیدہ چھٹی یا ساتویں تہہ تک پہنچنا اور اُس کا قصہ سنانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا.. آپ کہیں بھی ٹھوکر کھا سکتے ہیں..

تو پھر میں یہ خطرہ کیوں مول لے رہا ہوں.. میں نے اس سفر کو پہلے کیوں بیان نہیں کیا.. میرے پاس کوئی معقول جواز نہیں ہے لیکن میں صدقِ دل سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ..

؎ گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار۔ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا..

میں مختلف سفروں کا رہینِ ستم رہا اور اُن کی کہانیاں کہتا رہا.. اور پھر میں ذرا سست ہو گیا۔ میں ذرا "شمشال بے مثال" کا تذکرہ کر لوں.. "یاک سرائے" میں قیام کی داستان سناؤں.. "سنولیک" تک پھر سے چلا جاؤں.. اور یوں دیر ہو گئی.. میں ہمیشہ دیر نہیں کرتا.. لیکن اس مرتبہ دیر ہو گئی لیکن اس کے باوجود میں اس سفر کے خیال سے غافل نہیں رہا..

کیونکہ اس سفر کے خیال میں... وادیٔ یاسین تھی.. چھوٹے کشمیر کی وادیٔ پھنڈر اور اُس کے دریا میں تیرتی ایک مچھلی تھی جسے نمیر نے شکار کرنا تھا.. لنگر کی ان گنت ندیاں تھیں.. درّہ شندور کی جھیلوں کی بلندی تھی.. ہرچین کے ایک قدیم مٹی سے بنے ہوئے قلعے میں چند بندوقیں تھیں اور شہتوت کا سوم رس تھا.. وادیٔ چترال کی تنہائی تھی اور کوغزی کے انار اور چوبی مسجدیں تھیں.. قلعہ چترال میں پرنس ہیملٹ کے ہمراہ کچھ شب و روز تھے.. بدخشاں کی جانب ایک سفر تھا اور گرم چشمہ تھا.. اور کافرستان تھا اور اس کی آخری شب میں بجتے ہوئے ڈھول اور رقص تھا.. تو میں ان سے کیسے غافل ہو سکتا تھا۔ صرف رہینِ ستم ہائے روزگار رہا۔

چونکہ یہ ایک ایسا سفر تھا جسے میں بھولتا جاتا ہوں.. مجھے اس کے راستوں کی تفصیل اور ذرے ذرے میں جو کچھ دکھائی دیتا تھا، یاد نہیں.. میں گردِ سفر کو کتنا ہی صاف کیوں نہ کروں اُس کی تصویر دھندلی ہے.. چنانچہ یہ ایک دھندلاتا ہوا.. گم ہوتا.. گرد آلود سفرنامہ ہے.. اس میں تفصیل نہیں ہو گی.. یادوں کے موزیک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوں گے جو جڑ کر شائد اس کی تصویر مکمل کر دیں.. یا نہ کریں..

البتہ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ..

اسلام آباد کی ایک نہایت سرد اور دھند آلود شب میں ایک پارٹی تھی.. نہایت آفیشل قسم کی.. جس میں لوگ ایک دوسرے کے چہروں کو نہیں دیکھتے بلکہ ان

کے تعارفی کارڈ دیکھ کر ان کی حیثیت کے مطابق یا تو بچھ جاتے ہیں یا ناک چڑھا کر کسی اور بہتر گروپ کی طرف نکل جاتے ہیں.. میرے کارڈ کی یہاں کوئی حیثیت نہ تھی کیونکہ اس پر میرے نام کے ساتھ کوئی عہدہ یا گریڈ نہ تھا.. چنانچہ میں نے اسے بھلے وقتوں کے لیے سنبھالے رکھا اور بٹوے سے باہر نکال کر کسی کو پیش کرنے کا رسک نہ لیا.. البتہ چند کارڈ جو مجھے موصول ہوئے انہیں میں نے دیکھے بغیر اپنی جیب میں سنبھال لیا کہ گھر جا کر اطمینان سے دیکھیں گے کہ آج رات کس سے ملے تھے.. چنانچہ گھر جا کر جب اطمینان سے انہیں دیکھا تو ایک کارڈ کی پشت پر ایک عجیب و غریب عبارت درج تھی... "میں آپ کی تحریروں کا شیدائی ہوں.. اور میری زندگی کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ کبھی آپ سے ملاقات ہو جائے . . میری یہ خواہش پوری کرنے کا شکریہ..." میں نے کارڈ پلٹ کر دیکھا تو اس پر "جنرل نذیر احمد.. ڈائریکٹر جنرل فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن" ایک سرکاری انداز کے بھدے ٹائپ میں چھپا ہوا تھا.. میں نے اپنے آپ کو بہت کوسا کہ اے نا ہنجار ایسے چاہنے والے ذرا کم ملتے ہیں بلکہ مجھے تو پہلی بار ملا تھا تو تم نے اس کی قدر ہی نہ کی.. نہ کوئی بات کی نہ ذرا خوشگوار ہوئے.. بس ان کا کارڈ وصول کیا اور دیکھے بغیر جیب میں ڈال کر گھر چلے آئے.... اس حماقت کی تلافی کرنی چاہیے.. آفٹر آل اس ملک میں جمہوریت کے میلے کم لگتے ہیں اور مارشل لاء زیادہ لگتے ہیں تو جان کی امان پانی چاہیے..

میں اگلے ہی روز راولپنڈی میں ان کے ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا اور سر جھکا کر ایک نیم لفٹین کی سی تابعداری کے ساتھ شرمندگی کا اظہار کیا.. انہوں نے جواب میں جو کچھ کہا وہ کارڈ پر درج شدہ فقروں سے کہیں زیادہ خطرناک تھا.. پس ثابت ہوا کہ فوجی ادب کے بارے میں بے حد ناداں ہوتے ہیں..

میں کبھی بھی زیادہ سوشل نہیں رہا اور یہ بہت کم ہوا کہ میں بائی اُپس کے پاس پہنچا یا وہ نیچے میرے پاس آئے.. اور جنرلز کے لیے میرے دل میں کبھی بھی کوئی نرم گوشہ نہیں رہا کیونکہ جو جنرل جانے گئے وہ پاکستان کی نائٹ آف دی جنرلز... کے کردار تھے.. لیکن یہ جنرل جو نذیر تھے مختلف نظر آتے تھے.. جنرل پیرواد کی طرح جو اپنے ہینڈسم چہرے اور لاپرواہ قہقہے سے ہی آپ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتے ہیں..

"تارڑ صاحب.. ناردرن ایریا کو جس طور آپ نے پروجیکٹ کیا ہے ہم... میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں آپ کی کمانڈ میں ہوں... شمالی علاقوں میں... اگر رہائش کا مسئلہ ہو.. تو کوئی بھی ریسٹ ہاؤس.. ٹرانسپورٹ.. جو آپ چاہیں۔"

"میں جس قسم کے سفر کرتا ہوں وہ شروع ہی وہاں سے ہوتے ہیں جہاں ٹرانسپورٹ ختم ہو جاتی ہے.. اور ریسٹ ہاؤس وغیرہ پیچھے رہ جاتے ہیں.. اس لیے.. بہت بہت شکریہ.."

لاہور واپس آ کر میں نے اسلام آباد کی پوری رپورٹ کے ساتھ اس جرنیلی ملاقات کا بھی تذکرہ میمونہ بیگم سے کیا..

"ہائے۔" وہ ناک پر ہاتھ رکھ کر بولی "انکار کر دیا؟"

"وہ... بیگم ہم کیا کریں گے کسی ریسٹ ہاؤس کی بکنگ یا ٹرانسپورٹ وغیرہ کو.."

میری بیگم ایک ایسا کمپیوٹر ہے جس میں میری ذات کے حوالے سے ہر قسم کا ڈیٹا فیڈ ہو چکا ہے.. میں نے برسوں پہلے جو بات کی ہو... کسی خواہش میں آہ بھری ہو.. کسی ندی کے پار جانے کا سوچا ہو... کسی ناآسودگی کا اظہار کیا ہو.. شکایت کی ہو.. محبت کی ہو... کسی فون کا انتظار کیا ہو..... یہ سب کچھ اُس میں فیڈ ہو کر محفوظ ہو چکا ہے چنانچہ میری ایک ناآسودہ خواہش فوری طور پر اس کے چہرے کی سکرین اور پھر زبان پر آ گئی "تم ہمیشہ گلگت سے درّہ شندور کے پار چترال اور کافرستان جانا چاہتے تھے لیکن ہمیشہ جیپوں کا کرایہ سن کر کان لپیٹ کر واپس آ جاتے تھے کہ میں.. افورڈ نہیں کر سکتا.. اور تم ہمیشہ اس سفر کی حرص میں مرے جاتے تھے.."

"ہاں۔" میں نے فوراً اقرار کر لیا "حرص تو مجھ میں ہے اور وارث شاہ نے میرے لیے ہی تو کہا تھا کہ..

ــ وارث شاہ جوانی دی عمر گزری۔ طبع اجے نہ حرص تھیں باز آئی

چنانچہ عمر تو گزر چکی.. داڑھی میں بُور آ چکا لیکن اس کے باوجود آوارگی کی طبع ابھی تک حرص سے باز نہیں آئی۔"

"تو پھر اُن جنرل صاحب سے کہو کہ تمہیں.. نہیں صرف تمہیں نہیں.. بلکہ

ہمیں.. اس لیے کہ ہم سب بھی جائیں گے.. ہمیں گلگت سے درّہ شندور کے پار چترال لے جائیں.. ٹرانسپورٹ کا بندوبست کر دیں.."

میں واپس اسلام آباد گیا تو گورنمنٹ ہوسٹل میں کبھی کبھار جنرل نذیر کا فون آجاتا.. خوشگوار اور رسمی قسم کے فقروں کا تبادلہ ہوتا اور بس... میں کیسے فوراً فرمائش کر دیتا کہ سر جی... میں نے بہت غور کیا ہے اور اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں نے آپ کی پیشکش قبول نہ کرکے جھک ماری تھی تو کیس پر نظر ثانی کی جائے..

ایک روز انہوں نے سرسری طور پر اپنی پیشکش کو پھر دوہرا دیا اور میں نے انہیں فقرہ مکمل کرنے کا وقت بھی نہ دیا.. "سر.. کیا یہ ممکن ہے کہ..."

"بالکل ممکن ہے.. آپ تاریخیں بتا دیں.. شاہراہ قراقرم پر.. شندور کے راستے میں.. ہر جگہ.. جہاں میری آرگنائزیشن کی سہولتیں ہیں.. ہر جگہ.. بندوبست مکمل ہوگا... یہاں سے گلگت تک آپ میری ذاتی پجارو میں سفر کریں گے.."

"اور آپ اپنی پجارو سے جدا ہو کر کیا کریں گے.. پجارو کے بغیر تو ایک جنرل مکمل نہیں ہوتا۔"

"میں کسی بھی آرمی جیپ کے ساتھ گزارہ کر لوں گا.. میری جرنیلی کو کچھ نہیں ہوگا.. گلگت سے آگے پھنڈر اور درّہ شندور تک جانے والی روڈ اتنی تنگ ہے کہ اس پر پجارو جا نہیں سکتی اس لیے وہاں تین جیپیں آپ کے لیے موجود ہوں گی.."

"دو ہی کافی ہوں گی۔" میں نے فوراً حساب لگا کر کہا "اینڈ تھینک یو..."

"پتن کی چرواہی اور سونے کا سترہ کلو وزنی ہار"

اسلام آباد سے.. ایبٹ آباد

شملہ پہاڑی کی بلندی پر براجمان "ایف ڈبلیو او" کے باہر بہ عیش کوش.. قسم کے ریسٹ ہاؤس میں راتیں اور عمدہ طعام.. جس کے پہلو میں وہ سٹیٹ گیسٹ ہاؤس منظر میں تھا جس کے کناروں سے ایبٹ آباد کے مہذب اور دل کش نظارے پر ایک طائرانہ نگاہ دور تک جاتی تھی اور اگر رات ہو تو گویا شہر کی روشنیاں پاؤں تلے مسلی جاتی تھیں اور دکھ ہوتا تھا کہ ستاروں کو روند رہے ہیں.. وہاں ایک کونے میں ایک اوپن ایئر پگوڈا نما گوشہ تھا جو شنید ہے کہ بھٹو صاحب نے خصوصی طور پر اپنی شبوں کو بھگونے کے لیے بنوایا تھا.. اور اُسے دیکھ کر میں نے اس کی کمزوریوں، متکبر سیاست اور مشرقی پاکستان پر فوج کشی کے بارے میں.. تھینک گاڈ پاکستان ہیز بین سیوڈ... کے باوجود بے اختیار کہا تھا کہ "دے مین ہیڈ ٹیسٹ۔" یہ شخص ذوق جمال رکھتا تھا.. باقیوں کے پاس تو یہ بھی نہ تھا..

ایک روز ہم ٹھنڈیانی گئے جس کے بارے میں بہت بگل بجائے جاتے ہیں.. اس کی خوبصورتی کا بہت چرچا کیا جاتا ہے... اگرچہ وہاں خصوصی طور پر ہمارے لیے ریاض آفریدی دوپہر کا کھانا دیگوں میں پکوا کر پہنچا تھا اور ریسٹ ہاؤس کے لان میں کھڑا ہو کر چیڑ کے درختوں کے پس منظر میں بنسری بجاتا تھا.. اس کے باوجود... ٹھنڈیانی کی شہرت بہت تھی.. اور شکل نہائت واجبی تھی..

پھر الیاسی مسجد گئے اور چشموں کا پانی پیا اور نہائت عمدہ پکوڑے کھائے۔

یہیں پر تنہائی پسند مصور اور میرے ایک قدیمی دوست... وحید چغتائی سے بھی ملاقات ہوئی..

"نکلے تری تلاش میں" کے زمانوں کے وہی وحید چغتائی جنہیں میں نے ستائیس برس پیشتر پاکستان واپس آجانے پر مائل کیا تھا کہ وہ اپنے تایا عبدالرحمٰن چغتائی کے واحد شاگرد اور وارث ہیں۔ وہ ایک فلیٹ میں یا تو ہیر رانجھا اور عمر خیام کو پینٹ کرتے تھے یا ہمارے لیے بھنا ہوا گوشت اور گوبھی آلو بناتے تھے.. میں کبھی فیصلہ نہیں کرپایا کہ چغتائی بہتر مصور ہے یا بہتر باورچی...

ایبٹ آباد سے کوچ... مانسہرہ... تھاکوٹ.. قراقرم ہائی وے اور پھر سندھ کے کنارے پتن آگیا جہاں ایک کرنل صاحب روڈ کو بلاک کیے ہوئے ہمارے منتظر تھے.. کیونکہ اوپر سے حکم آچکا تھا.. ان کے لیے میں قطعی طور پر اہم نہیں تھا.. بلکہ حکم اہم تھا..

پتن.. ایک نہایت آزردہ اور دل میں ایک گھبراہٹ بٹھانے والی بستی ہے کہ یا اللہ تیرا شکر ہے کہ یہ میرے نصیب میں نہیں لکھی گئی.. میں یہاں پیدا نہیں ہوا..

پتن.. شاہراہ ریشم سے اتر کر کہیں نیچے.. دریائے سندھ کے کنارے.. صدیوں سے نہیں ہزاروں برسوں سے آباد ہے.. یا بے آباد ہے..

جب آپ شاہراہ ریشم سے نیچے اترتے ہیں تو دائیں جانب اس کا قدیم قبرستان دکھائی دیتا ہے.. یہ قبرستان.. ہزاروں سال پیشتر کا بھی ہو سکتا ہے.. باقاعدہ مذہب کی آمد سے پہلے مظاہر قدرت کی پرستش کرنے والوں کا بھی ہو سکتا ہے.. کیونکہ یہاں اب تک یہ رواج چلا آتا ہے کہ قبر پر... منقش لکڑی کی ڈولیاں رکھی جاتی ہیں اور ان کے نقش بہت پیگن.. بہت بت پرست اور مظاہر پرست لگتے ہیں..

باہر کی دنیا میں پتن کی وجۂ شہرت... ایک ہار ہے.. ایک گلوبند یا ایک کینٹھا ہے.. وہ جانے کس کے گلے کا ہار تھا.. اور کئی ہزار سال پہلے تھا.. کسی مجسمے کے گلے میں تھا.. یا اس کے پوجنے والے کسی بادشاہ کے گلے میں چھب دکھلاتا تھا..

دریائے سندھ کے اوپر.. پتن کے قصبے سے ذرا پرے.. جہاں اس شام میں.. اس آزردہ بستی سے شناسا ہونے کے لیے گیا.. مجھے بتایا گیا کہ پل کے اوپر جو جھونپڑا نما کوٹھڑی دکھائی دیتی ہے اس میں وہ بوڑھی چرواہی اب بھی رہتی ہے..

یہ بوڑھی عورت، تہذیب کے عناصر سے بالکل ناآشنا.. شاہراہ ریشم سے نیچے، جہاں اس کے آباؤاجداد ہزاروں برسوں سے رہتے آئے تھے.. دریا کے اوپر جو ویران

پہاڑ ہیں وہاں اپنی بکریاں چرانے لے جایا کرتی تھی.. اور شام ڈھلے لوٹ آتی تھی.. وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ غربت اور افلاس کی بدترین سطح پر زندہ ہے.. کیونکہ اس کے لیے ہمیشہ سے یہی زندگی تھی.. ایک روز اس نے ان بلند ویران پہاڑوں میں.. اپنے قدموں کے آگے.. کوئی شے دیکھی.. جو چمکتی تھی.. پیتل کی کوئی شے.. وہ اسے اٹھا کر اور بمشکل اٹھا کر کہ وہ بہت وزنی تھی اپنے جھونپڑے میں لے آئی.. بہت دنوں تک یہ پیتل اس کے جھونپڑے میں پڑا رہا.. پھر ایک روز.. وہ اسے فروخت کرنے کی آرزو میں.. کہ شائد مجھے اس کے عوض.. ایک دیگچی مل جائے.. آٹے کا ایک تھیلا مل جائے.. پتن کے ایک سنار کے پاس لے آئی.. اس نے پیتل کو کھرچا اور کہنے لگا "مائی... یہ تو سونا ہے... خالص سونا.. اور اس کا وزن ستر کلو کے قریب ہے.. میرے پاس تو ایک تولے سے زیادہ کے لیے رقم نہیں ہے.. تم اسے سوات لے جاؤ.. منگورہ لے جاؤ.."

اس کے بعد کا قصہ بہت طویل ہے...

اور قصہ مختصر... یہ گلوبند ایک پولیس افسر کی فرض شناسی اور اپنی تاریخ کو بچانے کے جذبے کی وجہ سے ادھر ادھر نہ ہوا اور بحق سرکار ضبط ہو گیا... اب یہ صوبہ سرحد کے سرکاری خزانے میں جمع ہے..

اور پھر کل دنیا میں یہ خبر نشر ہوئی کہ پاکستان کے کسی گمنام قصبے پتن میں ایک تاریخ کے آغاز سے قبل کا.. خالص سونے کا ستر کلو وزنی ہار دریافت ہوا ہے جس پر عجیب و غریب نقش اور صورتیں کندہ ہیں..

اس اتھل پتھل میں ایک ٹریجڈی ہو گئی.. اس بھاری کینٹھے کو بیچنے کے لیے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ دیا گیا.. ان میں سے کئی ٹکڑے صرف سونے کی ہوس میں پگھلا دیے گئے اور اس کا شاندار تسلسل ختم ہو گیا.. اس کی اصل ہیئت ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ میں نے محکمہ آثار قدیمہ کے ایک خاص مجلے میں ان ٹکڑوں کی جو تصویریں دیکھی ہیں.. وہ حیرت ناک اور منفرد ہیں.. ان پر مارخوروں اور اونٹوں کی شبیہیں نقش ہیں.. کچھ عجیب سے مہرے ہیں.. لیکن اس نامکمل حالت میں بھی.. فرعونوں کے مقبروں میں سے دریافت ہونے والے زیورات اور سونے کے مجسموں کی نسبت زیادہ اثر انگیز اور قدیم ہے.. اور اس کی قیمت... صرف اس ہار کے لیے ہی انمول کا لفظ استعمال

ہوسکتا ہے.. یہ کروڑوں ڈالر بھی ہو سکتی ہے.. بوڑھی چرواہی کی خواہش پر اُسے حج کروایا گیا اور دو چار لاکھ روپے انعام میں دے کر ہمیشہ کے لیے مطمئن اور خوش کر دیا گیا..

دریائے سندھ کے اوپر وہ کوٹھڑی تھی جس میں وہ چرواہی اب بھی قیام پذیر تھی.. گئے زمانوں میں ان خطوں میں کیسی کیسی سلطنتیں ہوں گی.. کیسے دیوتا اور بادشاہ ہوں گے جو ایک سترہ کلو وزنی سونے کا کینٹھا گلے میں سجا کر اپنے تخت پر براجمان ہوتے ہوں گے..

چتن سے گلگت پہنچے تو اُس شام فوج کی طرف سے ہم جیسے آٹکسٹ مہمانوں کے لیے ایک بڑا کھانا.. ایک گرینڈ ڈنر ہوا.. جہاں بریگیڈیئر مجاہد اور کرنل وحید... مہمانوں کا استقبال کرتے تھے..

یہیں سے دراصل وہ سفر شروع ہوا تھا جو جھلوتا جاتا ہے.. جس کی یادداشت پر بہت گرد جمع ہو چکی ہے..

اس سفر کی راکھ کو کریدنے کی جستجو ہے.. اب دیکھتے اس میں کوئی چنگاری موجود ہے یا نہیں..

ہم راستوں کی دھول ہٹا کر وہ راستہ تلاش کرتے ہیں جس پر ہم نے برسوں پہلے سفر کیا تھا..

آرمی کی دو جیپیں تھیں.. اتنا تو مجھے یاد ہے.. سبز رنگ کی..

باوردی ڈرائیور غازی.. بارلیش اور شمال کا رہنے والا..

ڈرائیور اسلم..... قدرے تھتھلاتا ہوا.. پنجاب کا باسی..

ایک جیپ میں.. میں، میمونہ اور عینی..

اور ہمارے پیچھے دھول اُڑاتی جیپ میں سلجوق اور سمیر کے جوانی کے خون سے دوہرے ہوتے بدن اور.. پندرہ مرغیاں، تین تربوز، خوبانیوں کا ایک کریٹ.. انڈے.. اور ہر قسم کی خوراک..

دونوں جیپیں اُن راستوں پر.. جن پر میں نے پہلے سفر نہیں کیا تھا..

دو جیپیں.. سبز رنگت کی.. درّہ شندور کے پار چترال میں اترنے کی تمنا میں..

جیسے تریوی کے فوارے میں دو سکے..

دیکھتے ہیں کہ یہ فوارہ.. ان سکوں.. ان جیپوں کے نصیب میں کیا لکھتا ہے..

”وادی گوپس کے ڈائنا سورس اور سونے کے پرندے“

”انسپکشن بنگلو... گوپس“

اس نیلے بورڈ کے ایک جانب عینی گردن ٹیڑھی کیے کھڑی تھی اور دوسری جانب میمونہ کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت میں کھلی تھیں.. اور دونوں اس انتظار میں کہ میں شتابی سے اُن کی تصویر اُتاروں اور وہ پچھلی شب کی تیز ہواؤں کی شدت سے درختوں سے جو سیب گرے تھے اُنہیں اٹھا کر چکھیں کہ ان کا ذائقہ کیسا ہے.. گوپس کی وادی کا ذائقہ کیسا ہے..

انسپکشن بنگلو کے برابر میں گوپس روڈ ابھی صبح کے سکون میں تھی اور اس پر کوئی ٹریفک نہ تھی.. اور جدھر سے ہم آئے تھے.. گلگت کی جانب سے.. ادھر وادی اشکومن کے اوپر سایہ کرتا ایک پہاڑ تھا جس پر کچھ نہ سمجھ میں آنے والی لکیریں تھیں.. اُن سے کبھی کوئی تصویر بنتی تھی اور کبھی وہ بے ترتیب ہو کر بے معنی ہو جاتی تھیں..

ہم پچھلی شام.. گلگت سے سفر کرتے ہوئے گوپس پہنچے تھے...

نالہ ہمرواس۔ دریائے غذر کی قربت.. سینگل.. گاکوچ۔ خاقون۔ دریائے اشکومن اور گوپس روڈ سے الگ ہو کر دائیں جانب وادی اشکومن کے صدر مقام امت کو جانے والی سڑک.. جس پر آج سے چھ برس بعد میں نے جھیل کرومبر کو جانے کے لیے سفر کیا تھا اور اُسے "یاک سرائے" کے نام سے یاد کیا تھا..

گاؤں خاقون کے بعد... جج بارگوں اور دریا کے پار چٹیل چٹانوں کی بے رونقی

میں سبزے کی گھنی اور خوش نظر رونق.. ایک باغ اور اُس پر اُترتی ایک آبشار جو اُسے سیراب کر رہی تھی.. اُس کی پھوار اگرچہ ہم تک نہ آتی تھی لیکن پھر بھی آتی تھی.. یہ گوپس کے راجاؤں کا.. ایک پوشیدہ.. ہماری پہنچ سے باہر... دریا کے پار ایک باغ تھا... جس میں ایک جھونپڑے کی کسک شدید ہوتی ہے اور ہماری دونوں جیپیں اُس کے پھینکے ہوئے... سبز حسن کی تنہائی اور فسوں کے جال میں سے بچ کر نکل گئیں..

پھر ہاتم آیا.. بڑا اور سمال.. راؤشن اور پھر گوپس..

گوپس ایک تنگ نظر وادی کا تاثر دیتی تھی.. ایک بازار تھا، ایک ریسٹ ہاؤس تھا اور ذرا گھبراہٹ تھی کہ ہم پھیلاؤ اور وسعت کے منظروں کی خواہش میں گھر سے نکلے تھے..

اور پچھلی شب جب ہم یہاں پہنچے اور ہماری جیپوں کی پُر شور آمد نے سیب کے درختوں کی ڈالیوں پر لگے چند پکے ہوئے سیبوں کو بے آرام کر کے گھاس پر گرایا تو میری نظر اُس پہاڑ پر ٹھہر گئی جس کے دامن میں اشکومن روڈ تھی.. گوپس شام میں اتر چکا تھا مگر وہاں ابھی تک ایک زرد روشنی تھی.. اور اُس کے چٹانی سینے پر کچھ نہ سمجھ میں آنے والی لکیریں تھیں... کبھی تصویریں بنتی تھیں..

وہ لکیریں، وہ تصویریں کیا تھیں..

شمال میں پاکستان کے کسی بھی خطے کی نسبت اساطیری داستانیں بہت ہیں.. دیومالائی قصے ثقافت کا ایک اہم جز ہیں.. پریوں اور چڑیلوں کی ایسی ایسی محیر العقول کہانیاں سننے میں آتی ہیں کہ ان پر شک کا اظہار کیا جائے تو مقامی لوگ بُرا مان جاتے ہیں.. میں نے "نانگا پربت" میں ایک مولوی صاحب کا تذکرہ کیا ہے جو وادیٔ چلو کے ایک گاؤں میں رہنے والے پریوں کے بچے مجھے دکھانا چاہتے تھے.. نانگا پربت کے ٹاپ میدان میں الاؤ کی روشنی میں مجھے چھل پیریوں اور بلاؤں کے ایسے قصے سنائے گئے تھے کہ ان پر یقین کرنے کو جی چاہتا تھا..

اور کون کہہ سکتا ہے کہ صرف وہی حقیقت ہے جو میں جانتا ہوں اور وہ سب کچھ ذہن کی پیداوار اور فرضی ہے جو وہ بیان کرتے ہیں..

پنجاب کے کانٹے دار کیکر کے درختوں پر جو زرد پھول کھلتے ہیں اور جن پر اگر انگور کی بیل چڑھائی جائے تو ہر گچھا زہرایا جاتا ہے تو اگر وہی بیل... وادیٔ گوپس میں دریا کے پار ایک ایسے باغ میں ہو جس پر ایک آبشار گرتی ہے تو اس کا ہر گچھا ایسی ڈالیوں سے لٹکے گا جو اسے زخم نہیں دیں گی، مرہم دیں گی.. یا میرے میدانوں میں جو سرسوں کے کھیت ہیں وہ ایک اور جہان ہیں... بسپر گلیشیر کی ڈھلوانوں پر جو زرد پھولوں کے بہاؤ بہتے ہیں وہ الگ دنیا ہے... ہمارے کنوئیں کے پانی اور ہیں اور ہنزہ واٹر یقیناً اور ہے... اسی لیے ہم جو ایک مختلف خطے سے اِدھر آتے ہیں تو ہر شے کو اپنی بود و باش، درختوں، کھیتوں اور موسموں کے حوالے سے پرکھتے ہیں.. اور ہم ایک اور خطے میں پہنچ کر... جس کا رہن سہن، دریا، گلیشیر اور خوراک یکسر جدا ہیں ہم اُن کی داستانوں اور اُن کے نفسیاتی محرکات کو پرکھ نہیں سکتے..

گئی رات جب نانگا پربت پر سے کوئی ایک... صدیوں سے رکا ہوا برفانی تودہ ایک دھماکے کے ساتھ ٹوٹ کر گہری گونج میں لپٹا بیال کیمپ کی وادی میں اُترتا ہے تو اس کے دامن میں صدیوں سے رہنے والا گڈریا اُس گونج میں پوشیدہ برف کے مینڈکوں اور سانپوں کی شوک سن سکتا ہے.. ہم نہیں سن سکتے..

دریائے شیوک کے کنارے.. یا ہوشے کے وہ لوگ جو اب بھی زمانہ قبل از تاریخ کی شکلوں اور لباسوں والے ہیں وہ مشابرم کی ہواؤں میں پریوں اور جنات کی صدائیں سنتے ہیں..

اگر سنولیک کے آس پاس برفانی آدمی یے ٹی کا آسیب موجود ہے اور جو اُدھر سے گزرتے ہیں.. میسنر جیسے کوہ پیما بھی.. اور وہاں کے باشندے بھی گواہی دیتے ہیں کہ اس کا وجود ہے تو ہم.. جو اُدھر سے نہیں گزرتے، صدیوں سے وہاں نہیں رہتے، کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہیں ہے..

اسی لیے.. میں نے شمال کی دیومالا کو کبھی یکسر مسترد نہیں کیا کیونکہ میرا تجربہ مختلف ہے اور جب تک میں بھی صدیوں سے اس برف نگری اس بلند کوہستانی خطے کا باسی نہیں ہو جاتا میں ان قصوں کو شک کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا..

اور یہاں گوپس میں روایت یہ ہے کہ... ریسٹ ہاؤس کے سامنے دریائے اشکومن

پر بلند ہوتے پہاڑ پر جو لکیریں ہیں وہ.. ایک اژدھے کی ہیں۔ ایک عفریت ایک ایسی بلا کی ہیں جو ہزاروں برس پہلے اس پہاڑ سے اُتری تھی.. اُس کی دُم بہت لمبی تھی اور اُس کا جبڑا بہت چوڑا تھا.. وہ پہاڑ سے اُتر کر وادی میں آتی تھی اور ہر رات چند نوجوانوں کو ہڑپ کر کے واپس چلی جاتی تھی.. اور یوں آہستہ آہستہ وادی انسانوں سے خالی ہونے لگی.. لوگ بے بس تھے اور اب یہ معمول بن چکا تھا... وہ بلا چنگھاڑتی تھی اور آگ برساتی تھی اس لیے کوئی اُس کا سامنا نہ کر سکتا تھا.. تب ایک بزرگ کا ظہور ہوا... وہ پہاڑ پر گئے، اُس بلا کو اُس کی آماجگاہ سے باہر آنے کا حکم دیا اور پھر اپنے زہد و تقوےٰ کے زور سے اُسے بھسم کر ڈالا..

پہاڑ پر یہ نشان اُسی بلا کے ہیں.. اُسی عفریت کی نشانیاں ہیں..

اُس وادی کے لوگ حلفیہ بیان کرتے ہیں کہ وہاں بلندی پر جہاں وہ کبھی کبھار بھیڑیں چرانے جاتے ہیں اب بھی ایسے ڈھانچے اور ہڈیاں موجود ہیں جو کسی عام جانور یا انسان کی نہیں ہو سکتیں... فطرت کی قربت میں زندگی گزارنے والے یہ لوگ جانتے ہیں کہ انسان اور اُن کے اپنے جانوروں کی ہڈیاں کیسی اور کتنی بڑی ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ ہڈیاں جو اب بھی وہاں بکھری پڑی ہیں اُن کا سائز اتنا بڑا ہے کہ وہ کسی ایسے جانور کی ہی ہو سکتی ہیں جو ان علاقوں میں نہیں پایا جاتا.. یا اب نہیں پایا جاتا..

کیا یہ کسی ڈائنا سورس کی ہڈیاں ہو سکتی ہیں؟ قبل از تاریخ کا یہ جانور بھی گوشت خور تھا، اُس کے ڈھانچے اور انڈے چکوال کے گرد دریافت ہوئے ہیں.. چین میں بھی ملے ہیں اور چین یہاں سے بہت دور نہیں..

کیکر کے درختوں اور سرسوں کے کھیتوں کا باسی یہ فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں کہ ان وادیوں میں لاکھوں برس پیشتر ڈائنا سورس موجود تھے یا نہیں.. یا وہ سچ مچ اژدھے اور بلائیں تھیں..

ہم نے اپنے ماضی کی بازیافت کے حوالے سے صرف اور وہ بھی کسی حد تک ہڑپہ، موہنجوڈارو اور مہر گڑھ کو ہی اپنی توجہ اور تحقیق کا مرکز بنایا.. شمال کے پہاڑوں کی جانب ہم نے کبھی نگاہ نہیں کی.. ہمارے خیال میں ان برف زاروں اور ویرانوں میں ازل سے صرف بلندیاں اور گلیشیر تھے.. لیکن بہت کم لوگ آگاہ ہیں کہ ان علاقوں میں

موہنجوڈارو وغیرہ سے کہیں زیادہ قدیم اور شاندار تہذیب کے آثار ہیں.. چتن کا ہار بابل اور نینوا کی تہذیبوں سے کئی ہزار پہلے کے ہنر مندوں نے تخلیق کیا.. چلاس، ہنزہ، سکردو اور گلگت کی چٹانوں پر جو نقش ہیں وہ ایک جاندار تہذیب کی گواہی دیتے ہیں.. اور اب وادیٔ اشکومن کے پہاڑوں میں قدیم اور حیرت انگیز آثار دریافت ہو رہے ہیں.... ڈاکٹر احمد حسن دانی کی سنڈی میں گلگت کے ایک ماہر آثار قدیمہ سے ملاقات ہوئی.. اُنہوں نے بتایا کہ امت کے سامنے دریا کے پار ایک قدیم قبرستان تھا جہاں سے چرواہوں کو سکے اور نوادرات ملتے رہتے تھے.. کچھ لوگوں نے غیر قانونی طور پر وہاں کھدائی بھی کی اور جو ہاتھ لگا لے گئے.. اب اسے محکمہ آثار قدیمہ نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور سائنسی بنیادوں پر کھدائی شروع ہو گئی.. وہ صاحب ان قدیم ڈھیریوں میں سے ملنے والی چند نادر اشیا ڈاکٹر دانی کے پاس لے کر آئے تھے تاکہ وہ اُن کی تاریخی حیثیت اور قدامت کا تعین کر سکیں.. ان میں سونے کے زیورات، کنگن، بندے اور گلے کے ہار بھی تھے لیکن جس شے نے مجھے اپنی قدیم کشش سے مسحور کر دیا وہ دو چھوٹے چھوٹے سونے کے پرندے تھے.. یہ وادیٔ اشکومن میں چھ سات ہزار برس قبل تخلیق کیے گئے تھے اور ان کی کاریگری حیرت انگیز تھی.. یہ پرندے اُن زمانوں سے پرواز کرتے ہوئے لمحۂ موجود میں آئے تھے تاکہ اس عظیم تہذیب کی خبر دے سکیں جس نے ہزاروں برس پہلے ان وادیوں میں جنم لیا تھا اور ہم اس سے بے خبر رہے... وہ کون لوگ تھے جو ان قبروں میں دفن ہوئے اور اپنے عہد کی نشانیوں کے ساتھ دفن ہوئے.. جب ہم دفن ہوں گے تو کیا سات ہزار برس بعد ہماری قبروں میں سے بھی اس عہد کی نشانیاں نکلیں گی.. اگر وہ نکلیں گی تو کیا ہوں گی..

”وادیٔ یاسین کا تختِ طاؤس اور اُس پر براجمان ایک دیوانہ“

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم نے چھوٹے کشمیر کے لیے کوچ کرنا تھا.. لیکن ابھی سویر تھی..

اور اس سویر میں ہماری جیپیں ریسٹ ہاؤس میں سے نکل کر دریا پار وادیٔ یاسین کی یاترا کو جاتی تھیں..

وہاں تک اُن زمانوں میں صرف جیپ ہی جاتی تھی اور مشکل سے جاتی تھی.. مجھے یاد ہے کہ گوپس کے پل کے پار جاتے ہی جب وادی وسیع ہوئی تو اس کے بیچ میں بہتے ایک دریا کے کنارے جس کے پانی چراگاہ کی گھاس میں پھیلے ہوئے تھے چند گائیں چر رہی تھیں جو جیپوں کے انجنوں کی آواز سن کر ششدر رہ گئیں اور شائد شاک سے اُن کے تھنوں میں جتنا دودھ تھا وہ خشک ہو کر ملک پاؤڈر میں بدل گیا کہ یہ کیا خوفناک آوازیں ہیں اور سبز رنگ کے کیسے دو جانور ہیں جو دندناتے ہوئے ادھر آ نکلے ہیں..

اور صرف چند برس بعد جب میں پامیر واخان ٹریک کے دوران "یاک سرائے" میں چند روزہ قیام کے بعد درّہ درکوت سے نیچے اُترا تھا اور اسی وادیٔ یاسین میں سے گزر کر گوپس کی طرف گیا تھا تو یہاں.. بھاری ٹرک چلتے تھے.. بسیں گلگت کے لیے پریشر ہارن بجاتی تھیں اور چوڑی سڑک کے دونوں کناروں پر سپر مارکٹس اور سٹور تھے.. عالی شان گھر تھے اور ڈش انٹینا اور ویڈیو گیمز کی دکانیں تھیں.. وادیٔ یاسین، وادیٔ ہنزہ کے ہم پلہ ہوتی تھی.. لیکن میں تو گئے زمانوں کی بات کرتا ہوں اور یہ گئے

زمانے صرف چھ سات برس پرانے تھے.. مجھے یاد ہے اُن زمانوں میں وہاں ایک مسجد تھی، ایک مہمان خانہ تھا، اور ایک قدیم حفاظتی مینار تھا اور چنار تھے..

اور وادیٔ یاسین کا قلعہ تھا.. راجہ گوہر امان کا قلعہ جس کے نامور بیٹے کا نام پہلوان تھا.. اور اس پہلوان کی قابلِ فہم طور پر صرف پانچ بیویاں تھیں اور اٹھارہ بھائی بھی تھے... اسی پہلوان نے انگریز جاسوس ہارورڈ کو... درکوت گاؤں کے آس پاس ایک خیمے میں... جب کہ اُس کی میز پر روشن موم بتی کی موم پگھل کر اس کے کاغذوں پر گرتی تھی اور سرد ہو کر منجمد ہوتی تھی... قتل کروا دیا تھا.. اور پھر پوری سرکارِ انگلشیہ اور اُس کے نمک خواروں نے اُس کا ماتم کیا تھا اور وہ نظم ہمیں ان علاقوں کے ہر سفرنامے میں ملتی ہے جو "درندہ صفت وحشیوں" کے ہاتھوں مارے جانے والے اس تہذیب یافتہ گورا لوگ پر لکھی گئی اور زبان زدِ عام ہوئی..

آج بھی بہت سارے براؤن صاحب ہارورڈ کی موت پر کفِ افسوس ملتے ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس کے طرفدار ہیں.. مقامی ہیرو گوہر امان اور پہلوان کے.. جو اپنی دور افتادہ ریاست میں امن امان سے رہتا تھا.. یا ہارورڈ کے... جو ان وادیوں میں صرف اور صرف یونین جیک کی سربلندی کے لیے آیا تھا..

چونکہ ہم مقامی ہیروز کو ناپسند کرتے ہیں اور پورس کے مقابلے میں سکندر کی طرفداری کرتے ہیں اس لیے یہاں بھی ہم ہارورڈ کے ہی وفادار ہیں..

قدیم قلعہ دیکھنے کے بعد ہم وادیٔ یاسین سے نکلے اور نازبر نالہ کے اوپر معلق ایک مخدوش سی کچی سڑک پر اُٹھتے چلے گئے.. نیچے دیکھنے سے سر چکراتا تھا اور اس کے ساتھ جیپ چکراتی بلند ہوتی تھی..

"لو جی.. لو جی... یہاں سے پچھلے ہفتے ایک جیپ... جیپ گری تھی.. تو دس بندے.. اس نازبر نالے میں گر کر اللہ کو پیارے.. پیارے ہو گئے.." ڈرائیور اسلم نے اپنے تئیں بہت روانی سے.. لیکن قدرے ہکلاتے ہوئے ہمیں یہ خوش خبری سنائی..

"اسلم تم کبھی بھی فوج کے توپ خانے کے یونٹ میں نہیں جا سکتے"

"کیوں جی؟"

"جتنی دیر میں تم فائر کا آرڈر دو گے اتنی دیر میں جنگ ختم ہو جائے گی.."

"بس جی.." اسلم نے خوشدلی سے کہا "کبھی کبھی.. زبان گوتا کھا جاتی ہے۔"

"کیا کھا جاتی ہے؟"

"گوتا..."

"یعنی غوطہ..."

"بس جی وہی..."

دروغ برگردنِ منو بھائی جن کی زبان بھی کبھی کبھی "گوتا" کھا جاتی ہے جاوید شاہین جو اپنی جوانی میں بھی خوبرو تھا ہیرو بننے کے لیے بمبئی گیا اور ساحر لدھیانوی کے ہاں مہمان ہوا.. جاوید شعر تو روانی میں پڑھ جاتا ہے لیکن عام حالات میں اس کی زبان ذرا رُک رُک کر رواں ہوتی ہے چنانچہ ہدایت کار نے اُسے اپنی فلم میں ایک ایسے شخص کا رول دیا جو ہکلا کر بولتا ہے.. لیکن جب شوٹنگ شروع ہوئی تو جاوید سارے ڈائیلاگ رُکے بغیر روانی سے بول گیا اور وہیں اُس کے فلمی کیریئر کا اختتام ہو گیا..

نازبر نالے کے پار.. طاؤس تھا..

اور یہ ایک ایسا طاؤس تھا جو واقعی جنگل میں ناچ رہا تھا..

ہم صبح کے ناشتے کے لیے راجہ قیوم کے ہاں مدعو تھے..

اور راجہ صاحب بھی وادیٔ یاسین کے تختِ طاؤس پر براجمان تھے..

نازبر نالے کی اونچائی سے نیچے طاؤس ایک وسیع ہموار خطے پر آباد تھا.. ایک کچی اور ناآسودہ سڑک.. ایک مختصر بازار.. سامنے ایک پولو گراؤنڈ... جب میں درہ درکوت سے اترا تھا تو یہاں ایک پولو میچ ہو رہا تھا اور آس پاس کی وادیوں کے کل مرد و زن پُرجوش تماشائی تھے.. ذرا آگے ایک مسلسل اور طویل پتھریلی دیوار جس کے اندر وہ گھر تھا جہاں ناشتہ ہمارا منتظر تھا۔

اس دیوار میں.. ایک نہایت تنگ اور مختصر سا کواڑ تھا جس میں سے ہم جھک کر اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اندر گئے..

یہ پاکستانی شمال کی ایک دل کشی ہے کہ وہاں.. کہیں الگ تھلگ.. ایسے مقام، ایسے گھر ہیں جہاں وقت، زمان و مکاں ایک سکوت میں آچکے ہیں.. اس سکوت میں وقت رُکا ہوا ہے.. کہاں؟ وہاں، جہاں وقت کے گھڑیال کی سوئیوں نے پہلی حرکت کی

تھی.. سو برس پیشتر یا ہزار برس پہلے... یہ تو وقت ہی بتا سکتا ہے.. لیکن وہ تو گنگ ہے، بتا نہیں سکتا، رُکا ہوا ہے.. اور جب آپ اُس سکوت کے اندر داخل ہوتے ہیں ایک مختصر کواڑ میں سے جھک کر، سمٹ کر... تو ایک سرد خاموشی میں، طاؤس کے گاؤں میں... ایک ایسی رہائش گاہ ہے جس میں پھلدار درختوں اور تالاب کے کناروں سے کبوتروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے.. پرندے بولتے ہیں.. تالاب میں تیرتی بطخیں اُن اجنبی مہمانوں پر ایک نظر ڈالتی ہیں جو بہت دور سے آئے ہیں اور اُن کے مہاندرے مختلف ہیں.. ایک طویل چوبی برآمدے میں نیچی چھتوں والے کمروں کی کھڑکیاں کھلتی ہیں جن میں سے بچوں اور عورتوں کے چہرے جھانکتے ہیں جن کے لبادے ناآشنا اور شکلیں دل کش ہیں..

اور ایک خاموش ٹھنڈک اُتری ہوئی ہے جو درختوں تلے گہری ہوتی ہے..

یہاں نظر دور تک نہیں جاتی.. سیب، ناشپاتی، بادام، اخروٹ، خوبانی اور آلوچے کے گھنے درخت اسے روک لیتے ہیں.. ان درختوں تلے پھلوں کے فرش بچھے ہیں اور اُن کے رنگ سبز گھاس کی ٹھنڈک پر نکھرتے اور شوخ ہوتے ہیں..

یہ زمان و مکاں کا الگ تھلگ سکوت...

سکردو میں.. عباس کاظمی کے گھر میں بھی تھا.. جہاں ہم نے اخروٹ کا شوپ پیا تھا.. اسکولے میں حاجی مہدی کے گھر میں بھی تھا جس کی شکستہ محرابوں میں سے وہ برفیں جھانکتی تھیں جن کا تسلسل شاہ گوری تک پہنچتا تھا..

میرے خیمے کے اندر بھی تھا جب وہ جھیل جھیوا کے کنارے ماترے میں تھا.. جھیل وِنڈرمیر کی قربت میں تھا.. جھیل کرومبر کی نگاہ میں تھا.. اور خپلو کے اُس نیم شکستگی میں گم ہوتے اس لداخی طرز کے چوبی محل میں تھا.. اس کے سیب اور چیری کے باغوں میں تھا جہاں ایک سنہری بدن کا گھوڑا ہنہناتا تھا اور سلجوق اور تمیر اس کی پشت تھپکتے تھے..

راجہ قیوم کے اس گھر میں بھی وہی زمان و مکاں کا الگ سکوت تھا.. ابھی تو اس میں پرندے بولتے تھے، بطخیں شور مچاتی تھیں اور کبوتر پھڑپھڑاتے تھے.. ہوا آتی تھی تو درختوں سے پھل گرتے تھے اور اُن کی خفیف سی آواز آتی تھی لیکن برفانی

موسموں میں تو یہاں سب کچھ ایک سرد چپ میں چلا جاتا ہوگا..

مجھے..ان خطوں کی مہمان نوازی کی یہ روایت بے حد بھلی لگی کہ خاتونِ خانہ.. ایک بڑا سا آفتابہ اُٹھائے..ایک چلمچی آپ کے آگے رکھتی ہے، ظاہر ہے آپ فرش پر بچھے دستر خوان پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ اور آپ کے ہاتھ دُھلاتی ہے اور پھر جھک کر طعام کی جانب اشارہ کرتی ہے..

برآمدے کے کچے فرش پر بچھے دسترخوان پر جو خوراکیں بچی تھیں اُن میں سے بیشتر کے ذائقے نا آشنا تھے اور وہ لاہور کی نسبت واخان اور ازبکستان کی قربت میں تھیں..چونکہ یہ علاقے بھی تو لاہور کی نسبت طاؤس سے زیادہ قریب تھے..ناشتے کے بعد ہم اس زمان و مکاں سے باہر آئے... کھیتوں میں چلتے ہوئے دریائے درکوت کے اُس بلند کنارے تک آئے کہ ہم کو بہت سنبھلنا پڑا..کہ کہیں نیچے جہاں دریا بہتا تھا اتنی گہرائی تھی کہ جھانکتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا..

یہاں دریا کی گزرگاہ بے حد وسیع تھی اور اُس کے پار وادیٔ اشکومن کے ہرے بھرے کھیت اور گاؤں نظر آتے تھے..

یہاں دریائے درکوت، تھوئی دریا اور دریائے یاسین کا میل ہو رہا تھا..

اور جہاں ان کا سنگم تھا، وہاں برانداس کا پل تھا..

اور مجھے یاد ہے کہ جب ہم راجہ صاحب کے اُس صدیوں کے ٹھنڈے سکوت میں آئے ہوئے گھر..اُس کے پھلدار درختوں اور برفانی نالیوں پر جھکی لمبی اور گھنے سبزے والی گھاس میں ٹھہری ہوئی سرد ہوا..میں سے باہر آئے تو ہمارے قدموں پر چلتا ایک دیوانہ تھا...

یہ دیوانے..نسل در نسل آپس کی شادیوں کے شاخسانے...ان وادیوں میں عام ہوتے ہیں۔ وہ منہ کھولے ہماری آمد پر بغلیں بجاتا ہمارے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا..

اور اُس دیوانے نے پتہ ہے مجھ سے کیا پوچھا...پوچھا کہ ادھر کیوں آئے تھے؟

میں تو اُس کی زبان نہیں سمجھتا تھا لیکن راجہ قیوم نے مجھے بتایا کہ یہ دیوانہ پوچھتا ہے کہ ادھر کیوں آئے تھے..

میں صرف مسکرا دیا لیکن میں نے اُس سے مخاطب ہو کر نہیں اپنے آپ سے کہا کہ ادھر مُحسن جو تھا اس لیے آیا ہوں..

دیوانے نے بھی مجھ سے نہیں اپنے آپ سے کہا..میری طرف دیکھو..کیا میں مُحسن ہوں؟ میرا منہ کھلا ہے...میری رالیں بہتی ہیں..کیا میں مُحسن ہوں؟..ادھر کیوں آئے تھے..

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا..

میں وادیٔ یاسین کے گاؤں طاؤس کے اُس زمان و مکاں کے سکوت میں ٹھہرے ہوئے ایک گھر میں کیوں آیا تھا..

ہم گوپس کو واپس ہوئے..

واپس ہوئے تو گوپس بازار کے دائیں جانب جو گھر در گھر دریا تک جاتے تھے..پتھریلی سادہ آماجگاہ ہیں آپس میں جڑی ہوئی وہاں کہیں نشیب میں دریا کی قربت میں ایک اور پوشیدہ سا گھر تھا.....راجہ اصغر حسین کا گھر...کچھ قدیم تصویریں تھیں...پرانے چینی پیالے تھے..کچھ مدھم پڑتی یادداشتیں تھیں جو راجہ صاحب مسلسل بیان کرتے تھے اور ایک وسیع میز پر ایک وسیع قلب کے...بے شمار کھانے تھے..

راجہ صاحب کا بیٹا معظم میرے بڑے بیٹے سلجوق کا فنِ تعمیر کا ہم جماعت تھا..اس لیے یہ دعوت بنیادی طور پر سلجوق کے لیے تھی جس میں ہم بھی شامل تھے..

ایک تہہ در تہہ رہائش گاہ..گوپس میں..دریا کی قربت میں..ایک مختصر باغ جس کے پھولوں کی مہک نامانوس تھی..جہاں کچھ قدیم تصویریں تھیں..پرانے چینی پیالے..مدھم پڑتی یادداشتیں...اور ہم..

"خلطی جھیل میں غرق چولہوں سے دھواں اُٹھتا تھا"

تو آج شام...

وادئ یاسین اور گوپس میں ایک صبح ایک دوپہر کے بعد.. آج شام تک ایک ایسی وادی تک جو غربت میں چمک رہی تھی اور گمنام تھی وطن میں..

ایک ایسا کوہ نور ہیرا جو ابھی تک مبارک حویلی میں پڑا تھا.. کسی نادر شاہ، کسی رنجیت سنگھ کسی، ملکہ وکٹوریہ کو پیش نہیں کیا گیا تھا.. اور اس حویلی کے اندر.. کوٹھڑی کے اندر ایک اور کوٹھڑی... ایک اور.. وہاں کئی فٹ چوڑی دیواروں کے اندر نیم تاریکی میں وہ پنہاں تھا.. اور صرف اُس کا تھا جو وہاں تک پہنچ سکتا تھا...

شمال کی اس حویلی کے اندر وادئ یاسین کے اندر.. گوپس کے کہیں اندر... وادئ پھنڈر پنہاں تھی...

ہم نہ نادر شاہ تھے کہ شمشیر ابن شمشیر ہوتے.. نہ رنجیت سنگھ تھے کہ شیر پنجاب ہوتے اور نہ ملکہ وکٹوریہ تھے کہ سمندر کی لہروں پر بھی ہمارا راج ہوتا... لیکن ہم نے وادئ پھنڈر کے کوہ نور تک پہنچنا تھا.. کہ ہم تسخیر کرنے والوں میں سے نہیں تھے.. تسخیر ہونے والوں کے قبیلے میں سے تھے..

وادئ پھنڈر ایک ایسا ہیرا تھی جس کی تراش خراش پر ابھی کسی نے توجہ نہیں کی تھی.. اور خدا کا شکر ہے کہ وہ ابھی ناتراشیدہ تھی..

اگر وہ تراشی جاتی تو وادی کاغان ہو جاتی.. وادئ ہنزہ ہو جاتی.. اُس کا حسن صلائے عام ہو جاتا..

ہمیں بتایا گیا تھا کہ وہ ایسی ہے.. لیکن ہم ابھی فیصلہ محفوظ رکھتے تھے.. ہم دیکھ

کر یقین کرنے والوں میں سے بھی تھے.. کیونکہ ایسی بہت سی وادیاں تھیں جن کے قصے فرضی نکلے.. تو ہم نے پہلے دیکھنا تھا پھر یقین کرنا تھا..

گوپس کے تنگ بازار میں سے گزر کر ہم اونچے ہوئے... جیپیں اور تازہ دھلی ہوئی اکڑی ہوئی وردیوں اور نیلی کیپس میں ملبوس اُن کے فوجی ڈرائیور اونچے ہوئے اور... ویران وسعتوں کے اندر سفر کرنے لگے..

ڈرائیور نمبر ایک... باریش مولوی غازی کو خصوصی طور پر ہمارے لیے تعینات کیا گیا تھا کیونکہ وہ اس دریائے غذر کے کنارے... جس کے کنارے ہماری جیپیں ایک روڈ کی تہمت پر اپنے ٹائر ایک جانب چٹانوں سے ٹکرانے اور دوسری جانب کھائی کے کناروں سے گرنے سے بمشکل بچاتی تھیں... پنگل نامی گاؤں کا باسی تھا جو اسی روڈ پر کہیں آگے تھا اور یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ غازی مہا آتما ہے جو سب جانتا ہے اور جس کی رُوح اکثر اُس کے بدن کو چھوڑ کر وادئ گوپس اور وادئ پھنڈر کے درمیانی علاقوں میں سر شام جوگنگ کرتی ہے.. ان وادیوں کا طائرانہ مطالعہ کرتی ہے اور پھر دانش سے سرشار ہو کر واپس آجاتی ہے.. اور اُس نے گلگت میں اپنی جیپ سٹارٹ کرنے سے پہلے اعلان بھی کر دیا تھا کہ... صاحب.. ہم اس علاقے کا ذرہ ذرہ جانتا ہے اور ذرہ ذرہ ہمیں جانتا ہے تو آپ کو ایسے لے کر جائے گا جیسے پاک ہم لوگوں کو لے کر درہ ورکوت کے پار جاتا ہے..

اور ڈرائیور نمبر دو... اسلم نام کا ایک ٹپیکل مہاندرے والا فوجی جس کی کوئی شناخت نہیں ہوتی.. نہ اس کی شکل میں کوئی خاص بات ہوتی ہے اور نہ اس کی باتوں میں کوئی رمز ہوتی ہے.. وہ بالکل براہ راست سیدھا سیدھا ایک فوجی تھا اور ایک ڈرائیور تھا.. ایسی بے شناخت شکل والا جو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں جنگ کا ایندھن بنتے ہیں اور بھسم ہو جاتے ہیں اور اپنی شخصیت کا کوئی الگ نشان چھوڑ کر نہیں جاتے صرف اُن کا فوجی شناختی کارڈ اور رینک فائلوں میں درج ہو کر تہہ خانوں میں گم ہو جاتا ہے..

اور یہ اسلم، ہکلا کر، گھبرا کر بات کرتا تھا..

میں نے مولوی غازی کو محرم راز بنانا مناسب خیال کیا "یہ اسلم ڈرائیور کیسا ہے؟ بال بچے ساتھ ہیں اور میں نے شندور روڈ کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اچھا نہیں سنا..

پچھلے برس راولپنڈی کے کسی کالج کی جیپ وہاں سے گری تھی اور بہت نقصان ہوا تھا"

"جی سَر۔" غازی ٹَن ہو کر سیلوٹ کی حالت میں ہو گیا اور وہ بار بار یہی عمل دوہراتا تھا۔۔

"دیکھو غازی میں تمہارا افسر نہیں ہوں... مجھے بار بار اس عذاب میں مبتلا نہ کرو.. اَیٹ ایز یار... اپنے آپ کو ڈھیل دو اور نارمل ہو کر بات کرو... تو یہ اسلم کیسا ڈرائیور ہے؟"

"سَر۔" وہ اَیٹ ایز ہوا اور اپنی جواں ریش کو سہلاتا ہوا بولا "سَر پنجاب سے آیا ہے۔ پچھلے ہفتے آیا ہے اور آج تک ماؤنٹین روڈ پر نہیں گیا۔"

"یعنی یہ اس سے پیشتر گلگت سے چترال تک نہیں گیا؟"

"نہیں سَر۔"

"تو پھر بریگیڈیئر مجاہد صاحب نے ایسے کچے ڈرائیور کو ہمارے ساتھ کیوں کر دیا ہے؟"

"کیا معلوم سَر... شائد اس لیے کہ بریگیڈیئر صاحب جانتا ہے کہ غازی ساتھ ہے تو یہ اُس کے پیچھے پیچھے گرتا پڑتا چلا جائے گا.. ہم اسے سنبھال لے گا سَر.."

میں، عینی اور میمونہ غازی کی جیپ میں تھے..

سلجوق اور سُمیر... اسلم کی جیپ میں بیٹھے تھے تاکہ دونوں بھائی میری نظروں سے دُور مستیاں کر سکیں.. سلجوق ابھی تک ملنگ بابا تھا.. نیشنل کالج آف آرٹس کا ننّھا کلچر عارضی طور پر اس پر حاوی ہو چکا تھا، اور اُس نے کندھوں تک آتے بالوں کو ایک پونی ٹیل کی صورت میں باندھ رکھا تھا...دُور سے وہ میری دوسری بیٹی لگتا تھا.. سُمیر جو ابھی ایف سی کالج میں نووارد تھا کانوں سے ہیڈ فون لگائے دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی بہت ہی طویل نام والے مغربی گروپ کی موسیقی سن رہا تھا..

"اسلم..."

"جی سَر...." وہ جیپ کا سٹیئرنگ چھوڑ کر باہر آ گیا اور سیلوٹ کی حالت میں منجمد ہو گیا۔ میں نے عرض کیا تھا ناں کہ اسلم کے چہرے پر کچھ بھی بیان کرنے کے قابل نہ تھا.. گندمی رنگ، ہلکی مونچھیں، سیدھے بال... اکڑی ہوئی وردی اور لشکتے فل بوٹ...

اُسے بھی میں نے "اَیٹ ایز یار" کی درخواست گزار کر نارمل کیا "اسلم... آپ اس سے پیشتر شندور روڈ پر چترال تک جیپ لے کر نہیں گئے؟"

"نہیں.. نہیں سَر.. میں نے تو تو.. چند روز پہلے.. یہ شن شن دور کا نام سنا ہے سر... نہیں گیا"

نہ وہ شندور روڈ پر گیا تھا اور پھر ستم بالائے ستم ہکلا کر بات کرتا تھا..

"تو پھر کیسے جاؤ گے؟"

"صاحب..ڈ...ڈرائیور تو..ڈ..ڈرائیور ہوتا ہے.. میں ڈرائیور ہوں..روڈ ہو ہو گا.. تو چلاؤں گا.."

"میرے ساتھ میرا بال بچہ ہے اسلم—"

"میرا بھی ب بال بچہ ہے سَر... گ گراں میں... ویسا خیال رکھوں گا.. سَر سَر میں.. مَک میکینک بھی ہوں۔"

گوپس پہنچتے پہنچتے ہم جان گئے کہ غازی باتوں کا دھنی ہے اور اسلم جیپ چلانے کا... اور اُس نے درست کہا تھا کہ انسان ڈرائیور ہو اور روڈ ہو تو بے شک ان دیکھی ہو تو وہ چلائے گا.. اسلم یقیناً ڈرائیور تھا.. اور غازی، گفتار کا غازی۔

اور گوپس کے آگے جو روڈ تھی... وہ مسٹر بکس اسلام آباد والے میرے دوست یوسف کے مطابق بس "غدر" تھی..

بھلے وقتوں میں وہ کسی پُرکشش چہرے کے بارے میں بس اتنا ہی کہا کرتا تھا کہ تارڑ صاحب.. بس غدر ہے... اور کسی کی بد تعریفی کرنی ہے تو بھی... تارڑ صاحب کیا بتاؤں... فلاں بندہ تو بس غدر ہے.. تو یہاں یہ روڈ جو دریائے غذر کے کنارے تھی بس "غدر" تھی۔۔ نہ یہ کچی تھی' نہ پتھریلی تھی... نہ اتنی چوڑی تھی کہ اس پر جیپ کے چاروں ٹائر آسانی سے آ سکیں.. چٹانوں کی چونچیں نکلی ہوئی تھیں اور جہاں روڈ انہیں کاٹ کر بنائی گئی تھی وہاں سے گزرتے ہوئے لگتا تھا کہ سر چٹانوں سے ٹکرانے کو ہے..اور اس کے باوجود یہ روڈ تھی.. اور اکثر اوقات اتنی اونچائی پر چلی جاتی تھی کہ نیچے دیکھنے سے آنکھوں کے سامنے اندھیرے کے سوا کچھ نہیں آتا تھا.... شک سا ہوتا تھا کہ نیچے کوئی وادی ہے، جھونپڑے ہیں، دریا ہے... یا شائد نہیں ہے.... میری

ہتھیلیوں میں سے وہی پسینہ پھوٹنے لگا جو کئی برس پیشتر پہلی بار شاہراہِ ریشم پر ایک کوسٹر میں سفر کرتے ہوئے سلجوق کا ہاتھ تھامے، ڈھلتی شام میں، گہرائی میں دریائے سندھ کی ایک ایسی لکیر کو دیکھ کر آیا تھا جو تحت السرا میں تھی.. یا نہیں تھی۔

یا خدا میں اپنی ساری متاع کو لے کر ادھر کیوں آ گیا..

اگر ہم گرتے ہیں تو خیر ہے.. میں اور میمونہ.. لیکن ہمارے ساتھ عینی بھی ہے تو نہیں، نہیں ہم کیسے گر سکتے ہیں..

اور پچھلی جیپ میں سلجوق اور سُمیر دونوں بھائیوں کو اکٹھے کیوں بٹھا دیا..

یا اللہ خیر!

میں سفر کو قطعی طور پر انجائے نہیں کر رہا تھا صرف اس کے خوف کو برداشت کرنے کی سعی کر رہا تھا..

گوپس سے نکلتے ہی مجھے اور میمونہ کو جھٹکوں اور ہچکولوں سے بچنے کے لیے اور اپنے آپ کو اپنی نشستوں پر قائم رکھنے کے لیے جیپ کے آہنی راڈ مضبوطی سے تھامنے پڑے تھے.. ہمارا خیال تھا کہ یہ عارضی بندوبست ہے۔ ابھی صورت حال بہتر ہو جائے گی اور ہم اطمینان سے اپنی نشستوں پر ریلیکس کر کے نظارے کریں گے لیکن یہ خیال بہت ہی خام تھا.. ہمارے بائیں بازو... اگرچہ بایاں بازو بہت انقلابی ہوتا ہے لیکن یہ بازو جیپ کے راڈ کو انگلیوں کے شکنجے میں کسے... دھچکوں اور بے اختیار دھکوں کے مسلسل وردو سے نہ صرف دُکھنے کو آیا بلکہ آہستہ آہستہ سوجن میں مبتلا ہوا اور پھر اس کی جڑیں اُکھڑنے لگیں.. دار و رسن کی اس آزمائش کے بعد مجھے یاد ہے کہ لاہور واپسی پر بھی ہم اپنے گھر میں بایاں بازو اٹھا کر آسرے کے لیے کسی راڈ کو تلاش کرتے تھے کہ گھر ہلتا ہوا لگتا تھا اور ہم ڈرتے تھے کہ ابھی کہیں نہ کہیں گر جائیں گے..

جیپیں شکاری کتوں کی طرح... جنہوں نے شکار کی بُو سونگھ لی ہے.. ناکیں اونچی کیے بلند ہوتی گئیں.. پھر چند پتھر آئے.. ٹائروں تلے کچھ ریت آئی اور جھیل خلطی نظر آئی.. ہمارے سامنے، بلکہ نشیب میں ایک ایرانی قالین کی طرح بچھی ہوئی نظر آئی..

اس ایرانی قالین پر شکار کا کوئی منظر نہ تھا.. اس لیے کہ جو شکار تھے وہ اس جانب ایک اونچائی پر سے اُسے دیکھتے تھے... دونوں جیپوں کے رُکنے کے بعد.. اُن کے

انجنوں کے شور سے یکدم مکمل سناٹے میں سنسناتے کانوں کے ساتھ.. اُسے دیکھتے تھے.

عجب شیشہ گری تھی..

نرم ریت پر اُترتے.. اپنے بائیں بازو سہلاتے.. اپنے سامنے اُس ایرانی قالین کو دیکھتے... جھیل خلطی کی شیشہ گری میں ہم اصفہان نصف جہان کے گنبدوں کی نیلاہٹ دیکھتے تھے.. جھیل کے شیشے میں اُس پر جھکے بھورے پہاڑوں اور گھاس کے ٹکڑوں کے رنگ تھے.. کناروں پر گھنے باغ اور زرد ہوتے کھیت تھے..

اگرچہ ہم نے ایف۔اے کے فارسی نصاب میں بُوئے جوئے مولیاں آید ہمے اور... یادِ یارِ مہرباں آید ہمے... خوب رٹا تھا لیکن... شیراز کے باہر ایک کیچڑ سے بھری چھوٹی سی ندی ہے اور جوئے مولیاں کہلاتی ہے اُس کے مقابلے میں یہ شیشہ جھیل اور اس کے پانی کہیں آگے تھے لیکن ان کے لیے کوئی حافظ کوئی سعدی قصیدہ گو نہ ہوا اس لیے.. یہ گمنام رہی.. رب کے بنائے ہوئے منظروں کی توصیف اگر انسان نہ کرے تو ان کا چرچا نہیں ہوتا..

سُمیر.. ویڈیو کیمرے میں سے اُسے دیکھتا تھا اور کیمرے کے ویو فائنڈر سے اپنی تیکھی ناک کو الگ رکھنے کی کوشش کرتا تھا.. جھیل خلطی کو اپنے تئیں.. اپنے گلبرگ کے گھر کے لیے قید کرتا تھا.. اپنے تئیں کیوں؟... یہ بہت بعد میں کھلے گا..

سلجوق... گہری نیلی ٹی شرٹ اور جین میں.. اپنی پونی ٹیل کو سہلاتا اُسے دیکھتا تھا.. جھیل خلطی کا ایرانی قالین ہمارے قدموں میں بچھا ہوا تھا اور اُس کے رنگ قدرتی جڑی بوٹیوں سے کشید کیے گئے تھے..

یہ جھیل مجھ تک بھی بے خبری میں آئی..

"سر... ادھر پہلے یہ جھیل نہیں تھا—" غازی نے اطلاع کی۔

"تو پہلے ادھر کیا تھا؟"

"ساٹھ چولہوں کا وادی میں گھرا ایک گاؤں تھا.. جیسا بہت سا گاؤں شمال میں دریا کنارے یا گلیشیر کے دہانے پر ہوتا ہے، ویسا گاؤں تھا.. پھر 1989ء میں پہاڑ پر سے سیلاب اُترا، وہ سیدھا نیچے دریا میں اُترا اور اُس میں پہاڑ کا بہت بڑا بڑا پتھر تھا... اُس نے دریا میں گر کر پانی کا بہاؤ روک دیا.. پانی آہستہ آہستہ اوپر ہو کر دریا کے کناروں سے باہر

آیا... ساتھ چولہے تھے... پہلے ایک چولہے کے اندر پانی آیا اُسے بجھایا اور اُس کے پاس جو روٹی پکاتے تھے... مدتوں سے ادھر آباد تھے وہ بے گھر ہوئے... پھر پانی دوسرے چولہے کے جھونپڑے تک گیا.. تو ایسے پورا گاؤں پانیوں کے نیچے چلا گیا.. اور جھیل بن گیا۔"

"اس جھیل کی تہہ میں پورا گاؤں ہے؟"

"ہاں صاحب.. یہ وادی پوری کی پوری ڈوب گئی اور پانی اونچا ہو کر روڈ تک آگیا.. آپ چلو تو ہم دکھاتا ہے۔"

ہماری جیپیں اس ریتلی بلندی سے نیچے اُتریں اور ایک ایسی روڈ پر آئیں جس کے پہلو میں خلطی جھیل کے سیاہ... کہیں نیلے پڑتے پانی تھے..

دائیں جانب کئی چپٹی اور نوکیلی چٹانیں تھیں، جیپ کا کوئی راڈ یا بیک ویو مرر ان سے ٹکرا جاتا تو ہم اُلٹ جاتے.. اور بائیں طرف سڑک کو تقریباً چھوتے ہوئے جھیل کے پانی ساتھ ساتھ چلتے تھے.. ان پانیوں کے اندر اتھاہ گہرائی میں ایک وادی تھی جس میں کبھی ساٹھ چولہے روشن ہوتے تھے..

"احتیاط سے..." میں نے غازی سے کہا.. ہونٹ بھینچے، ماتھے پر سلوٹیں ڈالے اور دیر تک آنکھیں نہ جھپکتا ہوا غازی خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا..

سڑک کے کناروں کی سطح سے جھیل کے پانی ٹکراتے تھے.. اور کبھی سڑک پر پھیلتے تھے اور ان پر ہماری جیپیں پھونک پھونک کر ٹائر رکھتی تھیں کیونکہ ہم اگر ذرہ بھر بھٹکتے تھے، سٹیئرنگ کا ایک ماشہ اُدھر کے پلڑے میں بھاری ہوتا تھا تو ہم صرف گہرائی میں گرتے نہ تھے بلکہ ڈوبتے تھے اور گہرائی میں اُترتے تھے.. اور کیا معلوم اس صورت میں ایک نیست و نابود پانی میں گم کسی ایسے جھونپڑے کی چھت پر جا اُترتے تھے جو کئی کلومیٹر نیچے تھا.. اور اُس کا چولہا پچھلے تین برس کی غرقابی کے باوجود اب تک روشن ہو اور اُس کے سامنے ایک گل بوٹوں سے مزین لمبی ٹوپی اور سیاہ لباس پہنے ایک بوڑھی خاتون روٹیاں پکا رہی ہو اور اُسے ابھی تک خبر نہ ہو کہ خلطی کا گاؤں ڈوب چکا ہے.. اور وہ حیرت سے اُس جیپ کو دیکھے جو آہستہ آہستہ پانی میں اُترتی اُس کے جھونپڑے کی چھت پر ہلکورے لیتی آ رُکے..

اور اُس جیپ میں سے ایک تارڑ اُترے... تیرتا ہوا.. جیسے اُس نے بچپن میں ایک انگریزی ناول کا اردو ترجمہ "پانی کے بچے" پڑھا تھا.. جیسے وہاں پیارے اور سفید بانکے بچے سانس روکے پانیوں کی دنیا میں تیرتے پھرتے تھے.. ویسے ہی وہ تیرتا ہوا جیپ سے باہر آئے اور اُس بوڑھی عورت سے کہے "اماں کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارا ساٹھ چولہوں والا گاؤں ایک مدت سے پانی میں ڈوب چکا ہے اور تم اب تک روٹیاں پکا رہی ہو.."

خلطی جھیل کے کناروں پر.. اگر کوئی سفر کرے تو اُسے ایسے ہی خدشے گھیرتے ہیں.. ناممکن اور ناقابلِ یقین کے جال اُسے شکار کرتے ہیں..

میں نے کچھ دیر پہلے جب خلطی جھیل کو اُس ریتلی اور پتھریلی بلندی سے جیپ کی ونڈ سکرین میں ایک معجزے کی طرح نمودار ہوتے دیکھا تو میں اُس پر ایمان لے آیا تھا... اُس آبی ایرانی قالین کے پیغمبری رنگوں کے سامنے سر جھکا دیا تھا.. لیکن اب اس کی جان لیوا خطرناکی مجھے بے ایمان کر رہی تھی..

یہ جھیل ہرگز ایسی نہ تھی کہ میں اس کے کناروں پر دوبارہ سفر کرنے کی آرزو کرتا.. اور جب ہم اُس سے بلند ہو کر.. اُس کے پانیوں سے پرے اور اوجھل ہو کر واپس اُس دشتِ تنہائی میں آئے جو قراقرم کے اندر تھا.. تب میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا جو یقیناً اُس بوڑھی خاتون تک بھی پہنچا ہو گا جو جھیل میں ڈوبی وادی میں ابھی تک چولہا روشن رکھے روٹیاں پکاتی تھی۔

شام ہماری مسافت کی قربت میں اُترتے ہوئے ابھی جھجکتی تھی لیکن وہ ابھی سے ہماری جیپوں کے رنگ مٹیالے کرتی تھی۔

خلطی جھیل کے گہرے پانیوں میں پوشیدہ گاؤں اور چولہوں کی بجھ جانے والی آگ کے سوگ میں وہ شام سیاہ پوش ہونے کو تھی جب ہمارے سامنے بتھریت نالے کا شور اُبھرا... اور وہ نالہ قطعی طور پر یہ نہیں جانتا تھا کہ ہم بہت دور سے آئے ہیں اور سرِ شام آئے ہیں.. تو ہمارے لیے کچھ تو آسانی چاہیے...

بتھریت نالہ، اپنے زور میں... اور اپنے بے لگام بہاؤ میں تھا اور ایک سفید ناگ کی طرح اُترتی شام میں شُوکتا تھا..

غازی ذرا رُکا.. اُس کے بہاؤ اور کناروں کو غور سے دیکھا اور پھر جیپ کو سڑک سے اونچائی پر لے جا کر نالے کے سپرد کر دیا.. پانیوں نے اُسے مداخلت بے جا جانا اور دھکیلنے لگے.. دھواں دیتی، فرسٹ گیئر میں پورا زور لگاتی جیپ پار جانے کی بجائے دھیرے دھیرے بہاؤ کے ساتھ ایک کھلونے کی طرح ڈولتی نیچے جانے لگی اور ہمارے دل یا جگر وغیرہ.. حلق میں آنے لگے کہ اگر انجن میں پانی چلا گیا اور یہ بند ہو گئی تو یہ اُلٹے گی اور بہہ جائے گی.. لیکن ان لوگوں کو تجربہ ہوتا ہے کہ کتنے تیز پانی میں اگر جیپ کو ڈالا جائے تو وہ کتنی دور بہہ کر پار لگے گی چنانچہ ہم بہتے ہوئے جب عین اُس مقام تک پہنچے جہاں نالہ نیچے گہرائی میں گر رہا تھا تو اُس کے ٹائر دوسرے کنارے کے پتھروں پر آ چکے تھے..

ہم پار ہوئے تو اسلم نے اپنی جیپ نالے میں اُتار دی اور ہم اُسے اُترتی شام میں آہستہ آہستہ بہاؤ کے ساتھ نیچے آتے دیکھتے رہے اور وہ بھی ہمارے عین سامنے کنارے سے آ لگی..

جبیلی غلطی کے بعد اس کراسنگ نے بھی ہمیں ہراساں کیا..

بخیریت نالے کو پیچھے چھوڑ کر..... ہم آگے گئے لیکن ہماری سراسیمگی اور بے دلی کی کیفیت بھی ہمارے ساتھ گئی..

راستے میں مولوی غازی کا گاؤں پنگل آیا.. وہ جیپ کھڑی کر کے گاؤں کے اندر گیا.. لوٹا تو اُس کی پری زاد بیٹی سُرخ چیریوں سے سجا ایک تھال تھامے اُس کے ہمراہ چلتی آ رہی تھی.. غازی نے اگرچہ بہت اصرار کیا کہ صاحب رات ادھر کر لو... ہمارا گھر ہے لیکن ہم اُس پر بوجھ بننا نہیں چاہتے تھے.. یوں بھی ہم کوہ نور ہیرے کے لیے سرگرداں تھے.. مقامی خواتین بھی گاؤں سے نکل آئیں اور میمونہ اور عینی کو گھیر لیا..

غازی کی بیٹی کے علاوہ بھی پنگل خوش نظر چہروں کا گاؤں تھا.. جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی..

اور ہر چہرے پر حیرانی اور دور افتادگی کی معصومیت تھی..

اور تمام چہروں پر گل بوٹوں کی حنائی آرائش تھی... ماتھوں پر سرے سے بنے ہوئے ایسے نقش تھے جو میں نے صرف کالاش لڑکیوں کے ماتھوں اور رخساروں

پر دیکھے تھے... یعنی چہروں پر ایسے نقش و نگار بنانا کافرستان کی قدیم تہذیب کا ایک حصہ نہ تھا بلکہ یہ آرائش ان وادیوں کی ثقافت میں شامل ہے... ان دنوں ہمارے ہاں نوجوان لڑکیاں تقریبات کے موقعوں پر اپنے چہرے "پینٹ" کرواتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ وہ تازہ ترین فیشن کر رہی ہیں.. لیکن یہ فیشن صدیوں سے پنگل ایسے دیہات میں رائج ہے اور جب یہ لڑکیاں ماڈرن ہوں گی تو اپنے چہرے صاف رکھیں گی کہ حنائی اور سیاہ رنگوں سے چہرے پینٹ کرنا تو پرانے رواج ہیں..

عینی کے لیے یہ ایک جہانِ دیگر تھا.. وہ اُن کے لباسوں اور زیورات کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھتی تھی اور حیران ہوتی تھی کہ پنگل میں تو کوئی بوتیک نہیں ہے تو یہ ان دیکھے پرنٹ اور ڈیزائن کہاں سے آ گئے..

ہم پنگل سے نکلے تو پھنڈر تک خاموشی سے آئے..

ڈرائیوروں نے ہیڈ لائٹس آن کر دیں... پھر وسیع منظروں کے دھوکے میں سے... کہ شام ہو رہی تھی اور اُس کی سیاہی میں وادیاں اور شجر اور ندیاں ایک فریب ایک دھوکے میں بدلتی تھیں ہماری جیپوں کے گرد پہاڑوں کا گھیر اتنگ ہو گیا.. ایک مختصر سی بستی آئی.. چار پانچ دکانوں کا ایک بازار آیا.. جو کہ پھنڈر کا بازار تھا..

گہری ہوتی شب میں ہم اُس بازار میں سے گزرے.. سوائے ایک روشن لالٹین کے اور کچھ نہ دیکھا اور پھر اُس بازار سے نکل کر اوپر ہوئے.. ایک ویرانی میں سے گزرنے لگے..

اور جب ایک موڑ کاٹ کر جیپیں یکدم تھم گئیں.. اُن کے انجن چپ ہوئے، ہیڈ لائٹس گل ہوئیں تو پھنڈر کے اکلوتے ریسٹ ہاؤس کی کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کے عقب میں ایک لالٹین روشن ہوئی اور ہمیں دیکھ کر روشن ہوئی..

آس پاس تاریکی مزید گہری ہو گئی اور ہمیں کچھ علم نہ تھا کہ ہم کہاں ہیں، کس مقام پر ہیں... ہمارے بائیں بازو دُکھتے تھے، بدن بیزار تھے اور ہمارے اندر غلطی جھیل میں ڈوبے ہوئے چولہوں کا خوف روشن تھا..

لیکن ہم پھنڈر میں تھے...

”چھوٹا کشمیر اور کھڑکی میں فریم شدہ پھنڈر کی تصویر“

اصحاب کہف جب جاگے تو زمانہ بدل چکا تھا.. سکہ بدل چکا تھا..

بے انت زمانے نیند میں گم کر کے بیدار ہوئے تو دنیا بدل چکی تھی اور وہ اُسے پہچانتے نہ تھے..

میں ایک ناآشنا مقام پر ایک سرد شب کے سکوت میں نیند میں گیا تھا.. متعدد کمبلوں میں اپنی ٹانگیں پیٹ کے ساتھ لگائے ایمبرو حالت میں اپنے آپ کو گرم رکھنے کی کوشش میں بھی سرد ہو تا رہا تھا.. تکیے میں سر دیے نیند سے بوجھل پپوٹوں میں سے کچھ سفیدی کچھ دُھند سی اُتری اور میں نے آنکھیں کھول دیں.. اور وہی ہمیشہ کا ردِ عمل کہ میں کہاں ہوں.. یہ گھر تو نہیں.. تو کیا ہے.. برابر کے بستر پر میمونہ اور عینی گچھا مچھا ہو کر ابھی گہری غفلت میں تھیں.. ریسٹ ہاؤس کے پرانے کمرے میں ٹھنڈک ٹھہری ہوئی تھی.. فرش پر جو چٹائی نما غالیچہ تار تار ہونے کو تھا اُس پر ہمارا سامان بکھرا پڑا تھا.. تپائی پر دھری لالٹین ٹھنڈی ہو چکی تھی..

اور جب میں نے آنکھیں وا کیں تو میرے بستر کے برابر میں دیوار پر ایک فریم شدہ تصویر تھی..

یہ تصویر انار کلی کے فٹ پاتھ پر سجی ہوئی کوئی ایک تصویر، کوئی ایک سینری ہو سکتی تھی..

لیکن اس میں دو خامیاں تھیں..

ایک تو یہ قدرے ٹیڑھی تھی.. اور دوسرے اس کے درختوں، کھیتوں اور چٹیل پہاڑوں کے دامن میں پھیلی ہوئی سرسبز وادی اور اُس کے درمیان میں بہتے ایک نہر نما دریا اور کناروں کی گھاس میں جو رنگوں کی تازگی تھی وہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔

اور میں آنکھیں نیم وا کیے اُس تصویر کو تکتا رہا..

پھر مجھے ایک دھچکا سا لگا..

میں شائد ابھی تک نیند میں تھا.. کسی حالتِ خواب میں ابھی تک مخمور تھا.. شائد اس لیے اُس تصویر میں درخت بلند ہوتے تھے اُن کے کچھ پتے جیسے ہوا کے کسی نامعلوم جھونکے سے ذرا سے ہلے اور پھر ساکت ہو گئے..

باقی ہر شے تصویر تھی... ایک فریم شدہ تصویر میں جیسا کہ اُس منظر کو ہونا چاہیے وہ بے حرکت تھا.. تو اُس کے درختوں کے چند پتے چاہے پل بھر کے لیے ہی سہی، ہل کیسے سکتے تھے..

میں ابھی تک نیند میں تھا..

اور پھر وہ دریا... جو ایک سرسبز میدان کے بیچ ایک ہموار سطح پر خاموش بہاؤ میں تھا.. اور اُس کے کناروں پر جو چند درخت کھیتوں سے ادھر کھڑے دریا کو تکتے تھے، اُن کے عکس دریا میں تھے تو وہ عکس ذرا ادھر اُدھر ہوئے.. جیسے پانیوں میں روانی ہو..

میں یقیناً ابھی تک نیند میں تھا..

اور تب میں نے اس فریم شدہ تصویر میں جو ایک راستہ کھیتوں میں سے ہوتا ہو ا دریا کے کناروں تک جاتا تھا وہاں جو پانچ پاپلر کے درخت سر بلند تھے اُنہیں میں نے لچک کر جھومتے ہوئے محسوس کیا..

یہ حیرت کی کارواں سرائے کی کونسی منزل تھی... جس میں... ایک فریم شدہ تصویر کے چوکھٹے میں ایک تصویر کسی غیبی اشارے سے زندہ ہونے لگے.. یہ کیسے ہو سکتا ہے.. اور یہ میرا گمان نہ تھا.. تکیے میں سر دیے جب میں اپنے بوجھل پپوٹوں کو کھولتا تھا تو مجھے ایک فریم شدہ تصویر نظر آتی تھی.. یہ حقیقت تھی..

ایک ساکت تصویر میں، درختوں کے چند پتے تبھی حرکت میں آ سکتے ہیں اگر آپ... مادھو لال حسین کے عرس میں بھنگ کے چند پیالے.... ونیں گھوٹیاں تے

راتیں بیتیاں... لوکی کہندے مر گئے نیں.. اساں اللہ نال گلاں کیتیاں.... ایسی پُر تاثیر بھنگ کے چند پیالے چڑھا کر اُسے دیکھیں.. یا پھر آپ شہباز قلندر کے ملنگوں کے ہمراہ چند "سوٹے" لگا کر آئے ہوں تو پانی میں درختوں کا عکس رواں ہو سکتا ہے... لیکن میں تو یقین سے کہہ سکتا تھا کہ پچھلی شب نہ میں شاہ حسین کے عرس پر گیا تھا اور نہ شہباز قلندر کے ملنگوں کے ساتھ ملنگ ہوا تھا..

تو پھر یہ فریب نظر کیا تھا..

میں دیر تک نیم غنودگی کی کیفیت میں اُس فریم شدہ تصویر اور لکڑی کے چوکھٹے کو دیکھتا رہا... اور جب دیر تک دیکھتا رہا تو اس تصویر میں آہستہ آہستہ سورج کی زرد کرنیں اُترنے لگیں اور دریا کی سطح جو ابھی کھیتوں کی سبز رنگت میں رنگی ہوئی ہریاول میں تھی، اب آئینہ ہونے لگی اور اُس منظر میں ایک روشن چھب دکھلانے لگی...

"آپ سوئے نہیں؟" نیند کے نشے میں ڈولتی میمونہ کی آواز آئی...

میں نے کروٹ بدل کر اُس کی جانب دیکھا "صبح ہو چکی ہے بیگم صاحب!"

"اچھا..." اُس نے آنکھیں کھول دیں.. اُس نے غور سے میری جانب دیکھا اور پھر مجھ سے پرے وہاں دیکھا جہاں لکڑی کے چوکھٹے میں فریم شدہ تصویر آویزاں تھی اور پھر اس کی آنکھیں ایسے بیدار اور ہوشیار ہوئیں جیسے وہ کبھی سوئی ہی نہ تھیں "آپ نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے چوکھٹے میں دیکھا ہے کہ کیا نظر آرہا ہے؟"

"ہاں ــــ" میں نے کروٹ بدل کر پھر سے اپنا چہرہ اُس فریم کی جانب کیا جس میں جڑی تصویر میں اب زرد کرنیں اُترتی جاتی تھیں "لیکن میمونہ.. اس فریم شدہ سینری میں جو درخت ہیں اُن کے پتے ہلتے ہیں، جو دریا ہے اُس میں بہنے کا احساس ہے اور یہ روشن ہوتی جاتی ہے... ایسا کیوں ہے؟"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی "اس کمرے کی کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا ہے اور آپ اُس کے خالی چوکھٹے میں سے وادی پھنڈر کو دیکھ رہے ہیں اور لگتا یہی ہے کہ یہ ایک فریم شدہ تصویر ہے.." وہ میرے قریب آکر بیٹھ گئی "آپ ابھی تک نیند میں ہیں؟"

"نہیں ــــ"

"تو کیا آپ دیکھ نہیں سکتے یہ منظر کھڑکی کے چوکھٹے میں سے دکھائی دے رہا ہے

اور یہ کسی کیلنڈر کی تصویر نہیں.. دیکھ نہیں سکتے؟ سوڈو رومانٹک ہونے کی بھی حد ہوتی ہے.. آپ دیکھ سکتے ہیں اور پھر بھی یقین کیے جاتے ہیں کہ یہ.. ایک فریم شدہ تصویر ہے.."

"میں جانتا تھا کہ یہ تصویر نہیں ہے۔"

"تو پھر.."

"دراصل پہلی نظر میں مجھے یہ ایک فریم شدہ تصویر ہی نظر آئی.. اور دوسری نظر میں.. دوسرے لمحے میں میں جان گیا کہ یہ ہمارے کمرے کی کھڑکی کی ایک چوکھٹ میں سے دکھائی دینے والی وادیٔ پھنڈر کی سویر ہے.. لیکن میں نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر پہلی نظر میں ہی قید رکھا.. اپنے آپ کو دھوکا دیا، فریب میں رکھا کہ... میں اس پہلی نظر کے سحر کو جاوداں کر کے اُس میں اسیر رہنا چاہتا تھا..."

میں نے کیمرہ کھول کر اس فریم شدہ سینری کی ایک تصویر اُتاری اور میں اب بھی آٹھ نو برس بعد جب اُسے دیکھتا ہوں تو وہ تصویر کے اندر ایک اور تصویر نظر آتی ہے..

"آپ کا کچھ نہیں ہو سکتا ــــ" میمونہ کے چہرے پر وہی تازگی اور اوائل جوانی کی دوشیزگی کا نکھار تھا جو برسوں پہلے پائن ہوٹل نتھیا گلی کے ایک کمرے میں تھکن سے بیدار ہوتے ہوئے اس کا روپ کو نکھارتا تھا.. "جو شخص پہلی نظر کا قیدی ہو، اپنے آپ کو سدا فریب میں رکھے.. اُس کا کچھ نہیں ہو سکتا.. بچوں کو جگا دوں؟"

"وادیٔ پھنڈر حشر اور دریائے غذر 'غدر'"

وہ جو کوئی بھی تھا جس نے پھنڈر ریسٹ ہاؤس کے مقام کا تعین کیا کہ یہاں اس جگہ پر ایک رہائش گاہ ہونی چاہیے..

جس نے اسے تصور کیا، جو اسے خیال میں لایا، جس نے قیاس کیا.. وادی کو ایک پرندے کی نظر سے دیکھنے والے مقام پر.. جس نے سوچا کہ یہاں ایک ریسٹ ہونا چاہیے.. وہ شخص جو بھی تھا.. نہایت آسانی سے ایک مونالیزا پینٹ کر سکتا تھا، ایک وینس ڈی میلو کا مجسمہ تراش سکتا تھا کہ اُس میں ڈی ونچی اور یونانی جزیرے میلو کے گمنام بُت تراش کا ایسا ہی ذوق جمال تھا..

پھنڈر ریسٹ ہاؤس کے پتھریلے وجود میں جکڑی ہوئی سفید کھڑکیاں جن میں سے ایک کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور کمروں کے آگے سفید برآمدہ اور آتش دانوں کی دو چمنیاں جو اُس کی ڈھلوان چھت سے بلند ہوتی تھیں اور پس منظر میں مٹیالے پہاڑ جن کی دستاریں سفید برف تھیں..

ریسٹ ہاؤس کے سامنے ہماری دو سبز فوجی جیپیں کھڑی تھیں..

شائد یہ وہ دو کتے تھے جو اصحاب کہف کا ساتھ دے رہے تھے..

ریسٹ ہاؤس کی جانب سے سلجوق ایک نیلی جین اور افغان جیکٹ اور سمور کی سفید ٹوپی میں... کندھے پر ایک بھاری ویڈیو کیمرہ اُٹھائے میری جانب آتا تھا.. اُن دنوں ابھی ہینڈی کیم ایجاد نہیں ہوئے تھے اور کیمرے بوجھ ہوتے تھے..

میمونہ ہم سب کی جرابیں دھو کر کمرے کی کھڑکیوں پر سوکھنے کیلئے ڈال رہی تھی.. اور میں.. ریسٹ ہاؤس سے ذرا ادھر ایک ہموار لیکن قدرے ریتلے قطعہ زمین پر

کھڑا تھا جس کے قدموں تلے وادیٔ پھنڈر اسی منظر میں تھی جو مجھے کھڑکی کے چوکھٹے میں جڑا نظر آیا تھا..

اور یہاں سے وہ کیسے نظر آتی تھی؟

میں کیسے بیان کروں.. کیونکر توصیف کروں اور حیرانی کی سرحدوں کے پار جا کر اُس کا قصہ کیسے سناؤں..

میں اگرچہ تمنا کرتا ہوں کہ مجھ میں شہر بغداد کے قصہ خوانوں کا کچھ اثر آجائے.. دمشق کے گلی کوچوں میں داستانیں سنانے والوں کی کوئی جھلک آجائے.. اصفہان کے چہل ستون چوک میں شاہنامہ پڑھنے والوں کا کوئی انداز در آئے..

یہ صرف ایک تمنا تھی... جو تکمیل تک پہنچنے کے لائق ہی نہ تھی.. اس لیے یہ منظر مجھ سے بیان نہیں ہو سکتا.. وادیٔ پھنڈر کی ہموار وسعت میں خاموش.. چمکیلا دریائے غذر.. سرسبز کھیتوں کے چوکھٹے.. پاپلر کے پانچ درخت.. اُن کے پتوں میں سے جھانکتا دریا.. پتے جو کبھی کبھار ہلتے تھے اور تصویر کو آوٹ آف فوکس کرتے تھے..

اور اُس دریائے غذر میں وہ درخت.. چند ایک... جو اُس کے پانیوں میں اپنی ہی شکل دیکھتے تھے اور حیران ہوتے تھے.. اُن کے سرسبز عکس دریا پر... ہولے ہولے ہلتے ہوئے.. اور پوری وادی.. بالکل ساکت.. تازہ پینٹ کی ہوئی تصویر.. اور وہ بھی پانیوں میں عکس ہوتی ہوئی..

میں نے ایسے عکس صرف فیری میڈو میں بارشوں اور برفوں کے پانیوں میں ہی دیکھے تھے جن میں نانگا پربت کے سفید انبار اور دامن میں سیاہ جنگل یوں عکس در عکس ہوتے تھے کہ اگر آپ تصویر اُتاریں تو بعد میں یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ عکس کونسا ہے اور اصل چہرہ کونسا ہے..

سلجوق میری جانب آ رہا تھا..

"ابو... یہ وادی تو حشر ہے—" وہ کیمرے کے ویو فائنڈر پر اپنی عینک جما کر اپنے جوگر شوز پر بہت احتیاط سے آہستہ آہستہ گھومتا تھا تاکہ منظر کی تصویر کشی میں جھٹکا نہ لگے... اگرچہ... اگرچہ یہ بعد میں کھلے گا کہ کیسے کیسے جھٹکے لگے..

میرے پاس پھنڈر ریسٹ کے باہر اُتاری ہوئی جتنی بھی تصویریں ہیں...

عینی، سُمیر، سلجوق اور میمونہ کی.. غازی اور اسلم کی، اُن کے عقب میں وادیٔ پھنڈر ہے.. اُس کا بے پناہ حسن اور سرسبز رچاؤ ہے..

دریائے غذر بہت دُوریوں سے بہتا ہوا آرہا ہے جہاں برف کی ریکھائیں ہیں اُن میں سے بہتا ہوا آرہا ہے.. اور اُس کا بہاؤ ایک گمان ہے.. اور وادی بہت وسیع ہے.. ایک جانب سرخ اور مٹیالی چٹانیں ہیں ایک بلند فصیل کی صورت اور اُن کے دامن میں کھیت ہیں.. ایک دو مکان ہیں.. باغ ہیں.. برفوں کا پانی ہے تالابوں کی صورت میں... اور دریا میں درختوں کے عکس ساکت ہیں.. اور اک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی یہ عکس دروازے کھل جاتے ہیں اور ان کے پیچھے پانی چمکنے لگتے ہیں..

ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے اب بھی یقین نہیں آتا کہ یہ پس منظر واقعی موجود تھا.. یہی لگتا ہے کہ یہ لوگ.. میرے بچے، بیگم اور ڈرائیور... ایک کیلنڈر کی سینری کے سامنے کھڑے ہو کر فوٹو اُتروا رہے ہیں.. جیسے کسی زمانے میں میو ہسپتال روڈ پر "تاج محل" اور دیگر "سینریوں" کے آگے بیٹھ کر ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر میں نے بھی ایک "فوٹو" کھنچوائی تھی.. اس ڈبہ کیمرے کو گھورتے ہوئے جس کی دوسری جانب فوٹو گرافر صاحب... ایک سیاہ سرنگ نما کپڑے میں سر گھسیڑے ہاتھ سے "ریڈی" کا اشارہ کرتے تھے.. اور پھر بہت دیر تک فلم پیپر کو ایک مستطیل سفید طشتری میں کسی محلول میں ڈبوتے اور نہلاتے تھے اور پھر دھیرے دھیرے فلم پیپر پر ایک ایسی "فوٹو" اُبھرتی تھی جو بہت غور کرنے پر بھی یہ خبر نہیں دیتی تھی کہ یہ کس کی ہے.. البتہ پس منظر کی سینری پہچانی جاتی تھی.. خاص طور پر سرو کے درخت اور ایک فوارہ..

ویسے ہی.. پھنڈر کی وادی کا ایک منقش پردہ کسی دیوار سے لٹکا ہوا تھا جس کے سامنے کھڑے ہو کر سب لوگ باری باری فوٹو اُتروا رہے تھے..

"ابو یہ تو واقعی حشر ہے...." سلجوق نے ویو فائنڈر سے آنکھ ہٹا کر پھر کہا..

"حشر نہیں.. غذر ہے.. اور دریائے غذر ہے"

ریسٹ ہاؤس کی کھڑکیوں میں جرابیں لٹکاتی میمونہ کی آواز مجھ تک آئی "چوکیدار کہہ رہا ہے کہ ناشتہ تیار ہے.. آجائیں"

لیکن پھنڈر ریسٹ ہاؤس سے نظارہ یک طرفہ نہ تھا.. دو طرفہ تھا..

شمال کی جانب جدھر میرے کمرے کی کھڑکی تھی اُدھر تو وادیٔ پھنڈر کا منقش پردہ کھنچا تھا لیکن جنوب میں جدھر سے ہم آئے تھے ریسٹ ہاؤس کی پشت پر ایک اور منظر تھا جس کی جانب ہم نے نگاہ نہ کی تھی... ڈھلوان پر درخت اُترتے جاتے تھے یہاں تک کہ ایک وسیع شیشہ جھیل سے اُن کے اپنے عکس سے جا ٹکراتے تھے.. یہ جھیل بے حد خاموش اور خوش شکل تھی.. اس کے کناروں پر ایک خشک بلندی تھی اور اس کے پار... جدھر سے ہم آئے تھے ایک نیلے پہاڑوں میں گھری ہوئی سرسبز وادی تھی جس کے اندر پھنڈر کا وہ بازار تھا جس میں سے گزر کر ہم کل شب یہاں پہنچے تھے..

جھیل کنارے ایک کچی روڈ کبھی دکھائی دیتی تھی اور کبھی سویر کی ہلکی دُھند میں گم ہوتی تھی..

اس پر جھکی کوہستانی بلندی جھیل کے ٹھہراؤ میں اپنی شکل دیکھتی تھی..

بے شمار درخت تھے جو اس میں اپنی سبز شباہت دیکھ کر حیران ہوتے تھے..

یہ جھیل کچھ بے توقیر اس لیے بھی ہوئی کہ دریائے غذر والے منظر سے کوئی آنکھ ہٹائے تو اِدھر دیکھے...

ریسٹ ہاؤس کی سفید کھڑکیوں میں دھلی ہوئی جرابیں لٹکاتی میمونہ کی ایک بہت ہی ناراض آواز آئی "چوکیدار کہہ رہا ہے ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے.. آپ نے آنا ہے کہ نہیں؟"

"مغل منی ایچر تصویر اور کافر سلور ٹراؤٹ"

ناشتے کے بعد ہم ریسٹ ہاؤس سے نیچے اُترے..

درّہ شندور کی جانب نہیں.. دریائے غذر کے منقش پردے کی طرف نہیں بلکہ واپس اُسی روڈ پر جہاں سے ہم شب کی سیاہی میں بلند ہو کر ریسٹ ہاؤس میں پہنچے تھے.. جدھر وہ شیشہ جھیل تھی..

اُس شیشہ جھیل کی جادوگری میں جو سکوت تھا ہم اُس میں بہت احتیاط سے اُترے.. اُس کی شیشہ یکتائی میں ہم تنہا تھے...

میں اپنے عجز کا اظہار کر چکا ہوں..

لیکن... اگر مجھے ایک سنگین کی نوک پر مجبور کیا جائے کہ میں وادی پھنڈر کے بارے میں کچھ تو کہوں.. اگر نہ کہوں تو میرے سینے کے اندر یہ سنگین پیوست ہو جائے گی تو میں صرف یہ کہوں گا کہ.... عکس در عکس۔

اور کون ہے آئینوں میں.. بس تُو ہی تُو ہے

صادقین نے جب میری پہلی کتاب "نکلے تری تلاش میں" کو مصور کیا تو اس کے سرورق کے لیے ایک ڈرائنگ بورڈ پر کیکٹس اور کانٹوں کے جنگل میں حسن کا ایک پیکر بنایا.. بورڈ کی پشت پر انہوں نے خصوصی طور پر ایک رباعی لکھی... اور کون ہے آئینوں میں.. بس تُو ہی تُو ہے..

تو یہی وادی پھنڈر تھی..

دریائے غذر کے پرسکون پانی ریسٹ ہاؤس کی پہاڑی کے دامن میں پھیلے تو یہ شیشہ جھیل وجود میں آئی.. یہاں اس کے کناروں پر جتنے بھی پاپلر تھے، سرو تھے،

خوبانیوں اور آلوچوں کے جتنے درخت تھے وہ اُس کے پانیوں میں... اور کون ہے آئینوں میں، بس تو ہی تو ہے.. کی تصویر ہوتے تھے اور یوں ہوتے تھے کہ نہ پتہ چلتا تھا کہ ہم ان کے کناروں پر ہیں اور نہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم ان کے اندر ہیں۔

ہم اُس سویر گلگت سے دو دن کی مسافت پر... خلطی جھیل کے ڈوبے ہوئے چولہوں سے کہیں آگے.. جب پھنڈر جھیل کے کناروں پر چلتے تھے تو ہم سے.. راستہ دیکھا نہ جاتا تھا.. ہم احتیاط سے چلتے تھے کہ کناروں اور پانی میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا.. ہم ایک قدم گھاس کناروں پر رکھتے تھے اور دوسرا قدم بھی اپنے تئیں گھاس کناروں پر رکھتے تھے لیکن عکس در عکس فریب کے باعث اُس جھیل کے پانیوں میں رکھ دیتے تھے..

اور جب ہمارا قدم پانیوں میں پڑتا تھا... صرف تب ہمیں احساس ہوتا تھا کہ غلطی ہو گئی ہے.. اس لیے کہ گھاس کی بجائے پانیوں میں قدم رکھتے ہیں... عکس لہروں میں بدل کر اُس ساکت تصویر کو باطل کر دیتا تھا..

"ابو.. اِدھر کوئی مچھلی نہیں ہے—" سمیر نے فشنگ روڈ کی ڈوری کو شائد پچاسویں بار جھیل پھنڈر کے پانیوں میں پھینکا اور راڈ کی گراری گھماتا ہوا بولا..

جھیل پھنڈر کے پانی کس رنگ کے تھے... نیالے، سبز یا نیلگوں تھے.. یہ ہم نہیں جانتے تھے کہ.. اُس کے کناروں پر جھکے جتنے گل بوٹے اور درخت تھے، بھوری بلندیاں اور برف ریکھائیں تھیں وہ سب کی سب.. جوں کی توں... اُس کے پانیوں پر فوٹو سٹیٹ ہوتی تھیں۔

یہ ایک صابر جھیل تھی..

اپنی شناخت اور اپنے آپ کو یکسر فراموش کر کے صرف اپنے چار چفیرے کو اپنے اندر سموتی تھی اور اُس کی تصویر دکھاتی تھی..

"ابو لوگ کہتے تھے کہ پھنڈر جھیل میں اتنی مچھلیاں ہیں کہ اُچھل اُچھل کر کناروں پر گرتی ہیں.. جھوٹ کہتے تھے.. اِدھر کوئی مچھلی نہیں.." سمیر نے ایک مرتبہ پھر ڈوری پانیوں کی جانب اُچھالی "میرا خیال ہے اُدھر چلتے ہیں جدھر دریائے غذر بہتا ہے.. ریسٹ ہاؤس کی دوسری جانب... شائد دریا میں کوئی مچھلی ہو..."

"یہ بھی تو اسی دریا کے پانی ہیں—" میں نے کہا..

"صحیح... لیکن ادھر پانی پھیل چکے ہیں... اُدھر کناروں کے اندر ہیں تو وہاں زیادہ چانس ہے—"

"ٹھہر کے چلیں گے.. اُدھر بھی چلیں گے"

ہماری ایک جیپ اصحاب کہف کے وفادار کتے کی طرح جدھر ہم جاتے تھے اُدھر ہمارے پیچھے پیچھے آتی تھی اور ہمیں ڈسٹرب کرتی تھی.. ڈرائیور غازی تھا.. میں نے اس سے گزارش بھی کی تھی کہ اے مرد غازی ہمارا پیچھا کرنا چھوڑ دے، ہم وادی پھنڈر میں بھٹکتے ہوئے آہو ہونا چاہتے ہیں اور ایک آہو تو جیپ کی آواز سے ٹھٹکتا ہے کہ کہیں اس میں میرے شکار کے سامان نہ ہوں.. اس لیے تو ریسٹ ہاؤس میں جا کر آرام کر ہمارا پیچھا نہ کر.. لیکن اُس کا کہنا تھا کہ صاحب ہمارا ڈیوٹی لگا ہے کہ آپ کے ساتھ رہو، ہم اپنا ڈیوٹی کرتا ہے.. دراصل غازی ہمہ وقت پُر تفریح انداز میں ریش سہلاتا ایک تماشائی کی طرح ہمارا تھیٹر دیکھتا تھا... جھیل پھنڈر کی عکس در عکس سٹیج کے پس منظر میں ہم پانچوں اداکاروں کی پر فارمنس نہایت اشتیاق سے دیکھتا تھا..

اور وہ دیکھتا تھا کہ...

ایک بیگم صاحبہ ہیں جو صاحب کو زیادہ گھاس نہیں ڈالتیں اور اس سٹیج پر سب سے پُر اثر، نمایاں اور زبردست کردار ہیں اور سرگم کا پانچواں سُر ہیں، جس کے بعد کوئی اور سُر نہیں لگ سکتا..

اُن کی ایک بیٹی ہے جو لاڈو رانی ہے اور اپنے دونوں بڑے بھائیوں پر حکم چلاتی ہے اور اپنی من مرضی منواتی ہے..

اور جو بیٹے ہیں اُن کے کردار اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے کہ یہ کیا ہیں... کبھی وہ کانوں پر ہیڈ فون لگا کر جھومتے تھے.. اور کبھی فشنگ راڈ کی ڈوری جھیل کے اس عکس میں پھینکتے تھے جس میں درخت، چٹانیں، ہریاول اور برفیں ٹھہرے ہوئے تھے اور یہ ڈوری جب اُن کے درمیان ایک باریک تلوار کی طرح گرتی تھی تو وہ درخت کٹتے تھے، چٹانیں لرزتی تھیں، برفیں تیرنے لگتی تھیں اور ہریاول جھلملانے لگتی تھی.. اور کبھی وہ اپنے باپ کی کمر پر دھپ رسید کر کے "ہیلو ڈیڈ.." کہتے تھے اور

ایسے فری ہوتے تھے جیسے وہ اُن کا کالج فیلو ہو... اور اُن کی پھٹی ہوئی جینیں اور پھیکی پڑتی ٹی شرٹوں اور بدحال جوگرز کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ صاحب کا ہاتھ ذرا تنگ ہے اس لیے بیٹوں کو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں پہنا سکتا...

اور جو صاحب تھا... وہ قطعی طور پر ایسا صاحب نہ تھا جس کے لیے اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے ایک جنرل صاحب نے اتنا تردد کیا تھا.. وہ یا تو ہمہ وقت "غازی آہستہ چلو" کی درخواست گزارتا تھا اور یا اپنے خاندان سے الگ ہو کر ذرا دور جا کر جھیل پھنڈر کے کنارے منہ اٹھائے اُسے تکتا رہتا تھا اور بیوقوفوں کی طرح خود ہی مسکراتا رہتا تھا..

چنانچہ غازی کے لیے ہم سب ایک مفت کا تھیٹر تھے جسے وہ بھرپور انداز میں انجائے کرتا رہتا تھا..

اور اسلم کہاں تھا؟.. وہ ہمارا پیچھا کیوں نہیں کر رہا تھا؟

کل دوپہر، جھیل خلطی سے ذرا پہلے.. جب ہم ایک باغ کی قربت میں اپنی فلاسک میں سے چائے کے چند گھونٹ بھرنے کے لیے رُکے تھے.. اسلم نے رُکتے، جھجکتے مجھ سے کہا "صاحب.. وہ وہ.. میری جیپ بہن... معاف کرنا سر سر.. جیپ میں گڑبڑ ہے.. کل کل کلچ فری ہو جاتا ہے.. اور ب ب بریک بھی نہیں لگتی تو.."

"یہ کب ہوا؟" میں بہت ہراساں ہوا..

"یہ تو گوپس سے چلتے ہی ہو گیا تھا.. اور میں نے آپ کو اس لیے نہ بتایا کہ آپ فکر کریں گے.. گے.."

"اب کیا ہو گا؟"

"پھنڈر چل کر ٹھیک کر لوں گا.."

"تو پھر سلجوق اور سمیر غازی کی جیپ میں بیٹھیں گے اور میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں"

"نہ جی—" اُس نے اعتماد سے سر ہلایا "آپ ف ف فکر نہ کریں.. میں لے جاؤں گا... چھوٹے صاحبوں کے ساتھ گپ شپ رہتی ہے.."

"لیکن اسلم..."

"نہ جی... میں مک مک میکینک بھی ہوں.. مجھ پر بھروسہ کریں"

ظاہر ہے اس اطلاع کے بعد میں سارا راستہ اپنے بیک مرر پر نظریں جمائے پیچھے آتی جیپ کو دیکھتا رہا.. کسی موڑ پر وہ لمحہ بھر کے لیے اوجھل ہوتی تو میرا دل رُکا رہتا جب تک وہ نمودار نہ ہو جاتی... پھنڈر ریسٹ ہاؤس پہنچتے ہی اسلم نے ایک لالٹین روشن کی اور جیپ کے نیچے گھس گیا... آج صبح اٹھ کر دیکھا تو ریسٹ ہاؤس کے سامنے اسلم کی جیپ کے سپیئر پارٹس اس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے بلال گنج لاہور میں چوری شدہ کاروں کے کل پرزے فروخت ہو رہے ہوتے ہیں.. صرف ڈھانچہ کھڑا تھا اور جیپ کا پورا اندرونی نظام باہر آچکا تھا....

"اسلم... یار تم پرسوں صبح تک اسے... جوڑ لوگے... درجنوں کے حساب سے کل پرزے ہیں... تمہیں یاد ہے کہ کونسا پرزہ کہاں فٹ کرنا ہے؟"

"آپ پرزہ.. اُٹھائیں تو میں بتاتا ہوں کہ کہاں فٹ کرنا ہے.. فکر نہ کریں"

مجھے یاد ہے جب بہت برس پہلے "نکلے تری تلاش میں" کے زمانے میں میرے دوست ناصر، مظہر اور صدیق ایک فوکس واگن کے بوسیدہ ڈبے میں میرا پیچھا کرتے ہوئے بائی روڈ لندن پہنچ گئے تھے اور وہاں پہنچتے ہی ناصر نے اس ڈبے کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا اور اُس کے پرزے، انجن، بیٹری، مڈگارڈ، نشستیں، تاریں وغیرہ کوئی نصف کلومیٹر کے علاقے میں بکھرے پڑے تھے اور ماڈرن آرٹ کا نظارہ دے رہے تھے تو صدیق نے دوہائی دی تھی "اوئے ناصر یہ تارڑ تو ویسے بھی پیدل واپس جائے گا اور میرے پاس تو پاکستان واپسی کے لیے بائی ایئر کا کرایہ بھی نہیں یہ سینکڑوں پرزے تم کیسے دوبارہ اسمبل کروگے؟" ناصر نے لاپروائی سے کہا تھا "اوئے جوڑ لوں گا" اس پر صدیق نے نہایت ہتک آمیز لہجے میں کہا تھا "تم صاحب آدمی ہو۔ ہنری ہشتم اور لوئی ہم کے زمانوں کا پیریڈ فرنیچر تو بنا سکتے ہو.. اس فوکس واگن کو دوبارہ نہیں بنا سکتے" لیکن ناصر نے اسی انجر پنجر کو صرف ایک ہفتے میں جوڑ جاڑ کر سٹارٹ کر لیا تھا اور وہ تینوں بخیر و خوبی اُس پر سوار پاکستان واپس پہنچ گئے تھے.. اگر وہ ایسا نہ کر سکتا تو کسی نزدیکی ورکشاپ میں جا سکتا تھا لیکن اسلم کی جیپ کے ریزے اگر نہیں جڑتے تھے تو یہاں سے دو دن کی مسافت پر گلگت تھا اور تین روز کے فاصلے پر چترال تھا.. درمیان میں ابھی کسی

ورکشاپ کا رواج نہیں ہوا تھا.. بہر حال اسلم نے کہا تھا کہ میں ٹک مکینک ہوں تو کل صبح تک پتہ چل جائے گا کہ وہ کتنا ٹک مکینک ہے..

چنانچہ اسی لیے صرف غازی تھا جو ہمارے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا..

سمیر نے بالآخر ہمت ہار دی اور فشنگ راڈ کی ڈوری لپیٹنے لگا "ابو یہاں ہرگز کوئی مچھلی نہیں ہے.. ٹورازم والوں کے کتابچے جھوٹ بولتے ہیں کہ پھنڈر لیک از فل آف ٹراؤٹ.. ریسٹ ہاؤس کی دوسری جانب وادی میں چلتے ہیں شائد وہاں کچھ مل جائے"

ہم اپنی پکنک باسکٹ، جیکٹیں اور سویٹر وغیرہ اُٹھا کر اوپر ریسٹ ہاؤس کو جانے والی سڑک پر چڑھنے لگے.. اور ہم چڑھتے دو چار قدم تھے اور رُکتے بار بار تھے.. اس مرحلے پر غازی کا تعاقب کام آیا۔ وہ جیپ برابر میں لے آیا "صاحب بیٹھ جاؤ اوپر چلے گا ناں؟"

"صاحب بالکل بیٹھے گا اور اوپر جائے گا" اور ہم سب زقندیں بھرتے ہوئے جیپ میں سوار ہو گئے۔

ریسٹ ہاؤس کے سامنے ابھی تک بلال گنج کی مارکٹ کھلی تھی اور اسلم جیپ کے نیچے موبل آئل اور کیچڑ سے منہ کالا کیے ایک کیکڑے کی طرح اپنا ہاتھ باہر نکالتا تھا اور ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار اُسے کبھی کوئی پیچ کس اور کبھی کوئی پرزہ تھماتا تھا اور ہمیں دیکھ کر ہنس کر کہتا تھا "صاحب.. انشاءاللہ آپ کا یہ جیپ کا ڈھانچہ ادھر ریسٹ ہاؤس میں یونہی پڑا رہے گا اور دور دور سے ٹورسٹ لوگ اسے دیکھنے آئے گا... یہ فوجی لوگ پاگل لوگ ہوتا ہے.. کیسے جوڑ لے گا.."

اب ہم ریسٹ ہاؤس کی دوسری جانب اُس تصویر میں اُترنے لگے جو ہمارے کمرے کی کھڑکی میں سے نظر آتی تھی.. اصل وادی یہی تھی..

وادی پھنڈر کو "لعل کشمیر" بھی کہا جاتا ہے..

کیونکہ یہ وادی بہت ہی مختصر ہے.. بہت ہی مختصر ہے... بہت ہی لعل ہے.. ایک ایسی مغل منی ایچر تصویر جو ایک ناخن کے سائز کے ہاتھی دانت پر نقش ہے.. اس کے سامنے اگر صادقین کا پینٹ کیا ہوا منگلا ڈیم بجلی گھر کا عظیم الشان اور بلند میورل بھی

آ جائے.. ایک ایسا میورل جسے دیکھتے ہوئے یقین نہیں آتا کہ ایک منحنی سے ٹیڑھی میڑھی اُنگلیوں والے ایک انسان نے اِسے بنایا ہے اور اُس کی مدد کے لیے جنوں کی کوئی فوج نہیں اُتری تھی.. تو اُس عظیم میورل کی کائنات پر اگر ایک منی ایچر تصویر رکھ دی جائے، ڈاک کے ٹکٹ سے بھی مختصر ایک تصویر کو چسپاں کر دیا جائے تو وہ نظر بھی نہیں آئے گی.. اور اس کے باوجود یہ مختصر تصویر اپنے رنگوں، نقاشی اور تخلیق کی باریکیوں میں اتنی مکمل ہو گی کہ وہ ہرگز اُس میورل سے کمتر نہ ہو گی..

میرے پاس اُستاد آفتاب احمد مرحوم کی بنائی ہوئی ہاتھی دانت کے ایک ناخن برابر ٹکڑے پر پینٹ کی ہوئی ایک مختصر تصویر ایسی ہے جس پر شاہ جہاں کی شبیہ ہے۔ شاہ جہاں کے گلے میں جو موتیوں کی مالا ہے اُس کا ایک ایک موتی الگ الگ ہے اور گنا جاسکتا ہے.. اُس کی بل دار مونچھوں کا ایک ایک بال اپنی راجپوتی شان میں نمایاں نظر آتا ہے اور اُس کی آنکھوں میں ممتاز محل کی محبت کی چمک سے تاج محل بنتے ہیں.. ایک ناخن بھر کی منی ایچر تصویر میں..

کچھ ایسے ہی... وادیٔ پھنڈر کی مختصر تصویر میں.. ہر درخت، ہر کھیت اور اُس کا ایک ایک بوٹا، دریائے غذر کے پانیوں کا ایک ایک قطرہ، راستوں کی دھول کا ہر ذرہ.. الگ الگ دکھائی دیتا تھا..

صادقین کے عظیم الشان میورل کی مانند پاکستان کے شمال میں بہت سی شاندار وادیاں ہیں.. ہنزہ، نگر، بروغل، کرومبر، کاغان... بہت سی وادیاں ہیں جو بہت گرینڈ، بہت رعب والی ہیں..

لیکن ایک ناخن بھر کی منی ایچر وادی ایک ہی ہے... پھنڈر!

ہم دریائے غذر کے گھاس بھرے کنارے پر بیٹھے تھے..

میمونہ اور عینی پانی کے قریب چادر بچھائے اطمینان سے لڈو کھیل رہی تھیں.. ایسے اطمینان سے جیسے وہ 22-جے گلبرگ لاہور میں اپنے ڈرائنگ روم میں براجمان ہیں..

اور دریائے غذر ایک چوڑی نہر کی طرح اپنے کناروں میں رہتا، چمکتا.. ایک پُر سکون بہاؤ میں بہہ رہا تھا اور بہت غور کرنے پر معلوم ہوتا تھا کہ یہ حرکت میں ہے

ورنہ وہ ایک نیلگوں چادر لگتا تھا جو ہمارے آگے بچھی ہوئی تھی اور اُس پر درختوں اور پہاڑوں کے پرنٹ چھاپے ہوئے تھے...

دریا کے دوسرے کنارے پر بھی درخت بلند ہوتے تھے... پرے کھیت بچھے تھے اور دو چار جھونپڑے تھے اور اُن کے اوپر ایک خشک بلندی تھی جو بلند ہوتی چلی جاتی تھی یہاں تک کہ آسمان کا گنبدِ مینائی اُسے روک کر کہتا تھا، کدھر جاتی ہو؟..

سلجوق ہم سے الگ گھاس پر بیٹھا گھٹنوں کے گرد ہاتھ قوس کیے ایک نیلی ٹی شرٹ اور جین میں، عینک کے شیشوں کے عقب میں اپنی پُرکشش نیلی آنکھیں پوشیدہ کیے.. سامنے دیکھتا جا رہا تھا.. اور میں نہیں جانتا تھا کہ اُس کے دل میں کیا ہے.. وہ اس لمحے وادیٔ پھنڈر میں دریائے غذر کے کنارے اپنے آپ میں گم بیٹھا کیا سوچتا ہے، کس کے بارے میں سوچتا ہے... جیسے بہت زمانے پہلے میں بھی اسی انداز میں بیٹھا سامنے دیکھتا رہتا تھا اور میرے والدین نہیں جانتے تھے کہ میں کیا سوچتا ہوں.. اور اگر وہ جان جاتے تو بے حد شاکڈ ہوتے... شائد سلجوق کی سوچیں بھی ایسی تھیں کہ اگر میں اُنہیں جان جاتا تو مجھے متعدد دھچکے لگتے..

لیکن میں کیوں جان جاتا....

ہر نسل کا حق ہے کہ وہ اپنی سوچیں بزرگوں سے مخفی رکھے کہ بزرگ اُن سوچوں کی تاب نہیں لا سکتے.. اُن کا ادراک نہیں رکھتے... نہیں رکھ سکتے کہ اُن کی مٹی مختلف ہوتی ہے، وہ کسی اور بھٹی میں پکے ہوتے ہیں... ہر نسل اپنی بھٹی میں اپنی آگ اور اپنے تجربوں میں پکتی ہے اور وہ اپنے تجربے اپنے نتائج کو آئندہ نسل پر لاگو نہیں کر سکتی... اور اسی کو ارتقا کہتے ہیں۔

سُمیر یہاں بھی بار بار فشنگ راڈ کی ڈوری گراری میں سمیٹ کر اُسے دریائے غذر کے پانیوں میں پھینکتا تھا... اور وہ ایک الگ بھٹی میں پکا ہوا بچہ تھا..

ہم سب یہ سمجھتے تھے کہ وہ ایک سعیٔ لاحاصل میں مصروف ہے، وقت کا زیاں کر رہا ہے.. پچھلے دو گھنٹوں سے ڈوری لپیٹتا ہے اور پھر اُسے وادیٔ پھنڈر کی مختصر تصویر میں بہتے دریا میں پھینکتا ہے اور اُسے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور اس کے باوجود وہ ہمت نہیں ہارتا.. تو اسی کو ارتقاء کہتے ہیں۔

ہم چاروں تو بدھ بھکشوؤں کی طرح آلتی پالتی مارے.. بیٹھے تھے اور نُمیر ہمت نہ ہارتا تھا اور اُس مچھلی کی آس کرتا تھا جو اُس کے نصیب میں تھی.. یا نہیں تھی..

وادیٔ کاغان میں ناران کے قصبے سے پرے درّہ بابوسر کی جانب جہاں دریائے کُنہار ایک وسیع خطّے میں پھیل کر ایک ایسی خوشنمائی اختیار کرتا ہے کہ انسان ششدر رہ جاتا ہے، وہاں ایک مقام ہے جسے "سوچ" کہتے ہیں.. وہاں جب نُمیر نے ایک بڑے سائز کی سلور ٹراؤٹ پکڑی تھی تو ہمارے ہمراہ جو کاغانی بزرگ تھے اُنہوں نے کہا تھا "صاحب، سارا مچھلی مسلمان ہوتا ہے.. اور جب اُن میں سے کوئی ایک کافر ہو جاتا ہے تو اُس کی موت آجاتی ہے اور وہ شکار ہو جاتا ہے.. مومن مچھلی کبھی شکاری کے ہاتھ نہیں آتا.."

دریائے غذر میں جتنی بھی مچھلیاں تیرتی تھیں وہ سب کی سب یقیناً بنیاد پرست مسلمان تھیں اور اسی لیے نُمیر کی پھینکی ہوئی کُنڈی کا شکار نہ ہوتی تھیں..

پھر شائد... وادیٔ پھنڈر کی مختصر تصویر میں دریائے غذر کے بہاؤ کے اندر کوئی ایک مچھلی ایسی تھی جس نے شائد برٹرینڈ رسل کے مضمون "میں ایک عیسائی کیوں نہیں ہوں" کا مطالعہ کر لیا تھا اور تشکیک کا شکار ہو گئی تھی، کافر ہو گئی تھی۔

اور اس مچھلی نے تشکیک کی اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اُس کانٹے کو حلق میں نگل کر خودکشی کر لی جو نُمیر کی ڈوری سے بندھا ہوا تھا..

دریائے غذر کی ساکت نیلگوں چادر پر شکنیں اُبھریں، وہ کروٹیں لینے لگی اور پھر اُن میں ایک بیتاب تڑپ کے آثار چھینٹے اُڑانے لگے... نُمیر کو اپنی انگلیوں پر کھچاؤ محسوس کیا تو جیسے اُسے کرنٹ نے چھو لیا ہو اور وہ تیزی سے راڈ کی گراری گھماتا ہوا ڈوری کھینچنے لگا... اور جب ڈوری پانی سے باہر آئی تو اُس کے سرے پر وہی لامذہب اور کافر مچھلی پھڑکتی چلی جاتی تھی... چاندی رنگ کی درمیانے سائز کی ایک لشکتی ہوئی ٹراؤٹ...

"ابو..." نُمیر نے نعرہ لگایا "مچھلی ابو"

ہم نے اُس مچھلی کی تڑپ پھڑک دیکھی.. اُس کافر مچھلی کی کافر سامانیاں دیکھتے تھے کہ ایک لمحے میں وہ ساکت ہو گئی... اور ہمیں اُس کے جانے کا افسوس ہوا.. ہم

سوگوار ہوئے کہ ہم نے قدرت کے ایک بلور ماسٹر پیس کو صرف اپنی تفریح کی خاطر موت سے ہمکنار کر دیا.. دریائے غذر کے پانیوں میں ابھی چند لمحے پیشتر وہ ایک چاندی کے تیر کی طرح تیرتی چلی جاتی تھی اور اب کنارے پر مُردہ پڑی تھی.. ہم سوگوار ہوئے...

اور اُس لمحے شندور روڈ سے دردانہ شاہ اُترتا دکھائی دیا..

وہ قریب آیا تو درمیانی عمر کا ایک دردانہ شاہ تھا..

"صاحب آپ کے پاس اِدھر مچھلی پکڑنے کا پرمٹ ہے؟" اُس نے نہائت سرکاری لہجے میں دریافت کیا۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں؟" اُس نے نہائت حیرت کا اظہار کیا۔ ایسے جیسے کوئی دلیپ کمار سے پوچھ لے کہ آپ کون ہیں "میں دردانہ شاہ ہوں" اُس نے جیکٹ کی جیب میں سے ایک بوسیدہ اور مخدوش سی نوٹ بک برآمد کی "اِدھر مچھلی کا شکار کے لیے پرمٹ ہوتا ہے... بیس روپے... ہم محکمہ سے آیا ہے"

"کونسے محکمہ سے؟"

وہ پھر بہت ششدر ہوا کہ یہ نادان نہیں جانتے کہ کونسا محکمہ.. اُس نے اپنی جیکٹ میں سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکال کر ہمارے سامنے گھاس پر رکھ دیا "یہ محکمہ..."

اور ہم نہیں جان سکتے تھے کہ اُن کاغذوں میں سے کونسے کاغذ پر کونسا محکمہ درج ہے.. لیکن وہ کوئی بہروپیانہ تھا.. ایک مقامی شخص تھا جو فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد اب وادیٔ پھنڈر میں دن بھر گشت کرتا تھا اور فشنگ پرمٹ جاری کرتا تھا.. ہم نے نہائت فراخ دلی سے بیس روپے ادا کیے، پرمٹ حاصل کیا اور سراسر قانونی ہو گئے..

دردانہ شاہ پرمٹ جاری کرنے کے بعد گیا نہیں وہیں ہمارے برابر میں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا اور ڈیوٹی سے فارغ ہو گیا "آپ جانتا ہے کہ اس وادی کا جو میدان ہے جس میں دریائے غذر بہتا ہے اسے بازکا میدان کہتے ہیں.. یہ کسی زمانے میں راجوں کی ملکیت ہوتا تھا.. اُن کا گھوڑا اِدھر گھاس چرتا تھا.. پھر عوام نے اُن سے چھین لیا.."

"کیسے چھین لیا؟"

"اِدھر ایک بھٹو صاحب آیا وہ بولا کہ ریاست اب ختم ہے، میر اور نواب

لوگ چھٹی کرو اور ملکیت عوام کا ہے تو ہم نے اودھر میدان پر قبضہ کر لیا.. اب ادھر ہم گھوڑا چراتا ہے"

"اور نواب لوگ کدھر ہے؟"

"وہ اسلام آباد میں گھوڑا چراتا ہے.. صاحب ہم نے فوج کا نوکری کیا لیکن اودھر گلگت میں رہا اسلام آباد نہیں گیا.. سنا ہے اُدھر گھوڑوں کے لیے بہت جگہ ہے؟"

"ہاں اُدھر گھوڑوں کا بہت کاروبار ہوتا ہے.. جس کے پاس سوس اکاؤنٹ ہوتا ہے وہ چراگاہ بناتا ہے اور گھوڑا چراتا ہے اور گھوڑا کو چاکلیٹ کھلاتا ہے"..

"گھوڑا تو گھاس کھاتا ہے صاحب—"

"اسلام آباد میں گھوڑا چاکلیٹ کھاتا ہے.."

"صاحب ادھر کتنا مچھلی پکڑا ہے؟"

"ایک—" سمیر نے اپنی سلور ٹراؤٹ کو دُم سے پکڑ کر جھلایا..

"صرف ایک.. تو آپ ایسا کرو کہ ذرا آگے.. شندور کی طرف گلوغ گاؤں میں میرے ساتھ چلو.. اُدھر اتنا مچھلی ہے کہ پانی کم ہے اور مچھلی زیادہ ہے۔"

"چلیں ابو.." سمیر نے فوراً کہا۔

اب صوبیدار دردانہ شاہ ہمارے لیے ایک ایسا پائیڈ پائپر تھا جو اپنا بگل بجاتا ہمارے آگے آگے چلتا تھا اور ہم سر جھکائے نہایت فرمانبرداری سے اُس کے پیچھے پیچھے چلتے تھے.. ہم غازی اور جیپ کو روڈ پر چھوڑ آئے تھے..

ہماری جیپ شندور کو جانے والی روڈ پر زیادہ دیر تک نہ چلی.. ہچکولے ابھی مترنم بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا رکی.. یہ گلوغ تھا..

چند گلیوں میں سے گزرے.. پھر کھیت آئے اور پھر قد آدم گھاس اور پھر ایک ایسا مقام جہاں دُھند کے سفید بالوں میں جکڑے نیلگوں پہاڑوں میں سے ہر گلیشیر میں سے ایک الگ ندی اُترتی تھی اور گلوغ کے قصبے کے برابر میں وہ.. جھاڑیوں اور ریت کے درمیان بہتی چلی جاتی تھی.. پانی کا بے پناہ شور تھا اور شام اُترنے کے انتظار میں چند لمحے ابھی بلندیوں پر قیام کرتی تھی۔

"ادھر مچھلی ہے انکل؟" سمیر نے دردانہ شاہ سے پوچھا اور پھر اپنی جین کے

پائینچے چڑھا کر ایک ندی میں اُتر گیا..

سلجوق منہ اُٹھائے دُھند آلود پہاڑوں میں کچھ تلاش کرنے لگا..

میمونہ اور عینی نے ایک نسبتاً کم گیلا قطعہ زمین تلاش کیا اور لڈو کھیلنے میں محو ہو گئیں..

اور میں...

میں اُس دُھند کا ایک ذرّہ ہوا..

سرد ہوا کا ایک بوسہ ہوا..

مجھے اپنے وجود کی بے ثباتی اور اپنی فنا کا احساس ہوا.. ایسے منظر موجود رہیں گے اور میں ناموجود میں چلا جاؤں گا.. یہ کتنی بڑی زیادتی ہے.. اُس نے جو تخلیق کار ہے ان پتھروں اور پانیوں کو تو دوام دیا اور مجھے.. عارضی کر دیا.. یہ منظر کس کام کے اگر میں انہیں دیکھنے کے لیے نہ ہوں گا.. میں ان کا ایک حصّہ بنوں گا.. دُھند کا ایک ذرّہ ایک بے اختیار تنکا اور ایک سرد بوسہ... اور پھر مجھے کوئی اور دیکھے گا.. شائد اس منظر میں میرے ایسے بھی تھے جو اب دُھندلے ہو چکے تھے..

مجھ میں اب بھی وہ منظر نقش ہے..

ایک بے انت سفید ذرّوں کی دُھند میں درجنوں پانی پہاڑوں سے اتر کر ایک ہموار میدان گلوغ میں آ رہے ہیں۔

اور گلوغ کے معنی ہیں.. جہاں بہت سارا صاف پانی آ رہا ہو۔

اور یہاں بہت سارا پانی... صاف پانی نیچے آ رہا تھا اور سمیر اور غازی اُس میں ڈوریاں ڈالتے تھے...

اور یہاں سرِ شام ایک عجیب منظر تھا..

سرِ شام کیسا نظارہ تھا مرے باغ میں
ترے ساتھ ایک ستارہ تھا مرے باغ میں
ترا بے کنار بہشت جانے کہاں پہ تھا
مگر اس کا ایک کنارا تھا مرے باغ میں

(محمد اظہار الحق)

ایک سرمئی شام دُھند میں ڈھلنے لگی.. کہیں بلند پہاڑوں میں، جن کا کسی نقشے میں ذکر نہیں ملتا، سوائے چند کوہ نوردوں کے اور کوئی نہیں جانتا کہ شندور روڈ پر گلوغ نامی چند چولہوں کی ایک آبادی ہے جس کے کناروں پر.. سر شام اُترتی ندیوں اور دُھند کا ایک عجیب منظر ہوتا ہے..

ہماری جیپ کی پچھلی نشست پر.. دو مچھلیاں تھیں.. اور ہم واپس جا رہے تھے.. گلوغ کی ندیوں میں سے شکار کی ہوئی دو مچھلیاں.. دو کافر مچھلیاں جو اپنی ذاتی سچائی کی جستجو میں کافر قرار پائیں اور شکار ہوئیں..

نیم تاریکی میں پھنڈر وادی کی مختصر تصویر اوجھل ہو رہی تھی اور ایک بلند چٹان پر ہمارا ریسٹ ہاؤس ایک ایسے جادوئی قلعے کی طرح دکھائی دے رہا تھا جو ابھی ابھی وجود میں آیا تھا..

اور اُس کی ایک کھڑکی میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی..

کہیں بلند پہاڑوں میں ایک کارواں سرائے تھی جس میں ایک دیا جلتا تھا..

کون ہے جس نے یہ دیا جلایا ہے؟..

جو یہ جانتا ہے کہ ایک مسافر گلوغ سے واپس آ رہا ہے..

اور وہ دُھند کا ایک ذرہ ہے..

ندیوں کے بہاؤ میں ایک بے اختیار تنکا ہے..

سرد ہوا کا ایک بوسہ ہے..

اور اُس نے اس کارواں سرائے میں صرف ایک شب قیام کرنا ہے اور رخصت ہو جانا ہے.. کہیں بلند پہاڑوں میں ایک کارواں سرائے تھی.. جس میں ایک دیا جلتا تھا۔

"لیل پوری پاگل خانہ اور بکرا نائٹ"

"اسلم—" اگلی سویر میں نے جیپ کے ڈھانچے کی قربت میں بیٹھ کر زمین پر دونوں ہاتھ جما کر ایک ناتواں پہلوان کی طرح بیٹھک لگا کر نیچے جھانکا..

اسلم اوندھا پڑا، موبل آئل اور کالک میں لتھڑا بھوت بنا ہاتھ میں کسی سرجن کی طرح اوزار تھامے جیپ کے پیٹ کو یوں ٹٹولتا تھا جیسے وہ ایک سیزیرن آپریشن کے ذریعے سے اُس میں سے ایک بچہ برآمد کرنا چاہتا ہو..

"اسلم.. یار یہ کل صبح تک جُڑ جائے گی؟"

"جی جی صاحب... میں میک مکینک ہوں.. آپ ٹینک بھی کھول کر رکھ دو تو میں جوڑ لوں گا.. اللہ کے فضل سے.." اُس کا بھوت چہرہ اور اُس میں سے اُس کے لشکتے دانت... اور یہ کہتے ہوئے اُس میں اپنی مکانکی قابلیت یا قدرت کا تکبّر نہ تھا، صرف ایک اطلاع تھی کہ میں یہ کر سکتا ہوں۔

"تم نے ناشتہ کر لیا ہے؟"

"ٹیم ضائع ہوتا ہے صاحب.. اسے جوڑ کر اکٹھا روٹی پانی کریں گے.. آپ ذرا پرے ہو جائیں.. اِدھر اُدھر تیل گرنے والا ہے—"

میں ذرا پرے ہو گیا..

میمونہ نے پھر دھوبی گھاٹ شروع کر رکھا تھا اور دو کھڑکیوں میں ٹی شرٹیں اور بنیانیں سوکھنے کے لیے پھیلا رہی تھی..

غازی ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کے کوارٹر میں چائے پینے کے لیے چلا گیا تھا..

بچہ لوگ آج بھی سویرے سویرے بیدار ہو کر وادیٔ پھنڈر کی تصویر دیکھنے

کے لیے ذرا پرے ایک ٹیلے پر کھڑے اس کے نظارے میں محو تھے اور آپس میں چہلیں کر رہے تھے.. ہمیں ابھی تک اس تصویر کے حُسن بلاخیز کی عادت نہیں ہوئی تھی۔ ہر بار اُدھر دیکھنے سے ایک دھچکا سا لگتا تھا۔ کہ ہیں.. یہ یہاں ہے.. یہ کیا ہے.. بہت کم منظروں میں یہ خصلت ہوتی ہے۔

اور بہت کم شکلوں میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ آپ اُنہیں ان گنت موسموں میں سینکڑوں بار دیکھ چکے ہوتے ہیں... یا ابھی دیکھتے ہیں، اور چند لمحوں کے بعد پھر پلٹ کر دیکھتے ہیں تو ایک دھچکا سا لگتا ہے کہ یہ کیا ہے.. اُن کے حُسنِ بلاخیز کی بھی عادت نہیں ہوتی..

فیئری میڈو پر اُمڈی ہوئی نانگا پربت کی برف زار سلطنت کی سفیدی بھی ایسی ہے کہ ہمہ وقت یہی خدشہ رہتا ہے کہ یہ ابھی جنگل پر گرے گی.. آپ اُسے تکتے رہتے ہیں اور پھر پلٹ کر اپنے ساتھی سے پوچھتے ہیں کہ کیا وقت ہوا ہے.. وہ وقت بتاتا ہے اور آپ دو چار لمحوں کے بعد دوبارہ اُدھر دیکھتے ہیں تو پھر دھچکا لگتا ہے کہ ہیں.. یہ یہاں ہے.. یہ کیا ہے..

ریسٹ ہاؤس سے وادی پھنڈر بھی ایسی ہی تھی.. اس کی عادت نہیں ہوتی تھی..

پھنڈر کے گاؤں کی جانب سے ہانپتا ہوا ایک ریوڑ اوپر آ رہا تھا..

اُن کے سانس اُکھڑے ہوئے تھے اور اُن کی شلواریں تیز ہوا میں پھڑپھڑاتی تھیں..

وہ ایک ریوڑ کی بے قاعدگی سے ہی اوپر آئے.. چوکیدار نے پرسوں شب مجھے بتایا تھا کہ کچھ اور مہمان بھی ادھر بسیرا کر رہے ہیں اور وہ آپ کی آمد سے خوش نہیں ہوئے کیونکہ اُنہیں وہ کمرے خالی کرنے پڑے تھے جو آپ کے لیے بک ہو چکے تھے.. اب وہ ڈائننگ روم میں فروکش تھے... یہ وہی مہمان تھے..

اُن میں سے ایک قدرے صحت مند بلکہ فربہی کی قربت میں نوجوان ہجوم سے الگ ہو کر میرے پاس آیا "آپ یہاں بھی پہنچ گئے ــــ" وہ خوش دلی سے بولا۔

"جی ــ" میں نے صرف اتنا کہا۔

"میرا ایک دوست ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ یہ بندہ جو تارڑ ہے بس سُن سنا کر قصّے

لکھ دیتا ہے ورنہ اپنی سٹڈی میں سے آج تک باہر نہیں نکلا" وہ ہنسنے لگا۔

"میں اب بھی اپنی سٹڈی میں ہوں ــــ" میں نے بھی ہنس کر کہا "آپ سے قصّے سنوں گا اور واپس جا کر کتاب لکھ دوں گا"

مجھے گلگت سے پرے غل مت کے سلائڈنگ ایریا کا وہ مقام یاد آیا جہاں ایک سیلابی ریلے نے پتھروں اور کیچڑ کو دھکیل کر قراقرم روڈ کو بلاک کر دیا تھا اور اُسے عبور کرنے کی احمقانہ کوشش میں میری سفید سوزوکی اُس کیچڑ میں پہیے گھماتی اُس میں آہستہ آہستہ دھنس رہی تھی، دفن ہو رہی تھی... سلجوق سٹیئرنگ پر تھا اور اب کار سے باہر نہیں آ سکتا تھا کیونکہ کیچڑ نے دروازوں کو بھی بلاک کر دیا تھا.. میں اور سُمیر اُسے دھکا لگا رہے تھے اور اُس کے ایک ہی مقام پر تیزی سے گھومتے ٹائر سیلابی کیچڑ ہمارے چہروں پر پھینک کر اُن پر نہایت عمدہ لیپ کر رہے تھے.. جب ہم بمشکل پار ہوئے اور اس دوران میمونہ اور عینی اوپر سے آنے والے پتھروں سے بچاؤ کی خاطر سر پر ہاتھ رکھے پاگلوں کی طرح سلائڈ کے کناروں پر بھاگتی چلی جا رہی تھیں.. تو جب ہم پار ہوئے تو دوسری جانب ایک بس جانے کب کی رُکی ہوئی تھی کہ سلائڈ کے پار جانا اُس کے بس کی بات نہ تھی..

اُس بس میں سے دو نوجوان اُترے، میرے قریب آئے اور میں اُس لمحے اپنے چہرے سے اور آنکھوں میں سے کیچڑ پونچھنے کے عمل میں تھا اور کہنے لگے "اور لکھیں ان علاقوں کے سفرنامے.. ہمیں بھی ذلیل کروایا اور اب خود بھی ذلیل ہو رہے ہو..."

ظاہر ہے یہ نوجوان میرے قصّے کہانیاں پڑھ کر زندگی میں پہلی بار ادھر آئے تھے اور غالباً اس علاقے کے موسموں نے اور قراقرم روڈ نے اُن کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

"نہیں جی مجھے تو کوئی شک نہ تھا.." نوجوان ہائی سپرٹس میں تھا "لیکن آپ سے یہاں مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے..."

"اور آپ کا تعارف؟"

"ہم جی لیل پوری پاگل خانہ گروپ سے تعلق رکھتے ہیں"

"ماشاءاللہ ــــ"

"ہم میں سے کچھ ہوزری کا کاروبار کرتے ہیں... بنیانیں اور جانگئے بناتے

ہیں، ایک دو بینکر ہیں، کچھ انکم ٹیکس میں ہیں اور لیل پوری ہیں اور ہر برس اکٹھے ہو کر کہیں نہ کہیں نکل جاتے ہیں"

"گلگت سے آ رہے ہیں؟"

"نہیں سر —" نوجوان کے چہرے پر سفر کی تھکن تھی، دھوپ کا سانولا پن تھا "ہم چترال کی جانب سے درّہ شندور کراس کر کے ادھر آئے ہیں۔ ہمارے سفر کا تو اختتام ہونے کو ہے، کل انشاءاللہ گلگت... اور وہاں سے لیل پور واپس اپنے اپنے کام کاج پر.. آج پھنڈر میں آخری رات ہے ہمارے سفر کی.. آپ کدھر سے آ رہے ہیں؟"

"گلگت کی جانب سے —"

"اُلٹا سفر کر رہے ہیں؟.. آپ شندور دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے، دنیا جہان کے درّے اور جھیلیں بھول جائیں گے.. ہم نے ایک رات وہاں بسر کی تھی.. ابھی نیچے پھنڈر گاؤں میں گئے ہوئے تھے کچھ خرید و فروخت کرنے.."

"کیا لینے گئے تھے؟"

"بکرا..."

"جی۔" میں چونک گیا۔

"جی.. بکرا... سر ہمارے لیل پوری پاگل خانہ گروپ کی قدیمی روائت ہے کہ ہر برس جب پہاڑوں میں ہمارے سفر کی آخری رات ہوتی ہے تو ہم "بکرا نائٹ" مناتے ہیں۔ آگ جلا کر اُس پر سالم بکرا بھونتے ہیں، اُس کے گرد ناچتے ہیں اور ساری رات جاگتے ہیں"

"بکرا مل گیا؟"

"جی ہاں، لیکن مشکل سے دستیاب ہوا.. مقامی چرواہے بکرے اور بکریاں وغیرہ بالکل فروخت نہیں کرتے.. گاؤں والوں کی منت سماجت کی کہ دراصل ہم نے کسی بزرگ کے مزار پر منت مانی ہوئی ہے کہ پھنڈر پہنچ کر بکرا قربان کریں گے.. تب ملا"

"اور بکرا کہاں ہے؟"

"وہ —" اُس نے اشارہ کیا... اور جدھر اُنگلی اُٹھا کر اشارہ کیا اور "وہ" کہا، وہاں پھنڈر گاؤں کی طرف سے ریسٹ ہاؤس کو اُٹھتی تیکھی تیر سڑک پر ایک صاحب ایک

بکرا اُٹھائے ہانکتے تھے، کبھی اُسے نیچے کھائی میں گرنے سے بچاتے تھے، کبھی اُسے بمشکل اُٹھا کر چند قدم چلتے تھے بلکہ لڑھکتے تھے اور پھر ہانپتے ہوئے اُسے زمین پر گرا کر اُس سے مخاطب ہو کر یقیناً ایسے کلمات کہتے تھے جو بکرا کی والدہ یا ہمشیرہ کی شان میں ہوتے تھے..

بالآخر جب وہ دونوں ریسٹ ہاؤس کے دالان میں نمودار ہوئے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ صاحب بکرا اُٹھائے ہوئے ہیں یا بکرا اُن صاحب کو آغوش میں لیے آتا ہے۔

"تارڑ صاحب آج رات بکرا.. یعنی کھانا آپ ہمارے ساتھ کھایئے گا.. ہمیں خوشی ہوگی کیونکہ ہم نے آپ کو ایک عرصے سے اپنے لیل پوری پاگل خانہ گروپ کا اعزازی ممبر بنا رکھا ہے"

"میں کوشش کروں گا.."

نوجوان بکرا سنبھالنے کے لیے اُن صاحب کی جانب چلا گیا۔

میمونہ کھڑکیوں میں گیلے کپڑے پھیلا رہی تھی.. بچے لوگ وادیٔ پھنڈر کی تصویر میں بھٹکتے تھے.. اسلم جیپ کے نیچے لیٹا اُس کے پیٹ کا معائنہ کرتا تھا اور کہیں سے ایک بکرے کی ہاں ہاں سنائی دے رہی تھی، اُس لمحے شندور کی جانب سے آنے والی کچی سڑک پر ایک غیر ملکی مخلوق چلتی نظر آئی..

وہ مخلوق.. مریخ کی بھی ہو سکتی تھی.. ایک پھٹی ہوئی جین.. کیچڑ بھرے بوٹ، ایک بدرنگ بلاؤز اور پی کیپ میں تھی.. اور اس پی کیپ کے کناروں سے اُس کے بھوسلے میلے چیکٹ بال لٹکتے تھے.. اُس کے کاندھے پر ایک مفلوک الحال رُک سیک اپنی غربت کی دوہائیاں دیتا تھا..

"ہائے —" وہ اپنا سانس درست کرتے ہوئے ہم تک پہنچی..

اگرچہ یہ ایک نسوانی مخلوق تھی لیکن اس کے وجود سے پھنڈر کی کائنات میں جتنے رنگ تھے وہ یکدم پھیکے پڑ گئے.. اس کی آمد سے ریسٹ ہاؤس پر بلند ہونے والے پہاڑوں سے ایک رومانوی دُھند اُترنے کا کوئی امکان نہ تھا.. نہ دریائے غذر کے بہاؤ میں کوئی فرق آ سکتا تھا.. اور نہ ہی کسی مچھلی کے کافر ہو جانے کا کوئی خدشہ تھا..

وہ اگر ایک عورت تھی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا.. اگر وہ مرد ہوتی تو

بھی تقریباً ایسی ہی ہوتی جیسی کہ وہ تھی..

لیل پوری نوجوان بکرا سنبھالنے کے بعد واپس آگیا..

اُس مخلوق کا سانس بحال ہوا تو اُس نے فوری طور پر ایک رٹا ہوا سبق سنا دیا "میں اٹالین ہوں.. روم میں ٹیچر ہوں.. ہر برس دنیا کے کسی بھی پہاڑی سلسلے میں پیدل سفر کرتی ہوں.. کرائے یا خوراک کے لیے جیب میں سے ایک لیرا بھی نہیں نکالتی.. لفٹیں لے کر سفر کرتی ہوں... کھانے پینے کے لیے مقامی مہمان نوازی پر انحصار کرتی ہوں... اور یہ وادی... پھنڈر از اے ونڈر..."

اُس کا نام ماریا انجلا بونا ویتا قسم کا تھا..

لیل پوری نوجوان اس واجبی سی میم کو دیکھ کر نہال ہو گیا.. اور اُس نے فوری طور پر اُسے بکرا نائٹ میں شمولیت کی دعوت دے دی جو اُس نے فوری طور پر قبول کر لی.. بلکہ اُسے اگلی صبح گلگت تک اپنی جیپ میں لفٹ دینے کے لیے بھی آمادگی ظاہر کی.. میم اُس سے زیادہ آمادہ ہو گئی..

ہم سے فارغ ہو کر اُس نے میمونہ کو سپاٹ کر لیا اور ایک اور "ہائے" کے ساتھ اُس کے قریب جا بیٹھی۔ بلکہ قریب ہو بیٹھنے کو تھی کہ میمونہ کھسک کر ذرا پرے ہو بیٹھی.. "یہ میمیں نہاتی کیوں نہیں ہیں؟" میمونہ نے مجھ سے پوچھا جیسے یہ میری ذمہ داری تھی کہ ہر مخدوش میم کو نہلاتا پھروں "ایسی عجیب سی مشک آ رہی ہے اس میں سے.. اِسے کہو ذرا پرے ہٹ کر مجھ سے بات کرے.."

"یہ کوئی اتنی مصدقہ قسم کی میم نہیں ہے میمونہ.. ویسے بھی اتنی دور سے بے چاری ہمارے ملک میں آئی ہے تو ذرا خوشگوار ہو جانے میں کوئی حرج نہیں"

چنانچہ میمونہ خوشگوار ہو گئی اور پہلا سوال یہ پوچھا کہ... تم نہاتی کیوں نہیں ہو؟

"می؟... ماما میا" اُس نے خصوصی اطالوی انداز میں سینے پر ہتھیلی جما کر کہا "ادھر سردی بہت ہے اور نہانے کے لیے کپڑے اُتارنے پڑتے ہیں"

"تم کپڑے اُتار بھی دو تو کیا فرق پڑتا ہے..." میمونہ نے زیرِ لب کہا..

"بارست کے چشمے کا سیون اپ"

اُس شب "بکرا نائٹ" بُری طرح فلاپ ہو گئی..

اس لیے کہ جو بکرا بڑی منت سماجت سے اہل پھنڈر سے حاصل کیا گیا تھا.. وہ پتھر کا نکلا.. اُس سے ایک بے وفا صنم تو تراشا جا سکتا تھا لیکن اُسے نوش نہیں کیا جا سکتا تھا... لیل پوری پاگل خانہ گروپ اُس الاؤ کے گرد جس میں وہ بکرا روسٹ نہیں ہوتا تھا، گئی شب تک رقص کرتا رہا.. لوک گیت الاپتا ناچتا رہا.. لیکن وہ پتھر کا صنم نہ پگھلنا تھا، نہ پگھلا.. پتھر کا پتھر رہا..

اور ماریا انجلا بونا ویتا اُسے حسرت سے تکتی رہی..

شائد بکرے کے پتھر ہو جانے میں بھی اُس کے نہ نہانے کا ہاتھ تھا..

فیصل آباد سے آئے ہوئے یہ لوگ مجھ سے بڑے آوارہ گرد تھے.. وہ ہر برس اُس اُلجھے ہوئے صنعتی پھیلاؤ والے بے برکت شہر کی جکڑ بندی کو توڑ کر آزاد ہوتے تھے اور ویرانوں کا رُخ کرتے تھے.. آوارہ گردی میرا پیشہ تھا اور اُن کی وہ محبت تھی جس کے لیے وہ اپنی ہوزری کی فیکٹریاں، انکم ٹیکس کے دفاتر اور بینک تیاگ دیتے تھے.. میں اُنہیں حسد سے دیکھتا تھا کہ وہ عشق آشنا تھے اور میں اس عشق کا کاروبار کرنے والا تھا..

شب بھیگنے لگی اور سرد تر ہونے لگی..

بے وفا صنم پتھر کا ہی رہا..

تب ریسٹ ہاؤس کے عقب میں بلند برف پوش چوٹیوں سے دُھند اُتری..

اور میں اُس دُھند کا ایک ذرہ ہوا..

دریائے غذر کے بہاؤ کی سرسراہٹ بلند ہوئی..

اور میں اُس میں ایک بے اختیار تنکا ہوا..
سرد ہوا آئی..
اور میں اُس کا ایک بوسہ ہوا..
ڈبویا مجھ کو ہونے نے.. نہ ہوتا تو کیا ہوتا..

ہماری جیپیں ریسٹ ہاؤس سے اُترنے لگیں..
اُن کا رُخ شندور کی جانب تھا..

اور ہم پھنڈر کی منی ایچر تصویر میں جانے لگے، اُس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اُس کے سائز میں ڈھلنے لگے اور اُس کا ایک حصّہ بننے لگے.. جیسے ایک مغل منی ایچر تصویر میں.. درباری ہاتھ باندھے کھڑے ہوں، ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوں، شاہ جہان تیر کمان تانے شکار تاکتا ہو.. اورنگ زیب ایک مست ہاتھی کی جانب بے خوف بڑھتا ہو اور اس تصویر میں دو جیپیں دُھول اُڑاتی چلی جاتی ہوں.. ایسے ہم پھنڈر کی تصویر کا ایک حصّہ بنے..

اور جب ہم اُس تصویر میں سے نکلے تو گویا ہماری جیپیں اور ہمارے قد بڑھتے گئے.. جیپوں کے انجنوں کا شور پھنڈر کی وادی پر دور تک سفر کرتا تھا.. دریائے غذر کے بظاہر ٹھہراؤ میں آئینہ ہوتے درخت اور کھیتوں کی ہریاول اس شور سے لہروں میں بدلے اور انہوں نے ہماری جانب دیکھا.. اوپر پرجوش بلندیوں کے دامن میں ایک کچّی سڑک پر دو سبز رنگ کی جیپیں دُھول اُڑاتی حرکت میں تھیں اور اُن میں.. ہم تھے.. جو ابھی اس مختصر تصویر کے کردار تھے.. ہاتھ باندھے ایک دربار میں سر جھکائے کھڑے تھے.. پھنڈر کے حُسن کے دربار میں کھڑے تھے اور اب.. ہم باغی ہو کر فرار ہو رہے تھے..

گلوغ آ گیا..

گلوغ.. جہاں بہت سارا صاف پانی آ رہا ہو...

گلوغ نام کے متعدد گاؤں تھے..

گلوغ مُولی... پھر گلوغ توری کے چند گھر... چند چولہے آئے... اور ہم اُن میں سے گزرتے گئے کہ جو مسافر ایک مختصر وادی کی حیرت میں سے نکلتے ہیں اُنہیں کسی

بھی وادیٔ حقیقت میں کشش نظر نہیں آتی..
پھر یکدم جیپیں رُک گئیں..

روڈ کا ایک طویل ٹکڑا کیچڑ میں بدلا ہوا تھا اور پانی ایک ندی کی طرح اُس پر رواں تھے..

یہ اطلاع دینے کی کیا حاجت ہے کہ اسلم نے آج سویرے حسبِ وعدہ اپنی جیپ کو پُرزہ پُرزہ جوڑ کر ایک فرینکسٹائن کی طرح زندہ کر لیا تھا.. اُسے مکمل کر لیا تھا اور اب اُس کا انجن اسلم کی زبان کی طرح نہ ہکلاتا تھا نہ رُکتا تھا..

"ادھر رات کرے گا سر—" غازی جیپ سے اُتر گیا "اِسے کراس نہیں کر سکتا.. کیچڑ اور پانی جیپ میں جائے گا تو درمیان میں پھنس جائے گا.. کل تک یہ خشک ہو گا تو پھر آگے جائے گا..

ہمارے چہرے اُتر گئے.. یہاں کہاں رات کریں گے..

"اوئے نہیں.. غ غ غازی.. " اسلم بمشکل بولا "پ پار چلا جائے گا"

"تم ادھر پہلی بار آیا ہے۔ ہم ادھر کا رہنے والا ہے.. ہم جانتا ہے کہ جیپ پار نہیں جا سکتا.. صاحب کا فیملی ساتھ ہے، درمیان میں جا کر کیچڑ میں کیسے اُترے گا.. کیا بات کرتا ہے.. ہم جانتا ہے"

"میں ادھر کا رہنے والا نہیں نہیں ہوں لالہ.. لیکن.. ڈ ڈرائیور ہوں.. اور مک مکینک ہوں.. گ گجرات کا رہنے والا ہوں.. اور اُدھر سوہنی چناب کے پار چ چلی جاتی تھی.. اور یہ تو جیپ ہے.. جائے گی اللہ کے ف ف فضل سے"

اور اسلم نے اپنی جیپ اُس گھٹنوں تک آتے کیچڑ میں اُتار دی.. وہ ایک کچے گھڑے کی طرح ڈولتی، زور لگاتی، کبھی رُکتی کبھی احتجاج کرتی، کبھی تیرتی بالآخر دوسرے کنارے پر پہنچ گئی.. غازی نے ظاہر ہے بے حد سبکی محسوس کی اور بڑبڑاتا ہوا مجبوراً اُس کے پیچھے پیچھے چلا آیا..

اور ہمیں تب احساس ہوا کہ غازی ذرا سا پھنّے خاں ہے.. وہ مقامی ہونے کے تفاخر میں اب تک جو بیان بھی دیتا تھا ہم فی الفور اُس پر یقین کر لیتے تھے.. لیکن وہ اتنا ہرگز نہیں جانتا تھا جتنا وہ بیان کرتا تھا..

وہ ایک ایسا ٹورسٹ گائڈ تھا جو ایک غیر ملکی کو رنجیت سنگھ کی مڑھی دکھا کر کہہ سکتا تھا کہ صاحب ہم مقامی لوگ ہے.. یہ سنہری مسجد ہے..

بہت بعد میں، سفر کے آخری مرحلے میں جب ہم ٹیکسلا سے گزر کر اسلام آباد جا رہے تھے اور ہمارے آگے سوات کے سنگِ مرمر سے لدا ہوا ایک ٹرک جا رہا تھا تو غازی نے نہائت پُر اعتماد لہجے میں... جیسے امریکی وزارت خارجہ کا کوئی ترجمان پریس رپورٹرز کو بریفنگ دیتا ہے.. اسی لہجے میں کہا تھا "صاحب.. یہ جو ٹرک ہمارے آگے جا رہا ہے اس پر جو سفید پتھر ہے تو یہ نمک کا پتھر ہے... کوہستانِ نمک سے آ رہا ہے.. اسے اسلام آباد لے جا کر پیسیں گے اور چکن تکّہ پر چھڑکیں گے.."

"لیکن غازی.. یہ تو سنگِ مرمر ہے سوات کا.. ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں"

"نہیں صاحب.. یہ پتھر لگتا ہے لیکن نمک ہے.. ہم جانتا ہے.. بے شک ٹرک روک کر اسے چکھ کر دیکھ لو.. ہم جانتا ہے" اُس نے کہا تھا۔

چنانچہ غازی کی معتبریت اور اعتبار خاصے مشکوک تھے..

کیچڑ اور پانی کے پار ہوئے تو دوسری جانب روڈ پر دو گمشدہ اور نہائت اداس موٹر سائیکل سوار نظر آئے.. وہ درّہ شندور سے اُترے تھے اور اب اپنے سامنے یہ ناقابل عبور رکاوٹ دیکھ کر رُکے ہوئے تھے.. وہ اپنی موٹر سائیکلوں پر براجمان نہائت دل گرفتہ حالت میں اس کیچڑ اور پانی کے سیلاب کو تکتے تھے جس کے پار وہ نہیں جا سکتے تھے... وہ اتنے رنجیدہ تھے کہ اُنہوں نے آنکھ اُٹھا کر بھی ہماری جانب نہیں دیکھا... نہائت ملول حالت میں اُس رکاوٹ پر نظریں جمائے پار جانے کی سوچ میں غرق رہے.. ہم اُن کے لیے کیا کر سکتے تھے.. البتہ اُن کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم نے ایک پُر شفقت اور خوش نصیبی تمہارے ساتھ ہو "ہیلو" کہا اور گزر گئے..

روڈ ذرا بلند ہو گئی..

سامنے ٹیرو کا گاؤں نظر آنے لگا..

ایک وسیع میدان کے کناروں پر ایک خوش نظر وادی میں سمٹا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤں..

جیپ روڈ سے ذرا فاصلے پر.. ٹیرو..

ٹیرو سے درد علی ٹریک کو راستہ جاتا تھا..

یہیں سے ایک راستہ جھیل ہندرب تک جاتا ہے..

جھیل ہندرب کی میں نے بہت تعریف سنی تھی..

جو کوہ نورد اس کے کناروں سے اوپر ہو کر پہاڑوں کے دوسری جانب سوات میں اُترتے تھے.. اور ٹراؤٹ مچھلی کے شائق جو شکاری تھے.. اُن کا کہنا تھا.. اور مچھلی کے شکاری کی باتوں کا یقین نہیں کرنا چاہیے.. اُن کا کہنا تھا کہ جھیل ہندرب میں اتنی ٹراؤٹ بھری پڑی ہے کہ اُس میں کشتی چلانا محال ہوتا ہے..

یہ وہی جھیل تھی جہاں چترال کے شہزادے خیمہ زن ہوتے تھے اور پکنک مناتے تھے..

سڑک کے دائیں جانب ٹیرو کا ریسٹ ہاؤس گزر گیا..

گلگت سے وادیٔ پھنڈر تک سفر میں وحشت اور خطرناکی تھی.. لیکن اس سے آگے اس میں ایک ہموار لطف اور اطمینان تھا.. آبادیوں کے آثار نمایاں تھے..

ٹیرو سے نکلتے ہوئے غازی نے اپنی داڑھی میں اُنگلیاں چلاتے ہوئے ایک ماہر گائڈ کی طرح مجھ سے پوچھا "صاحب، سیون اَپ پیئے گا؟"

"نہیں—" میں نے کہا۔

اُس کے لیے میرا "نہیں" قطعی طور پر غیر متوقع تھا... اُس کا خیال تھا کہ میں اُچھل پڑوں گا.. بے یقینی سے پوچھوں گا، غازی، سیون اَپ.. یہاں کہاں.... اور میں انکاری ہو گیا تھا..

"صاحب، مفت میں ملے گا.. ہاضمہ درست کرے گا.. پیئے گا؟"

"اگر آپ زبردستی کرے گا تو پیئے گا..." میں نے لاپروائی سے کہا، اگرچہ مجھے بھی کُھد بُد لگی ہوئی تھی کہ یہ کونسے سیون اَپ کی بات کر رہا ہے..

"پلائے گا سر.."

اُس نے سٹیرنگ گھمایا، جیپ کو روڈ سے اُتارا اور ایک ایسے پتھریلے راستے پر ڈال دیا جو اس سے پیشتر مشکل سے ہی ٹائروں کی زد میں آیا ہو گا.. وہ جا بجا پڑے پتھروں اور جھاڑیوں سے بچتا بچاتا اور ہمیں نشستوں پر اُچھالتا ڈرائیو کرنے لگا.. یہاں جیپ

چلانے کے لیے واقعی مہارت درکار تھی لیکن مجھے شبہ ہے کہ اُس کی مہارت کے ساتھ ہماری خوش بختی بھی ساتھ دے رہی تھی.. اسلم جو ہمارے عقب میں ایک ہلکے عقاب کی طرح اُڑتا چلا آرہا تھا، مسلسل ہارن دے رہا تھا.. غازی نے سر جھٹک کر جیپ روک لی..

"صاحب، شن شندور تو اُدھر ہے.. اِدھر کہاں جارہے ہیں؟"

"یہ میرا علاقہ ہے—" غازی نے ایک چشم حقارت اُس پر واکی "میں جانتا ہوں کہ ہم کدھر جارہے ہیں—"

"اور اگر ٹائی راڈ ٹوٹ گیا تو.."

"سیون اپ پیو گے؟" غازی نے دوسری چشم حقارت واکر کے پوچھا۔

"سیون سیون اَپ؟"

"چلے آؤ—" غازی نے جیپ سٹارٹ کر کے اُسے پہلے گیئر میں ڈالا اور دھچکتے ہوئے ہم ایک چٹانی بلندی پر چڑھنے لگے...

میں غازی کے سیون اپ کی حقیقت سے آگاہ تھا.. مجھے بتایا گیا تھا کہ درّہ شندور سے اِدھر بارَست نام کی ایک جگہ مین روڈ سے ہٹ کر کہیں واقع ہے اور وہاں ایک ایسا چشمہ ہے جس کے پانی نہایت ہاضمہ ہیں اور اُن کا ذائقہ کھارے سوڈے کے موافق ہے..

اہل چترال دعوے کرتے ہیں کہ اُن کی ریاست کی آخری حد بارَست ہے جو فی الحال گلگت کی عملداری میں ہے..

اوپر سے.. بارَست چشمے کی جانب سے ایک بارات نیچے آرہی تھی..

درہ شندور کے دامن میں آباد کسی گمنام گاؤں سے نوخیزی کو بجھا دینے والی آگ کے حصول کے لیے.. ایک بارات نیچے آرہی تھی..

وہ اس ویرانی میں لاپرواہ اور بکھرے ہوئے چلے آرہے تھے.. اور پھر انہوں نے ان دو نامحرموں کو دیکھ لیا جو سبز رنگ کے تھے اور ان میں کچھ مسافر سوار تھے۔

ہمیں دیکھ کر وہ سنبھل گئے..

دولہا نے فوراً اپنے چہرے کو سہرے سے ڈھک لیا.. باراتی جو پتھر پھلانگتے،

چُہلیں کرتے نیچے آرہے تھے، ہمیں دیکھ کر ہوشیار ہوگئے.. خواتین جو وادی پھنڈر اور ٹیرو کے سبزہ زاروں اور گلوغ کی ندیوں کی سفیدی کی طرح تر و تازہ، چُلبلی اور کھلنڈری نیچے اترتی تھیں، وہ کیسے اس گمان میں ہو سکتی تھیں کہ ان ویران پہاڑوں اور پتھروں کی خاموشی میں ان کے سوا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے.. اور جب انہوں نے کوئی اور بلکہ کئی اور دیکھے تو وہ بھی سنبھل گئیں.. اور وہ اس طور سنبھلیں کہ اپنے لباسوں پر جو ان خطوں کے پھول بوٹے کڑھے ہوئے ویرانوں میں چپکے سے بہار کی نوید دیتے تھے، انہیں ذرا نمائش کریں، انہیں ڈھکتے ہوئے گرم شالوں سے لیکن اس اہتمام کے ساتھ کہ ان کوہ نوردوں کو ذرا ان کی ایک جھلک خوش رنگی اور خوش نمائی کی دکھائی تو دے... چہروں کے آگے پلو کھینچتی، دزدیدہ نگاہوں سے ہمیں پرکھتی.. نیچے اتر گئیں..

یہ رنگینیٔ نوبہار بارات ہماری راستہ دینے کے لیے رکی ہوئی جیپوں کے پہلو میں سے گزر کر شائد ٹیرو کی وادی کی جانب چلی گئی۔

"یہ بارات تھی صاحب—" غازی نے اپنی معلومات کی دھاک بٹھادی..

"ہاں.. مجھے بھی شک ہوا تھا.. بارات نہ ہوتی تو دولہا کتنا بے وقوف لگتا—"

"ہاں صاحب.."

غازی نے جیپ سٹارٹ کی.. کچھ دور تک پھر دھکے کھائے، بڑے بڑے پتھروں کی خدمت میں آداب عرض کر کے ان سے راستے کی بھیک مانگتے ذرا آگے گئے اور وہاں یہ نام کا راستہ بھی بے نام ہو گیا.. اس سے آگے پتھروں کے انبار تھے اور بلندی تھی.. ایک چھوٹی سی ندی تھی، چند گل بوٹے تھے جو شائد بارات میں شامل خواتین کے پیراہنوں سے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھڑ کر ادھر رہ گئے تھے..

"غازی.. آگے تو راستہ نہیں.."

"پروا نہیں صاحب.. جیپ ادھر چھوڑے گا اور آگے پیدل جائے گا.. تھوڑا دور ہے۔"

میمونہ نے سنگلاخ راستے کی کٹھنائیوں کو ایک نظر میں جانچا اور ناک چڑھا کر بولی "رہنے دو سیون اپ کو... لاہور جا کر پی لیں گے۔"

"پلائے گا بیگم صاحب.. آپ ادھر ٹھہرو، ہم اوپر جا کر لاتا ہے۔"

غازی جیپ سے اترا۔ ایک کنستر کو اپنے دائیں ہاتھ میں جھلاتا، پتھر ناپتا اوپر چلا گیا.. ہم ہوا کی تازگی اور ویرانے کے حسن میں انتظار کرنے لگے.. وہ خاصی دیر بعد واپس آیا.. وہی کنستر جسے وہ جھلاتا ہوا اوپر گیا تھا اب اپنے کاندھے پر رکھے ہانپتا ہوا واپس آیا۔ ''سیون اَپ صاحب۔''

میں نے بارست کے چشمے کا پانی.. جو کہیں اوپر چٹانوں میں تھا.. ایک گھونٹ لیا تو واقعی اس میں کچھ ایسے کیمیکل تھے، قدرتی گیس کی کوئی ایسی ملاوٹ تھی کہ اس کا ذائقہ سیون اپ سے ملتا جلتا تھا.. اس کے جتنے گھونٹ بھرتے تھے، اتنے ڈکار آتے تھے..

واپس.. درہ شندور جانے والی روڈ پر ہم واپس آئے.. کچھ فاصلہ طے کیا.. پھر ایک پُل آیا.. اس کے پار گئے تو لنگر دکھائی دینے لگا..

لنگر..

سخی شہباز قلندر..

یہ کس کا لنگر تھا۔

''لنگر کی شیشہ ندیوں میں تیرتے ہم.. اور مچھلیاں''

کہا جاتا ہے کہ چترال کے متروک شہزادگان ہندرب جھیل کے راستے میں اس مقام پر پڑاؤ کرتے تھے..

یہاں ان کا لنگر ہوتا تھا.. اس لیے لنگر!

دونوں جیپوں کے انجن بند ہوئے تو ہمارے کانوں میں پانی کے بہاؤ کی چلبلی سرگوشیاں بہت دھیمے سُروں میں بہنے لگیں..

چٹیل پہاڑوں کے درمیان سرسبز جھاڑیوں اور گھاس کے گھنے قطعات کا ایک سلسلہ تاحد نظر تھا.. ایک عجیب و غریب لینڈ سکیپ تھی.. یہ برازیل میں زوردار بارشوں میں سدا بھیگنے والا ایک پستہ قد جنگل بھی ہو سکتا تھا.. جس میں اگر عبداللہ حسین کی قامت کا کوئی شخص ہے تو نظر آتا ہے اور اگر میرے قد کا کوئی بندہ داخل ہو تو اوجھل ہو جائے.. جھاڑیاں اور گھاس.. لیکن کوئی ندی یا پانی کی روانی نظر نہ آتی تھی.. ان کی چلبلی گنگناہٹ البتہ جل ترنگ بجاتی چلی جاتی تھی... جیسے بھلے وقتوں میں سیاہ برقعوں میں ڈھکی کالج کی لڑکیاں پاس سے گزرتی تھیں تو ان کی ہنسی تو سنائی دیتی تھی، وہ دکھائی نہیں دیتی تھیں..

ہم جیپوں سے اتر کر سڑک سے نیچے آئے.. کچھ فاصلہ طے کیا.. پھر جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم ان کے اندر داخل ہو کر ان کی ٹہنیوں کو ہاتھوں سے دائیں بائیں دھکیلتے ذرا آگے گئے تو ان کے درمیان میں ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی.. اس کے شفاف پانیوں میں کناروں کی گھاس سبز بالوں کی طرح گیلی ہوتی زندہ لگتی تھی.. یہ ندی اتنی مختصر تھی کہ اسے آسانی سے پھلانگا جا سکتا تھا.. چنانچہ ہم پانچوں نے اسے ایک ہی جست میں پار کیا.. گھاس کے سرسبز قطعے پر لینڈ کیا اور اس کے آگے بھی جھاڑیاں راہ روکتی تھیں... ان کے اندر گئے تو ایک اور شرمیلی ندی روپوش تھی.. کھلکھلاتی اور

برقعے میں لپٹی لڑکی کی طرح کی ہنستی.. لنگر میں سرسبز پست قد گھنے گھیر والی جھاڑیاں وہ برقعے تھے جو ان کھلنڈری لیکن دھیمے بہاؤ والی ندیوں نے اوڑھ رکھے تھے..

اور کوئی دو چار ندیاں نہ تھیں..

ان کا شمار نہ تھا..

کہیں ان کا میل ہوتا تھا اور کہیں وہ ایک دوسرے سے روٹھ کر الگ الگ بہنے لگتی تھیں۔

ان کا کوئی شمار نہ تھا..

لیکن وہ جتنی بھی تھیں لنگر کے وسیع علاقے میں جھاڑیوں اور قد آدم گھاس اور سروٹوں کے اندر چھپ چھپ کر بہتی تھیں اور صرف ان کی چھیڑنے والی دبی دبی ہنسی بہت دھیمے سُروں میں ہمارے کانوں تک پہنچتی تھی..

ہم ان کے اندر تک چلتے گئے.. وہاں تک.. جہاں سے ہمیں نہ وہ کچی سڑک دکھائی دیتی تھی جو شندور کو جاتی تھی اور نہ ہماری جیپیں نظر آتی تھیں.. دوپہر کے کھانے کے لیے گھاس کے ایک ایسے گھنے ہریاول پن میں دستر خوان بچھا جس کے چاروں اور جھاڑیاں سرد ہوا میں جھولتی تھیں اور ان کے اندر سے ایک سرد بہار کی آہستگی اور گیلی ٹھنڈک کے ساتھ وہ بے انت ندیاں اترتی چلی جاتی تھیں کہ ان کے پانی بے حد یخ تھے۔ بلور کے ایک فانوس کی مانند شفاف یوں تھے کہ ان کی تہہ کے پتھر عیاں ہوتے تھے۔ کناروں سے لٹکتی گھاس کا ایک ایک تنکا بہاؤ میں جھومتا دکھائی دیتا تھا.. یہ ندیاں گہری نہ تھیں.. مشکل سے ان کے پانی گھٹنوں تک پہنچ پاتے تھے.. لیکن یہ اپنے مختصر وجود میں اتنی مکمل تھیں کہ ان میں اترتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کوئی جناتی مخلوق ہیں جو بڑے اطمینان سے ایک بڑے دریا کی گہرائی کو اپنے گھٹنوں تک محسوس کرتے پار جا رہے ہیں..

لنچ کے لیے پھنڈر ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کے تیار کردہ وہ پراٹھے تھے جو ٹھنڈے اور لچکدار ہو چکے تھے۔ ان میں لپٹا آملیٹ بھی ربڑ کی خصلت اختیار کر چکا تھا.. لیکن ہماری فلاسک میں کافی بھی تھی.. جو بے حد گرم تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میمونہ اور عینی نے حسب معمول لڈو کا کارڈ گھاس پر

بچھایا اور اس پر جھک گئیں.. اس سفر کے دوران ان دونوں کو جہاں کہیں بھی ایسا منظر دکھائی دیا جس کی دل فریبی کو دیکھے چلا جانا چاہیے، وہ فوراً وہاں لڈو کی بساط بچھا دیتیں اور پر مسرت ہو کر ہاتھ ملتیں کہ.. واہ ادھر تو لڈو کھیلنے کا مزا آ جائے گا.. یہ بساط اب تک دریائے سندھ کے کنارے، گلگت،، گوپس اور پھنڈر کے ریسٹ ہاؤسوں کے دالانوں میں.. گلوغ کی ندیوں کی قربت میں بچھائی جا چکی تھی.. اور اب لنگر کی جھاڑیوں میں پوشیدہ ایک ندی کے کنارے گھاس پر بچھ چکی تھی اور وہ آس پاس سے بے خبر اس پر جھکی ہوئی تھیں.. ان ندیوں اور جھاڑیوں نے اور ان ہواؤں کی شفافی نے جو ان پر سرد سانس لیتی تھیں، ظاہر ہے سخت ہتک محسوس کی ہو گی کہ ادھر جو آتا ہے، ہمیں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اور یہ دو خواتین ایک دوسرے کی گیٹیاں مار کر خوشی سے چیخیں مارتی ہیں اور مجال ہے جو ہم پر ایک نگاہ کریں۔

میں، سلجوق اور سمیر ان جھاڑیوں کے اندر جاتے تھے۔ نئی ندیاں تلاش کرتے تھے۔ انہیں ناپتے پھرتے تھے.. کبھی یکسر ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے.. اور کبھی ادھر ادھر بھٹک کر یکدم آمنے سامنے آ جاتے تھے.. یہ ایک عجیب بھول بھلیوں کا کھیل تھا..

"ابو..." سمیر جو ان دنوں قد نکال رہا تھا، اس نے اپنے نکلتے ہوئے قد کو ایک کمان کی طرح جھکایا اور ایک ندی کے پانیوں پر ایک پیاسے اونٹ کی طرح تھوتھنی رکھ کر بولا "مچھلی..."

ہم نے چونکہ ان ندیوں کا کلوز کوارٹرز سے مطالعہ نہیں کیا تھا، صرف انہیں پھلانگتے اور خوش ہوتے رہے تھے، اس لیے ہم یہ نہ جان سکے کہ لنگر کے ان پانیوں میں اتنی مچھلیاں ہیں کہ اگر کچھ دیر نظر جما کر انہیں غور سے دیکھا جائے تو شیشہ پانیوں میں کوئی نہ کوئی چھوٹی سی ٹراؤٹ ایک زندہ معجزے کی طرح، ایک سفید تیر کی طرح تیرتی غائب ہو جاتی ہے..

اب میں اور سلجوق بھی، سمیر کے برابر میں پیاسے اونٹوں کی طرح پانی کے اوپر تھوتھنیاں جھکائے آنکھیں نہیں جھپکتے تھے کہ وہ خاصے انتظار کے بعد اتنی شتابی سے گزر جاتی تھیں کہ آنکھ جھپکتے ہی اوجھل ہو جاتی تھیں..

غازی مچھلیوں کی اس آماجگاہ سے واقف تھا اور وہ ایک عام سی ڈوری اور اس کے سرے پر بندھے ایک کانٹے کی مدد سے اب تک تین چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پانی سے باہر لا چکا تھا..

جب بھی کوئی مچھلی اس کے کانٹے میں اٹکتی تو وہ اسے ایک جھٹکے سے پانی سے باہر لاتے ہوئے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگاتا اور ہم چونک کر ادھر دیکھتے اور وہ ہمیشہ ایک مختلف لوکیشن میں دکھائی دیتا اور ایک تڑپتی ہوئی مچھلی لنگر کی جھاڑیوں میں سے بلند ہوتی نظر آتی..

ثمیر کو بہت تاؤ آیا کہ میرے پاس تو نہایت جدید قسم کا فرانسیسی فشنگ ٹکل ہے جس کی گراری کی گردش افلاک سے بھی تیز ہے اور یہ ڈرائیور ایک معمولی دھاگے کی مدد سے مچھلیاں یوں اچھال رہا ہے جیسے ایک مہاراجہ چاندی کے سکے اچھالتا ہے.. تو اے مچھلیو سنبھل جاؤ، اب میں آرہا ہوں..

مچھلیوں نے ثمیر کی پکار پر دھیان نہیں دیا اور وہ تادیر اپنے جدید قسم کے فرنچ فشنگ راڈ سے لنگر کی ندیوں پر ڈورے ڈالتا رہا اور انہیں کھینچ کر پھر ڈالتا رہا.. اور پھر تنگ آگیا۔ "نہایت بیک ورڈ قسم کی مچھلیاں ہیں ابو... دیسی ڈوری میں پھنس جاتی ہیں اور فرانسیسی ڈوری کو منہ نہیں لگاتیں.."

ہم سب بے حد اطمینان میں تھے.. ہمارے اندر سفر کی بے چینی مفقود ہو چکی تھی.. ہم سکون کے سبزہ زاروں میں چوکڑیاں بھرتے تھے۔ ایک جمود اور سستی کی کیفیت کے مزے میں تھے جو منزل پر پہنچ جانے والے مسافروں کے جثوں میں ہوتی ہے.. اس لیے کہ غازی ہمیں خبر کر چکا تھا کہ لنگر سے شندور ٹاپ صرف تیس منٹ کی مسافت پر ہے..

اور درّہ شندور ہماری منزل تھی.. اور منزل ماد ور نیست..

ہم نے وہاں شب بسر کرنی تھی..

شندور ٹاپ پر... اس کی جھیل وسعتوں اور برفوں کے دامن میں صرف ایک قیام گاہ "شندور ہٹ" نام کی تھی اور شنید تھی کہ ہما شما اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی تصویر بھی نہیں اتار سکتے تھے.. اگرچہ ہم دائمی ہما شما تھے لیکن کرنل پرنس محی الدین اس زمانے میں منسٹر فار ٹورازم.. اس شاندار جھونپڑے

کے دو کمرے ہمارے لیے مخصوص ہو چکے تھے.. اسی لیے ہم ایک پُر اطمینان اور لاپرواہ کیفیت میں لنگر میں لنگر انداز تھے.. جہاں میمونہ اور عینی ابھی تک... چوکا، چھکا کے نعرے لگاتیں ایک دوسرے کی گوٹیوں کو ہلاک کر رہی تھیں۔ سلجوق گھاس پر اوندھا لیٹا اونگھ رہا تھا اور ثمیر کبھی اس ندی کے پانی پر تاک جماتا، کبھی اس ندی پر جھکتا ہر چند لمحوں کے بعد "ابو مچھلی" کی اناؤنسمنٹ کر رہا تھا...

اور میں... میں بھی گھاس پر لیٹا سستی اور کاہلی کے مزے لے رہا تھا.. تو مجھے ایک خیال آیا.. اور یہ خیال جہاں میں پانی دیکھتا تھا، وہاں پہلے سے موجود ہوتا تھا.. کیونکہ جس شخص کے آباؤاجداد چناب کے کناروں پر آباد تھے اور جس کے والد سکول جانے سے پیشتر اپنے چاچا کا ناشتہ لے کر دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر جو چراگاہ تھی، جہاں ان کے چاچا کے مویشی چرتے تھے، وہاں ناشتہ دے کر چناب میں تیرتے واپس گاؤں آتے اور پھر سکول کے لیے روانہ ہو جاتے.. تو ایسا شخص بے شک لاہور میں پیدا ہو... گورنمنٹ کالج کے سوئمنگ پول کی ریلنگ تھام کر ہی پانی میں اترتا ہو، اسے چھوڑنے پر تیر نہ سکتا ہو اور یار دوست ڈوبنے سے بچاتے ہوں.. پھر بھی اسے ساری زندگی سوہنی کے کچے گھڑے کی سوندھی مہک تنگ کرتی رہتی ہے.. وہ چناب میں کبھی نہ اترا.. لیکن جھیل جنیوا، ونڈر میر اور جھیل کرومبر میں تو اترا..

یہاں لنگر میں جو پوشیدہ ندیاں بہتی تھیں، ان میں اترنے کے لیے یہ دلائل ناکافی تھے کیونکہ میرے پاس سوئمنگ کا سٹیوم نہ تھا.... خاصی دیر بعد ایک اور دلیل میرے ذہن میں آئی... کہ یہاں تو پرائیویسی ہے، کون دیکھتا ہے.. ادھر ادھر احتیاطی نگاہیں دوڑائیں تو واقعی کوئی نہیں دیکھتا تھا..

میں نے اپنا پیراہن کوہ نوردی اتارا اور ندی میں ایک پاؤں رکھا تو وہ اتنی برف تھی کہ مجھے صاف صاف کرچیوں کے ٹوٹنے اور اپنا خون منجمد ہونے کی آوازیں سنائی دیں.. لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا.. چونکہ آج تک کوئی بھی شخص ایک پاؤں رکھ کر ندی میں نہیں نہایا، اس لیے مجبوراً دوسرا پاؤں بھی رکھا اور پھر جان پہ کھیل کر دھڑام سے ایک عمر رسیدہ مگرمچھ کی طرح اس میں گرا اور لیٹ گیا.. اور پھر ایک بے اختیار نعرۂ یاہو لگا کر اٹھا اور پھر بیٹھ گیا.. تھوڑی دیر بعد پانی قابل برداشت ہونے لگا اور میں

پھر ایک مگرمچھ کی طرح اس میں لوٹنیاں لگانے لگا..

"ابو.." ایک آواز اس نازک لمحے میں آئی جب میں بالکل قدرتی حالت میں اب ایک لُدھڑ کی طرحِ شڑاپ شڑاپ پہلو بدلتا اشنان کرتا تھا..

"کیا ہے؟"

"ابو ادھر نہ آنا.. میں ذرا سوئمنگ کر رہا ہوں.. ادھر نہ آنا۔" اور یہ سلجوق کی آواز تھی۔

"تم بھی ادھر نہ آنا بچے۔"

"اور ابو.." کہیں سے سمیر کی پکار مجھ تک پہنچی۔ "ادھر تو بالکل نہ آنا.. میں بھی ذرا نہانا کر رہا ہوں۔"

سمیر جب چھوٹا تھا اور ابھی کیمل کِڈ نہیں ہوا تھا تو اس کی ماں اسے ایک جانگیہ پہنا کر کہتی تھی "بیٹے نہانا کرنا؟" اور وہ ایک نہائت چٹے گورے اور کلیساؤں کے آلٹر کے اوپر سے جھانکنے والے خوبصورت فرشتوں کی طرح.. اپنے گل گوتھنے بازو سینے پر مار کر کہا کرتا تھا "میں نہانا کرنا".. اور جونہی پانی کا پہلا ڈونگا اس کے سر پر انڈیلا جاتا تو وہ شور مچا دیتا تھا "نہانا نہیں کرنا۔"

تو اب ہم تینوں باپ بیٹے لنگر کی جھاڑیوں میں پوشیدہ اپنی اپنی پرائیویٹ ندی میں "نہانا" کر رہے تھے۔

میمونہ اور عینی کی لڈو گیم کا اختتام ہوا تو انہوں نے ہمیں غائب پا کر غازی سے اپنی تشویش کا اظہار کیا.. اور وہ بے دریغ ان تینوں سپاٹس پر پہنچ گیا جہاں ہم اپنا اپنا "نہانا" کر رہے تھے.. ہم نے باری باری اسے اوجھل ہو جانے کو کہا اور نچڑتے ہوئے اپنے اپنے پیراہنوں میں ہو گئے..

شائد یہ واہمہ ہو گا لیکن لنگر کی اس ندی میں نہاتے ہوئے بار بار مجھے احساس ہوا کہ کوئی مچھلی مجھے چھو کر گزر گئی ہے.. اور اگر واقعی کوئی مچھلی مجھے چھو کر گزری تھی تو انسانی بدن کے تناسب کے بارے میں وہ بے حد مایوس ہوئی ہو گی..

غازی جیپ کا ہارن بجانے لگا..

پچھلی نشست پر لنگر کی تین مچھلیاں پڑی تھیں..

"ڈھلتی دوپہر میں درّہ شندور کا آتش کدہ"

سفر پھر شروع ہو گیا..

لنگر سے آگے نامعلوم سی چڑھائی شروع ہو گئی اور برابر میں ایک ایسی ندی آ گئی جس کے کناروں کے ساتھ ساتھ بے انت زرد پھول گھاس میں طلوع ہوتے سورجوں کے انبار تھے.. ٹھنڈک بڑھ گئی.. ہمارے بدن بھیگے ہوئے تھے اس لیے ٹھنڈک اور بھی بڑھ گئی.. دوپہر ڈھل رہی تھی۔ ندی کے کنارے گھاس پر سر جھکائے چند مویشی بالکل ساکت لگ رہے تھے.. اور ان کے اوپر برف کی بے شمار ریکھائیں اترتی تھیں اور ندی کے پانیوں میں ان کی سفیدی اور پھولوں کی زردی کروٹیں بدلتی دکھائی دیتی تھی...

ہماری جیپ اس ندی کے ساتھ کچی روڈ پر نہائت آرام سے چلی جا رہی تھی..

ہم درہ شندور تک پہنچنے کے لیے ذہنی طور پر ایک نہائت پُر خطر اور پُر پیچ چڑھائی کے لیے تیار ہو چکے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ کب ہماری جیپیں اپنی ناکیں اوپر کر کے انجن پر پورا پُر شور دباؤ ڈالیں گی..

"ابو..." عینی نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "غازی سے کہیں جیپ روک لے۔"

"کیوں؟"

"اس ندی میں مچھلیاں ہوں گی.. میں فشنگ کرنا چاہتی ہوں۔"

"بیٹے آپ نے فشنگ کرنی تھی تو لنگر میں کر لیتے.."

"وہاں سمیر بھائی نے کچھ پکڑا ہے جو میں فشنگ کرتی.."

"میرا خیال ہے اس ندی میں مچھلیاں نہیں ہو سکتیں.. یہ تو برفوں سے نیچے آ رہی ہے۔"

"نہ ہوں مچھلیاں.. فشنگ کے لیے مچھلیوں کا ہونا ضروری نہیں.. یہ تو دماغ کی ایک کیفیت ہے—"

یہ عجیب منطق تھی.. لیکن چونکہ عینی کی پیش کردہ تھی، اس لیے اسے قبول کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ "غازی بریک لگا دیا۔"

جیپ کے رکتے ہی عینی چھلانگ لگا کر باہر کودی اور فشنگ راڈ تھامے درّہ شندور کی کچی سڑک کے ساتھ اس پُرسکون ندی کے کنارے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی جس کے پانیوں میں زرد پھولوں اور برف ریکھاؤں کی کروٹیں تھیں..

"بیٹے فشنگ راڈ آپ نے کاندھے پر رکھا ہوا ہے.. اب اس پوز میں تو مچھلیاں نہیں پکڑی جاتیں.. تم ڈوری کو پانی میں پھینکو گی تو بات بنے گی۔"

"اس پوز میں تصویر تو اتاری جا سکتی ہے ناں ابو جان.. میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ فشنگ ایک دماغی کیفیت کا نام ہے اور میں اب اس کیفیت میں ہوں.. میں مچھلیاں نہیں پکڑنا چاہتی.. صرف اس فشنگ راڈ کے ساتھ اس پیاری سی ندی کے کنارے.. ایک تصویر اتروانا چاہتی ہوں۔"

"بہت اچھے بھئی بہت اچھے.." میں نے ہنس کر کہا اور اپنی لاڈو رانی کی ایک تصویر فشنگ راڈ سمیت... جیسے وہ ابھی ابھی درجن بھر ٹراؤٹ مچھلیاں شکار کر چکی ہے، اتاری.. اور سفر پھر سے شروع ہوا..

سفر ابھی باقاعدہ شروع نہ ہوا تھا.. کوئی پُرپیچ راستہ نہ آیا، نہ کوئی گہرائی، نہ کوئی کھڈ اور نہ کوئی گلیشیر.. تقریباً ہموار راستہ تھا۔ جب ندی سے ہم الگ ہوئے تو آس پاس کی بلندیاں پرے ہوتی گئیں اور ہم ایک گھاس بھرے وسیع میدان میں حرکت کرتے گئے.. منظر کھلنے لگا.. ایسا کھلا کہ ہم حیرت میں چلے گئے کہ کہیں ہم پنجاب کے میدانوں میں تو نہیں چلے گئے..

ہم ذرا اونچے ہو کر پھر کچی سڑک پر آ گئے..

ایک جھیل نظر آنے لگی..

پہلے وہ سورج کی آخری کرنوں میں لشکتی ایک پگھلے ہوئے لوہے کی لکیر تھی.. یہ لکیر پھیلتی گئی اور اس کی جانب دیکھا نہ جاتا تھا.. وہ افق کی حدوں کو چھونے جاتی تھی اور وسیع ہوتی چلی جاتی تھی۔ وہ ایک سمندر ہو رہی تھی جس پر کسی نے پٹرول چھڑک کر اسے آگ لگا دی تھی۔ وہ اتنی بھڑکتی ہوئی روشنی والی تھی..

یہ جھیل ایسی تھی کہ اس کے کناروں پر دور تک خشک اور سنہری گھاس تھی.. جہاں کہیں اس کا کوئی کنارا تھا، وہاں نیلگوں پہاڑ تھے جن کے نشیب برفوں سے بھرے ہوئے تھے..

ایک ابر آلود آسمان تھا اور ایک ڈھلتی ہوئی دوپہر تھی اور سورج جیسے اس ابر کی آمیزش والے آسمان سے ہٹ کر کہیں اور روشن تھا..

ہماری جیپوں کے گھوڑے دھول اڑاتے سرپٹ دوڑتے چلے جا رہے تھے..

غازی نے یکدم جیپ روک دی..

"شندور کیسا ہے صاحب؟" اس نے کہا۔

"کہاں؟"

"جہاں تک آپ دیکھتے ہو صاحب.. وہاں تک.."

"یہ شندور ہے؟"

"ہاں صاحب.."

اور یہ زبردست اینٹی کلائمکس تھا.. منظر کے حوالے سے نہیں.. پہنچ کے حوالے سے..

ہم اتنی آسانی سے... جیسے چولستان کے صحرا میں ہموار سفر کرتے ہوں.. ایسے شندور ٹاپ پر پہنچ گئے تھے..

اپنی کوہ نوردیوں میں، میں بہت سے درّوں تک پہنچا تھا..

اور ہمیشہ مشکل سے پہنچا تھا.. ایک پُرمشقت اذیت اور شدید چڑھائی کے بعد ہی پہنچا تھا.. یہ سوئٹزرلینڈ کا درہ سینٹ گوتھارڈ ہو یا اپنا درّہ خنجراب..

لیکن یہاں عجیب سانحہ ہو گیا تھا..

یہاں معاملہ جدا ہو گیا تھا..

ہم ذہنی طور پر وہاں پہنچنے کے لیے تیار نہ تھے کہ وہاں پہنچ گئے..

ایک ایسا وسیع بے انت گھاس بھرا میدان جیسے روسی گھاس کے میدان شولوخوف کے ناولوں میں پھیلتے ہیں، ایسے وہاں تک جہاں کہیں افق ہوگا.. ایک ایسی سلطنت جس میں دور تک.. جہاں تک نظر سفر کرتی ہے، صرف اور صرف خزاں رسیدگی میں ڈھلی ہوئی سنہری گھاس تھی.. اور وہ جھیل تھی جو سمندر تھی.. اور جو سمندر تھا وہ ایران کے آتش کدوں کی طرح روشن تھا.. اس پر برف لبادے اترتے تھے اور ایک ایسی خنکی تھی جو بدن میں اپنی سرد کسمساہٹ سے اترتی تھی اور کہتی تھی کہ میں صرف بارہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند درّوں پر ہی قیام کرتی ہوں۔

ہم اپنی چاند گاڑی سے اتر کر چاند پر گھومنے لگے..

ہم کسی اور سیارے سے آئے تھے.. اپنی اڑن طشتری کی سیڑھی سے نیچے اترے..

ہم اپنی جیپوں سے اترے اور سنہری گھاس کے میدان میں جھیل کے روشن آتش کدے کی جانب چلنے لگے.. ایران کے آتش کدے کب کے بجھ چکے تھے.. شیراز کے قریب ایک بلند پہاڑ پر اب بھی ایک ایسے آتش کدے کے کھنڈر ہیں جو دو ہزار برس پیشتر روشن ہوا تھا اور اب وہاں.. اس کی قدیم ساخت پر صرف دھوئیں کی سیاہی باقی تھی.. لیکن یہاں آتش کدۂ شندور روشن تھا..

ہم پارسی ہوتے تو اس کو سجدے کرتے آگے بڑھتے..

جھیل آگئی.. ہم رنگین روحوں کی طرح.. جھیل کے چمکتے پارے کی کشش میں مبتلا.. اس بلندی پر.. آکسیجن سے تقریباً عاری ہوا میں.. برف کی قربت میں ہو گئے.. ایک انجماد کی قربت میں جو موسم ٹھہرا ہوا تھا، اس کے کناروں پر گھومنے لگے..

رنگین روحیں اس لیے کہ... سلجوق، نیلی جین اور گہری نیلگوں ٹی شرٹ میں... عینی پھولدار لباس میں.. میمونہ کے پیراہن میں نیلاہٹ بہت تھی.. سمیر زرد قمیض میں.. اور میں ایک سفید سمور کی ٹوپی میں.. ایک نیلی شلوار قمیض اور خاکی افغان جیکٹ میں..

ہم سب نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا کہ ہم درہ شندور کی جھیل، برفوں اور گھاس سے میچ کرتے ہوئے لباس زیب تن کریں..

ہماری جیپیں سبز رنگ کی.. کچی سڑک پر الگ بہت دور... کھلونوں کی طرح ساکت کھڑی تھیں..

ہم نے اہتمام تو نہیں کیا تھا لیکن ہم شندور کے رنگوں سے میچ کر گئے تھے..

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے دنیا بھر کے جتنے درّے دیکھے تھے.. جن جھیلوں تک پہنچا تھا.. میں انہیں بھول گیا تھا.. اور جب ایرانی انقلاب کی کامیابی کے بعد امام خمینی نے اپنے سامنے عوام کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو ان کے احترام میں سرنگوں دیکھا تو انہوں نے صرف ایک لفظ کہا..

"ہیچ... ہیچ..."

تو دنیا کے سب درّے اور جھیلیں.. درہ شندور کے سامنے.. ہمیشہ نہیں.. صرف اس لمحے جب ہم وہاں پہنچے تھے.. وہ سب کے سب.. ہیچ.. ہیچ...

درہ شندور پر اگرچہ ہر برس... گھوڑے دوڑتے ہیں.. پولو میچ منعقد ہوتے ہیں، اسے بے توقیر کرتے ہیں.. بہت دنیا اور ہجوم ادھر پہنچ کر اس کے حُسن کو مجروح کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود جب ہم وہاں پہنچے تو اس کی ویران وسعت تھی اور ہم تھے اور کوئی نہ تھا.. سنہری گھاس کی سرد پژمردگی تھی اور اس کے درمیان ایک کچی سڑک کا گھاؤ تھا.. دور دور تک برفیں تھیں اور جھیل، ایک آتش کدے کی طرح روشن تھی.. اور کچھ نہ تھا..

"صاحب.." غازی نے ہمیں رنگین روحوں کی طرح سنہری گھاس کناروں پر ایک دوسرے سے الگ الگ.. سلگتی جھیل کے کناروں پر... اس کی روشنی میں اپنے چہرے گلنار کرتے.. بھٹکتے.. اور بہت دیر تک بھٹکتے دیکھا تو ایک جمائی لے کر کہا "صاحب آگے ایک اور جھیل بھی ہے.. چلیں؟"

"تم جاؤ.. ہم نہیں جاتے.."

"نہیں جاتے تو ادھر رات ہو جائے گی۔" اس نے بیزار ہو کر کہا..

ہم نہیں جانتے کہ زرتشت نے کیا کہا تھا.. آہورا مزدا کے کیا احکام تھے کہ تم مقدس آگ کی پرستش کیسے کرو گے.. لیکن ہم یہ جانتے تھے کہ ہم اگر تھوڑی دیر اور یہاں رکتے ہیں تو اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالتے ہیں اور آتش پرست ہوتے ہیں..

اگرچہ یہ جھیل آتش اب مدھم پڑتی جاتی تھی کیونکہ سورج ڈھل رہا تھا..

"آجاؤ صاحب.. آگے ایک اور جھیل ہے۔"

ہم بجھے ہوئے جیپ میں سوار ہوئے..

شندور کے وسیع... دنیا کے بلند ترین پولو گراؤنڈ میں.. اگرچہ میں نے کئی برس بعد پامیر اور ہندوکش کے درمیان وادیٔ سونج میں اس سے بھی کہیں بلند پولو میدان دیکھا تھا.. لیکن فی الحال دنیا کے بلند ترین پولو میدان میں ہم تھے.. اور ہماری دو جیپیں بھاگتی تھیں۔

پچھلا پہر.. شام میں ڈھل رہا تھا۔

ہم شندور کی بلندی کو اپنے رگ و پے میں سرایت کرتے ہوئے محسوس کر رہے تھے..

ایک کوہ نورد نے بہت کچھ سن رکھا ہوتا ہے.. پڑھ رکھا ہوتا ہے..

دوسرے کوہ نوردوں سے سن رکھا ہوتا ہے.. اور کتابوں میں پڑھ رکھا ہوتا ہے..

بہت سی شہرتیں ہوتی ہیں کہ راما جھیل دنیا کی سب سے پرکشش جھیل ہے اور جب آپ استور سے وہاں پہنچتے ہیں.. تو وہ صرف پانیوں کا ایک ذخیرہ ہوتی ہے۔ کرسمس کے دنوں میں گرنڈل والڈ کا قصبہ برف میں روپوش ایک سفید سحر ہوتا ہے اور جب آپ وہاں جاتے ہیں تو وہاں.. سوائے شوقیہ امریکی سیاحوں کے اور جتنی رقم آپ ایک ہفتے کے لیے لائے ہیں، وہ ایک دن میں خرچ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا..

جب آپ ورڈز ورتھ کی لائنوں سے مسحور ہو کر اس مقام تک پہنچتے ہیں جہاں نرگس کے ہزاروں پھول جھیل ونڈر میر کے کناروں پر جھولتے تھے تو وہاں صرف کیچڑ ہوتا ہے اور پانی گدلے اور بے رنگ ہوتے ہیں۔

ایک سیاح.. ایک کوہ نورد نے بہت کچھ سن رکھا ہوتا ہے..

لیکن.. میں نے درہ شندور کے بارے میں جو کچھ سنا تھا.. کتابوں میں جو کچھ رقم تھا، وہ سب کا سب سچ تھا... سچ تھا..

شاید یہ درست کہ جانے تو نے اسے کس آن میں دیکھا... کہ میں نے اسے

جب دیکھا تو کسی اور آن میں دیکھا.. اور اس آن میں اسے بیان کرنا ممکن نہیں ہے..

مجھے شندور ایک ایسا جزیرہ لگا جو صرف دیومالا میں وجود رکھتا ہے.. وہ ہے نہیں پر اس کے قصے بیان ہوتے ہیں..

وہ لوگ جو ایک ریوڑ کی صورت دنیا کی بلند ترین پولو گراؤنڈ پر گھوڑوں کی بھگدڑ اور تماشائیوں کے جم غفیر کو دیکھنے آتے ہیں.. وہ اسے نہیں دیکھتے.. مونالیزا پر اگر گھوڑے دوڑتے ہوں، خیمے لگے ہوں اور اہم شخصیات ہیلی کاپٹروں سے اتر رہی ہوں تو.. کیا وہ دکھائی دے گی..

جب ہجوم چھٹ جاتا ہے.. گھوڑے چلے جاتے ہیں.. تب شندور وجود میں آتا ہے..

برفوں کی یکتائی میں.. ایک اور جھیل کے کنارے سنہری گھاس کی زردی سے سبز جیپیں زرد ہوتی پانیوں کے ساتھ ساتھ...

”شندور ہٹ.. ایک سومنات جس میں شُودر داخل ہو گئے تھے“

شام قریب ہوتی تھی..

وہ سردی جو دیوسائی کے میدانوں میں ایک سیاہ موت کی طرح سفید برفوں سے اترتی ہے.. وہ ہم یہاں محسوس کرتے تھے..

اس ایک اور جھیل کی قربت میں.. کچے راستے سے ذرا ہٹ کر.. پانیوں کی جھالر کے قریب.. بے انت میدان میں تنہا.. ایک جھونپڑا دکھائی دیا.. اور یہ ”شندور ہٹ“ تھا..

ہماری جیپیں جب اس کے چوبی در و دیوار پر دستک دیتی ہوئی تھم گئیں تو جو اس کا نگہبان تھا، وہ باہر آ گیا..

”ادھر آپ لوگ چائے نہیں پی سکتا۔“ اس نے کمال کے تکبر سے کہا..

”ہم ادھر چائے پینے نہیں آیا..“

”تو کیا کرنے آیا ہے؟“

”ادھر ٹھہرنے آیا ہے.. رات کرے گا۔“

”بکنگ ہے؟“

”تم اپنے رجسٹر میں جا کر چیک کرو کہ بکنگ ہے یا نہیں۔“

وہ ایک رائلٹی اور وی آئی پی کلچر کا سدھایا ہوا.. اندر گیا.. اور پھر باہر آ گیا..

اس کے ہاتھوں میں ایک کاپی تھی جسے وہ اٹک اٹک کر پڑھنے لگا۔ ”تم.. یہ.. کیا لکھا ہے؟ مشکل سا لکھا ہے.. یہ من تصر... تارڑ.. یہ کون ہے؟“

”یہ میں ہوں——“

”تو پھر اندر آ جاؤ صاحب.. باہر کیا کرتا ہے.. آپ کا تو بکنگ ہے اور منسٹر صاحب کا حکم کے مطابق ہے۔“

”شندور ہٹ“ کے اندر نہ شندور تھا، نہ اس کی برفانی اونچائی تھی اور نہ جھیلیں تھیں.. ایسے بیڈ روم تھے جو اسلام آباد کے کسی بھی گیسٹ ہاؤس کے ہو سکتے تھے.. باتھ روم تھے جن کے کموڈ اگرچہ بیٹھنے پر مزید سرد ہوتے تھے لیکن ان کے فلش ایک پہاڑی ندی کی طرح شاں شاں چلتے تھے.. ڈیکور میں شوخی اور شاہانہ پن تھا۔ حسن جمال نہ تھی اور کچھ ناکافی صفائی کی کچھ بُو تھی.. ہم اس میں گھومتے ہوئے کچھ دیہاتی سے محسوس کر رہے تھے..

”شندور ہٹ“ کے تفصیلی ملاحظے کے بعد ہم اس کے پرشکوہ اور پاش ڈرائنگ کم ڈائننگ روم میں براجمان ہو گئے..

اس جھونپڑے کا نگہبان اپنے دو مددگاروں کو حرکت میں لے آیا اور میز پر چائے کا سامان سجا اور بسکٹوں کے ڈبے کھل گئے..

ہم نے چائے سُڑکتے ہوئے.. جو ہر سُڑکی کے ساتھ ٹھنڈی ٹھار ہوتی چلی جاتی تھی.. شندور ہٹ کے بیڈ رومز کو اپنے قیام کے لیے موزوں قرار دیا.. اگرچہ کمبل کچھ میلے اور گندے سے تھے لیکن ایسے ویرانوں میں ایسی پُر آسائش رہائش گاہ کسے نصیب ہوتی تھی اور اس کے باوجود ہم قدرے بے آرام اور ناآسودہ محسوس کرتے تھے.. ویرانوں میں اتنی آسائش انسان کا اخلاق کوہ نوردی برباد کر دیتی ہے.. وہ بزدل ہو جاتا ہے اور آرام طلب ہو جاتا ہے.. باہر کے منظر کو بھلا کر فوم کے گدوں اور سائیڈ لیمپ کو انجوائے کرنے لگتا ہے.. اور اس کے باوجود انکار نہیں کر سکتا..

چائے سے فارغ ہوئے تو نگہبان صاحب ایک بھاری رجسٹر دونوں ہاتھوں پر رکھے کسی آسمانی صحیفے کی طرح.. میرے پاس آئے.. اسے انتہائی احتیاط سے میز پر رکھا اور کہنے لگے ”صاحب ویسے آپ کون ہیں؟“

میں نے اپنا نام بتایا..

”صاحب یہ تو بکنگ میں لکھا ہے.. لیکن آپ ویسے کون ہیں؟“

"میرے ابّو ہیں —" سلجوق نے ناگواری سے کہا۔ "تم نہیں جانتے؟"

"نہیں صاحب.." اس نے نہایت سرکاری مگر مؤدب لہجے میں کہا "کیونکہ ادھر تو ہمیشہ بڑا لوگ ٹھہرتا ہے.. آپ جیسا لوگ نہیں آتا.. ادھر رجسٹر میں ذرا دیکھو۔" اس نے اس آسمانی صحیفے کو کسی پروہت کے پرتقدس انداز میں کھولا۔ "ادھر تو جنرل ضیاء الحق کا دستخط ہے.. بے نظیر ادھر آیا تھا. عمران خان اور مرزا اسلم بیگ ادھر ٹھہرا تھا.. وزیر سفیر تو درجنوں آیا ہے.. اور صاحب لیڈی ڈیانا بھی ادھر آیا تھا.."

"لیڈی ڈیانا.." سب نے یکدم چونک کر کہا۔ "وہ ادھر آئی تھی۔"

"ہاں صاحب، ادھر رجسٹر پر دیکھو.. شندور کے بارے میں اس کا سٹیٹ منٹ ہے اور ادھر دستخط ہے.. چائے ہمارے ہاتھ کا پیتا تھا.. اس کا بال گھاس جیسا تھا۔ ذرا سنہرے رنگ کا.. جیسا گھاس شندور ٹاپ پر پھیلتا ہے.. پر وہ بہت لمبا تڑنگا تھا یار.. لوگ کہتے ہیں کہ اس نے انگلینڈ کی بادشاہت چھوڑ دی ہے.. ہاں مجھے اس کے بالوں کا رنگ یاد ہے.. ایسا تھا جیسے شندور کا گھاس ہوتا ہے۔" نگہبان لیڈی ڈیانا کے لیے بے حد رومینٹک ہو گیا.. ویسے ڈیانا چترال تو آئی تھی یہ میرے علم میں تھا لیکن شندور... شائد یہ نگہبان کا خواب تھا۔

"کھانے کا کیا بندوبست ہے؟"

"ادھر ابھی تو کچھ نہیں ہے صاحب.. لیکن آپ منسٹر کا گیسٹ ہے تو ادھر نیچے جائے گا چترال کی طرف، سرلاس پور میں اور کوئی مرغی ورغی دیکھے گا.."

باہر دھوپ ڈھلتی تھی اور اس کے ساتھ ایک ایسی سُن کر دینے والی سردی ڈھلتی تھی جو ڈھلتی عمر کے بدن کو ڈھاتی چلی جاتی ہے.. درجہ حرارت صفر کی قربت میں تھا..

"آتش دان کے لیے لکڑیاں اور کوئلہ وغیرہ تو ہوں گے؟"

"نہیں صاحب.."

"رات کو ادھر سردی تو ہوتا ہوگا ناں چوکیدار صاحب؟"

"ہوتا ہے.. تھوڑا زیادہ ہوتا ہے.. جھیل کا کنارہ جم جاتا ہے اور گھاس اکڑ کر کانٹا

ہو جاتا ہے.. بارہ ہزار فٹ سے زیادہ ادھر اونچائی ہو گیا ہے تو.. سردی تھوڑا زیادہ پڑتا ہے۔"

"تو بھائی میرے رات کو آگ جلانے کے لیے لکڑی یا کوئلے وغیرہ کا تو بندوبست ہونا چاہیے کہ نہیں.."

"ہونا تو چاہیے.. آگ کے بغیر تو ادھر ہٹ کے اندر بھی برف ہوگا.."

"تو پھر.."

"ادھر نیچے جائے گا سرلاس پور میں تو مرغی ورغی کے ساتھ کوئی لکڑی وکڑی ملا تو لے آئے گا.."

دراصل شندور ہٹ کا یہ رکھوالا بینظیر، ضیاء الحق اور شہزادی ڈیانا کے بعد ہم سے متاثر ہونے سے انکاری تھا اور اسے ہمیں سرو کرتے ہوئے ہتکی سی محسوس ہو رہی تھی.. بلکہ ہم اس کے لیے وہ شودر تھے جو چوری چھپے سومنات کے مندر میں داخل ہو گئے تھے اور ہم نے اس پوِتر عبادت گاہ کو ناپاک کر دیا تھا.. اس نے منسٹر کی بکنگ کی وجہ سے ہمیں قبول تو کر لیا تھا لیکن اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا کہ مجھ پر یہ دن بھی آنے تھے کہ میں بے نظیر اور ڈیانا کے بعد ان معمولی انسانوں کے سامنے کورنش بجا لاؤں.. اس نے جو تھوڑی بہت تعظیم ہمیں دی یعنی بولنے کا روادار ہوا تو صرف اس لیے کہ غازی نے اسے بتایا تھا کہ ہم ایک جنرل صاحب کے مہمان بھی ہیں..

"آپ ادھر رجسٹر پر کچھ لکھنا چاہتے ہو تو لکھو.. سب مہمان لکھتا ہے۔" اس نے باول نخواستہ رجسٹر میرے سامنے رکھ دیا.. میں نے پاکستان کی اہم شخصیات کے تاثرات بغور پڑھے اور چونکہ وہ سب بہت اہم شخصیات تھیں، اس لیے ان کی زبان انگریزی تھی.. میں نے بقلم خود اردو اور پنجابی میں درّہ شندور کی توصیف کی اور اس عجز کا اظہار بھی کیا کہ بندہ بے حد شرمندہ ہے کہ پورے رجسٹر میں صرف اس کے تاثرات دیسی زبانوں میں ہیں۔ اس لیے کہ وہ انگریزی سے نابلد ہے.. میرے دستخط کرنے کے بعد بچہ لوگ نے فوری طور پر شندور میں اپنی موجودگی رجسٹر کرنے کی غرض سے اپنے نام درج کیے..

نگہبان کی نظروں میں میرے لیے جو تھوڑا بہت وقار تھا، مجھے اردو میں لکھتے

ہوئے دیکھ کر وہ بھی زائل ہو گیا..

ہم چائے سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم سے اٹھے اور ایک مرتبہ پھر اپنے رائل بیڈ روم کو دیکھا لیکن اس مرتبہ کسی اور نظر سے دیکھا.. ہم نے چشم تصور میں ان نامور شخصیات کو دیکھا جو یہاں قدم رنجہ فرما چکی تھیں.. غسل خانوں کے کموڈوں کو بھی ایک گہرے تاریخی شعور کی سنجیدگی سے دیکھا کہ ان پر کون کون، کیسے کیسے بیٹھا ہو گا یا بیٹھی ہو گی.. بے نظیر۔ ضیاء الحق اور اسلم بیگ کے "بیٹھنے" کو ہم نے اپنی چشم تصور میں زیادہ وقت نہ دیا البتہ لیڈی ڈیانا کو ہم نے تادیر بٹھائے رکھا..

پھر ہم نے ان ڈبل بیڈز کو بھی نہایت عقیدت سے دیکھا جن پر ان شخصیات نے خراٹے لئے ہوں گے..

بے نظیر نے سونے سے قبل احتیاط سے اپنے کانٹیکٹ لینز اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے محلول میں ڈبو کر سنبھالے ہوں گے.. جبکہ آصف زرداری فی الحال اپنی مونچھیں سنوار رہے ہوں گے.. ضیاء الحق نے بھی یقیناً سوتے وقت اپنی قیمتی بتیسی نکال کر اسی سائیڈ ٹیبل پر کسی نہ کسی مارشل لائی حکم کے تحت اور اسلام کے زریں اصولوں کی تابناکی کی خاطر رکھی ہو گی... یقیناً ان کی بیگم کے لیے ایک الگ بیڈ ہوتا ہو گا..

اور لیڈی ڈیانا نے... یہاں میری چشم تصور اتنی دور تک گئی کہ اسے بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر واپس لانا پڑا کہ کہیں وہ حدود آرڈیننس کی زد میں نہ آ جائے ..

سردی لحہ بہ لحہ یوں بڑھتی تھی کہ ہمیں شندور ہٹ میں چلتے ہوئے ایسے لگتا تھا جیسے اس کے اندر کی ہوا بھی ایک برف کی باریک چادر میں بدلتی جا رہی ہے اور ہم حرکت کرتے ہیں تو وہ ٹوٹتی ہے اور اس کی کرچیاں ہمارے بدن میں اترتی ہیں..

ہم واپس ڈائننگ ٹیبل پر آئے اور نگہبان نے مزید چائے کا بندوبست کر رکھا تھا.. اور چائے فلاسک میں سے کپ میں جاتی تھی تو بھاپ چھوڑتی تھی اور جب اسی کپ کو فوراً لبوں سے لگاتے تھے وہ برف ہو رہی ہوتی تھی..

"ہائے—" یکدم میمونہ نے ایک ہلکی سی چیخ ماری..

میں نروس ہو گیا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"ذرا اس سٹیل کی میز کو ہاتھ لگا کر دیکھو.."

اس سٹیل کی میز پر ایک میز پوش بچھا ہوا تھا جس پر چائے کے برتن اور بسکٹوں کی پلیٹیں تھیں لیکن اس کا ایک کونہ میز پوش کے سمٹنے کی وجہ سے ننگا ہو رہا تھا۔ میمونہ اسی کونے کی جانب ایک ایسی خوفزدہ عورت کی طرح اشارہ کر رہی تھی جیسے اس نے وہاں کسی زہریلے بچھو کو رینگتے دیکھ لیا ہو..

میں نے اس کے کہنے کے مطابق سٹیل کی میز کے اس حصے کو ہاتھ لگایا.. اور شاید کوئی بھی یقین نہ کرے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُسے چھوتے ہی میرے بدن میں پتہ نہیں کتنے ہزار میگاواٹ کا کرنٹ دوڑنے لگا.. وہ اتنا سرد تھا کہ اُسے چھونے والی انگلیوں کا ماس اُس پر چپک سکتا تھا..

"ابھی ساڑھے چار بجے ہیں اور ادھر یہ حال ہے تو رات کو کیا حال ہو گا؟"

میمونہ اپنے کٹے ہوئے بالوں کو جھٹک کر بولی۔ "ادھر سے فوراً نکلو۔"

"لیکن مونا بیگم... شندور ہٹ کی بکنگ کسی کسی خوش نصیب کو ملتی ہے.. ذرا تصور میں لاؤ کہ درہ شندور میں چاندنی رات کا کیا سماں ہو گا.. ذرا تصور میں لاؤ۔"

"اور تم ذرا تصور کرو کہ اگر لکڑی دستیاب نہ ہوئی تو یہ کمرے کتنے سرد ہوں گے.. غسل خانوں کے کموڈ کتنے برف ہوں گے.. ان پر بیٹھ کر اٹھو گے تو تشریف وہیں رہ جائے گی اور بستر کتنے یخ اور اکڑے ہوئے ہوں گے.."

"تو تم اس تاریخی بستر میں نہیں سونا چاہتی جس میں لیڈی ڈیانا نے استراحت فرمائی تھی؟"

"شہزادی ہے پر ہے تو میم ناں.." میمونہ نے ناک چڑھا کر ایک راجپوتی نخوت سے کہا۔ "وہ بھی نہاتی نہیں ہو گی اس اطالوی میم کی طرح.. اور ٹائلٹ پیپر ہی استعمال کرتی ہو گی.. تو میں سوتی ہوں ایسے بیڈ میں.. اور شاید اسی بستر میں ضیاء الحق بھی سویا ہو.. ذرا تصور کرو۔"

"کیا تصور کرو؟"

"ان بستروں پر ایسے ایسے لوگ سوئے ہیں جنہوں نے پاکستان کو برباد کر کے رکھ دیا.. ان میں سونے سے اگر ہم پر ان کا تھوڑا سا اثر ہو گیا تو.. میں کہتی ہوں یہاں سے فوراً نکل چلو... منحوس جگہ ہے۔"

میمونہ کے اندازے ہمیشہ کی طرح درست تھے.. شندور ٹاپ کی رات میں بے شک آپ ڈیانا کے بستر میں ملفوف ہوں لیکن سردی تو رائلٹی کی ایک زمانے میں موجودگی کا لحاظ نہیں کرے گی.. بے شک اس بستر کے کسی کمبل پر پرنسس رائل کا ایک آدھ بال بھی رہ گیا ہو لیکن سردی یہ تو نہیں دیکھے گی کہ یہ بال درہ شندور پر پھیلے میدان کی سنہری گھاس کے رنگ کا ہے.. سردی تو اترے گی.. وہ اپنا رنگ دکھائے گی۔

"واقعی چلنا ہے؟"

"ہاں—" میمونہ نے سر ہلا کر کہا "بچے بھی ساتھ ہیں، ادھر سے نکل چلو۔"

میں نے چوکیدار کو چائے کے بل کی ادائیگی کی۔ کچھ رقم نذر کی تاکہ ہمارا وقار کچھ تو بحال ہو اور پھر "تھینک یو ویری مچ" کہہ کر رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔

اس کا منہ کھل گیا۔ "کدھر جاتا ہے صاحب؟"

"درہ شندور سے نیچے اترے گا.. جدھر کم سردی ہوگا، ادھر رات کرے گا۔"

"لیکن صاحب آپ ہٹ کی بکنگ چھوڑتا ہے۔" وہ بے حد بے عزتی محسوس کر رہا تھا۔ "ادھر سردی تو ہوتا ہے لیکن ہم لکڑی لائے گا۔ آگ جلائے گا.. ادھر آج تک سردی سے کوئی نہیں مرا.. آپ بھی زندہ رہے گا انشاءاللہ.."

"ہم جاتا ہے—" میمونہ نے اسے جھڑک کر کہا..

"لیکن بیگم صاحبہ.. ادھر شندور ہٹ میں تو بکنگ بڑا لوگ کو ملتا ہے.. آپ جیسے لوگ کو تو نہیں ملتا.. تو کیوں جاتا ہے.. ہم مرغی ورغی لائے گا۔"

میمونہ جلال میں آگئی.. وہ عام طور پر اپنی جلالی کیفیت کو صرف میرے لیے سنبھال کر رکھتی ہے اور پبلک میں نہائت ملنسار اور نرم خو ہوتی ہے لیکن چوکیدار کے بار بار "آپ جیسے لوگ" کہنے پر مکمل طور پر جلال میں آگئی۔ "سنو چوکیدار— میں راجپوت ہوں بہت نجیب الطرفین قسم کی.. اور یہ خاوند جو مجھے مل گیا ہے، جاٹ ہے اگرچہ مخدوش قسم کا.. اور ہم دیگر تمام لوگوں کو کمین سمجھتے ہیں... اور اس میں تمہارے وہ بڑے لوگ بھی شامل ہیں جو اس منحوس جھونپڑے میں ٹھہرتے رہے ہیں.. سمجھ آئی؟"

"آگئی بیگم صاحبہ—" چوکیدار سہم گیا۔

جیپیں پھر سے رواں ہو گئیں..

غازی اور اسلم شندور ہٹ کے برابر میں ایک کمرے میں آسودہ ہو چکے تھے جب انہیں اذن سفر ملا.. اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم اتنی پر آسائش قیام گاہ سے یکدم کیوں کوچ کر رہے ہیں..

"رات کدھر کرے گا صاحب؟" غازی نے پوچھا..

"جدھر رات ہوگا—"

جیپیں پھر سے رواں ہو گئیں..

''درّہ شندور کے سنہری گہنے گُم ہوگئے''

دھوپ ڈھلتی تھی.. شندور ٹاپ سائے میں آرہا تھا..

گھاس سنہری ہونے کے بعد اب کسی پرانے تانبے کے سکّے کی طرح زنگ آلود ہوتی تھی..

برفانی ریکھائیں جھیلوں کے قدم چھونے کے لیے نیچے اترتی تھیں اور مزید برف ہوتی تھیں.. جیپوں کے آہنی بدن سردی سے پتھر ہو رہے تھے۔

ہماری جیپیں ایک کچے راستے پر دھول اڑاتی درّہ شندور کے وسیع میدان میں.. شندور ہٹ سے دور ہوتی تھیں..... ہمیں اب چترال کی جانب اترنا تھا۔

میرے دل میں اداسی ایک بھاری پتھر کی طرح ڈوبنے لگی.. ایسا پتھر جو کسی اتھاہ کنوئیں میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور کبھی اس کی تہہ تک نہیں پہنچتا اور ڈوبتا چلا جاتا ہے..

شندور ایسے درّے کو چھوڑ کر چلے جانا صرف اس لیے کہ وہاں رات میں برف اترے گی، کوئی بات تو نہ تھی۔

ایسے مواقع پھر کہاں نصیب میں ہوتے ہیں.. میں کہاں ان بلندیوں پر دوبارہ آؤں گا.. مجھے بہت قلق ہوا کہ میں سردی سے خوفزدہ ہو کر شندور کی جھیلوں کے کنارے ایک شب گزارنے سے گریز کر گیا..

جیپیں کچی سڑک پر رفتار پکڑ رہی تھیں.. جھیل کے پانی اسی کچی سڑک سے ٹکرا کر پلٹتے تھے اور ان گنت لہروں میں تبدیل ہو کر مجھ سے روٹھے ہوئے دور تک جاتے تھے.... جیپ کے بند شیشوں پر ان کے پانی بار بار دستک دینے کو آتے تھے..

شندور کی برف ریکھائیں ان پانیوں پر تیرتی جیپ کے بند شیشوں تک آتی

تھیں اور جھانک کر چلی جاتی تھیں..

شندور کے گھاس کے میدانوں کے خالص سونے سے ڈھلے تنکے میری جیپ کے شیشوں تک آکر اپنی سنہری انگلیاں ان پر رکھتے تھے کہ تُو کوہ نورد کیسا.. تو جہاں گرد کیسا کہ... تو نہیں جانتا کہ آج کی شب.. جو چاندرات ہوگی، اس میں ہمارے زیور کس طرح لَو دیں گے.. ہمارا سونا سردی کے باوجود کیسے صرف تمہارے لیے جھیلوں کے کنارے اور برفوں کے سائے میں پگھلے گا اور اگر تم میں کوئی رمق خیال آرائی کی ہے، کوئی شائبہ پرواز تخیل کا ہے.. تو ہمارے سونے نے صرف تمہارے لیے پگھلنا تھا اور پھر ایسے ایسے زیور گہنے تخلیق کرنے تھے جو تم اپنی محبوب جھیل کرومبر کو پہنا سکتے تھے.. اور شاہ گوری کے گورے بدن پر اگر شندور کی پگھلتی ہوئی گھاس کے گہنے سجتے تو وہ کیسی لگتی.. یہ سب کچھ تم نے گنوادیا.. یہ آرائش تمہیں مفت میں مل رہی تھی اور تم نے اسے گنوادیا..

سورج کا زرد تھال جھیل کے اندر بجھتا چلا جارہا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ شندور کے یہ میدان اور جھیلیں کبھی ختم نہ ہوں گے۔ ہم ان میں سدا سفر کرتے رہیں گے.. ہم صحرائے اعظم میں یا صحرائے گوبی میں سفر کرتے ہیں.. اور جونہی یہ محسوس ہوا تب یکدم جھیل کے پانی سڑک کناروں سے جدا ہوئے اور دور ہونے لگے.. اور ہم ایک اور عظیم وسعت میں داخل ہوگئے جہاں ایک اور تاحد نظر پھیلاؤ والا میدان تھا جس کے کناروں پر جو نیلگوں بلندیاں تھیں۔ وہ اس کی وسعت سے خوفزدہ ہو کر سمٹ کر دور ہوگئی تھی.. اور سامنے اس میدان میں... ایک جیپ ہے.. ایک طویل کچے راستے پر جو سنہری گھاس میں ایک سفید مانگ کی طرح نمایاں ہو رہا ہے اور اس جیپ میں میرا کراؤن پرنس اور پرنس چارمنگ سوار ہیں اور وہ جیپ نظر نہیں آتی، صرف اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس دھول سے جو کچے راستے پر اٹھتی چلی جاتی ہے.. ایک عظیم پھیلاؤ میں ایک سفید مانگ میں ایک تنہا بگولے کی طرح اٹھتی چلی جاتی ہے..

پھر وہ جیپ یکدم اُس میدان کو خالی کر گئی.. وہاں اب صرف کچا راستہ تھا اور کچھ دھول کے چھٹتے ہوئے بادل تھے۔ جیپ اوجھل ہو چکی تھی۔

اور ہم اس تنہائی کے اندر چلے گئے.. تادیر ایک ہموار سطح پر سفر کرتے رہے اور پھر ڈھلتی دھوپ کی زردی میں، ٹھٹھرتی ہوئی زردی میں غازی نے جیپ روک دی اور کہنے لگا۔ "صاحب.. ذرا نیچے دیکھو۔"

ہم اس عظیم میدان کے کنارے پر رکے ہوئے تھے..

جیسے دنیا گول نہ ہو اور یکدم اس کا کنارا آ گیا ہو..

ہمارے پیچھے درہ شندور کے گھاس بھرے میدان تھے.. اور جہاں غازی نے جیپ روکی تھی.. اس کنارے سے نیچے ایک بل کھاتی ہوئی گہرائی میں گرتی چلی جاتی ایک کچی سڑک تھی اور نیچے اس کی کٹھن گھمیریوں میں مبتلا ہماری دوسری جیپ تھی جو ایک نابینا کی مانند کبھی دائیں مڑتی تھی اور کبھی بائیں جانب چکر کھاتی سنبھلتی گرتی ہوئی نیچے وادی میں اترتی تھی..

لنگر سے شندور ٹاپ پر آتے ہوئے ہم نے درّوں کے جن پُر پیچ راستوں کی بلندی کو مس کیا تھا۔ وہ شندور کے اس جانب تھے.. خطرناک چکر در چکر بھول بھلیوں کے پیچ و خم جو گہرائی سے الجھتے ہوئے نیچے جا رہے تھے.. اور ان میں ہماری دوسری جیپ گھومتی اور بے اختیار لگتی نیچے جا رہی تھی..

"بچوں کی جیپ کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دو۔" میں نے غازی سے کہا..

اور پھر ہماری جیپ بھی شندور کی بلندی سے اتری اور گھومتی ہوئی.. ایک ایسی بھنزی کی طرح جسے دھاگا باندھ کر اڑایا جا رہا ہو.. چکر کاٹتی نیچے ہونے لگی..

کچی سڑک.. دھول اور بے شمار موڑ.. ہر موڑ کے بعد دل بیٹھتا چلا جاتا.. جیسے جیسے جیپ بیٹھتی چلی جاتی..

نیچے بہت نیچے کوئی وادی تھی۔ سبزہ اور کھیت تھے.. کچھ چولہے تھے، کچھ آبادی تھی۔

"سرلاس پور.. "غازی نے ماتھے سے دھول اور پسینہ پونچھتے ہوئے بتایا۔

وادی سوات کی جانب سے کچی کہانی ٹریک کی آزمائش میں سے گزرتے ہوئے آپ اسی قصبے تک پہنچتے تھے..

ایک ندی کے پار ہوئے تو راستہ ہموار ہو گیا..

درہ شندور کے اوراق جن میں جھیلیں اور سنہری گھاس کے میدان نقش تھے۔ قصۂ پارینہ ہو گئے.. سرلاس پور.. لوگ کم تھے اور گھاس زیادہ تھی۔

ہم اس ویران آبادی میں کسی ریسٹ ہاؤس، کسی رہائش گاہ کی آرزو میں بہت بھٹکے..

لیکن.. کسی کو کچھ بھی حسب آرزو نہ ملا.. اور شام ہو رہی تھی..

"آگے چلو.. "میں نے غازی سے کہا۔

"آگے کدھر صاحب.."

"آگے.. مجھے کیا پتہ کہ آگے کدھر.. ادھر رات نہیں کر سکتے تو بس آگے چلو۔"

"صاحب ہم نے بولا تھا کہ رات شندور ہٹ میں کر لو.. "غازی اور اسلم کو ہمارا شندور ہٹ کو تیاگ دینے کا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا.. "اب آگے کیا پتہ رات کرنے کا کوئی جگہ ہے بھی کہ نہیں.... اور چترال شہر تو ادھر سے بہت دور ہے.. رات میں کیسے سفر کرے گا۔"

"یار تم تو مقامی شخص ہو.. تم نہیں جانتے کہ آگے کوئی رات کرنے کا جگہ ہے یا نہیں؟"

"صاحب ہم تو گلگت کا مقامی شخص ہے.. ادھر تو اور ملک ہے.. چترال ہے.. یہاں کا مقامی تو نہیں ہے.. شندور ہٹ..."

"ڈرائیو آن غازی—"

”یور میجسٹی آپ ہر چین میں ہیں.. چترال میں ہیں“

ہماری جیپیں سرلاس پور میں سے نکل کر طائرِ لاہوتی ہو گئیں.. لاپتہ اور گمشدہ ہو گئیں.. کہ ہم نہیں جانتے تھے کہ آگے کیا ہے..

شام مٹیالی ہو کر وادی کی گہرائی میں ٹھہرنے لگی تھی اور اس کے کناروں پر جو سڑک تھی، اس پر ہماری جیپیں روٹھی ہوئی اور ناراض سی چلتی جاتی تھیں..

ہم نے اس گمنامی اور بے مرادی میں زیادہ سفر نہیں کیا تھا۔ جب ہمیں سڑک کے کنارے ایک بورڈ پر ”ہر چین“ کا نام نظر آیا تھا..

میں نے یہ نام سن رکھا تھا.. ہر چین.. کہیں نہ کہیں اس کا ذکر آیا تھا۔ میں نے فوراً اپنے بٹوے میں سے وہ درجن بھر تعارفی کارڈز نکالے جو اسلام آباد سے چلتے ہوئے پرنس محی الدین نے مجھے عنایت کیے تھے اور جن کی پشت پر چترال کے کسی ایک قصبے اور اس قصبے کے کسی ایک صاحب حیثیت شخص کا نام لکھا تھا اور اس کے نیچے ”تارڑ صاحب ہمارا دوست ہے.. ان کا خیال رکھیں“ درج تھا.

ایک کارڈ پر ”ہر چین“ کے قصبے کا نام تھا.. اور کسی صوبیدار صاحب کا حوالہ تھا.. یہ کارڈ ترپ کا پتہ تھا.. لیکن وہ صوبیدار صاحب دستیاب ہوں تو ان کے سامنے یہ پتہ پھینکا جائے.. آس پاس صرف کھیت تھے اور کوئی ویرانی سی ویرانی تھی.. جیپوں کی رفتار آہستہ ہو گئی..

”کسی سے پوچھو غازی..“

”کوئی نظر آئے تو پوچھوں صاحب—“

اور تب اس کچے راستے پر ٹہلتا شام کی سیر کرتا ایک معمّر شخص نظر آیا جس

کی قربت میں ہو کر جیپ نے بریکیں نافذ کر دیں..

”ہیلو....“

دور کہ گیا.. قطعی طور پر لاتعلق اور حیرت ظاہر کیے بغیر وہ رک گیا..

”جناب.. یہ.. ہر چین ہے؟“

”ہے....“ اس نے کہا.

وہاں کچھ باغ تھے، کچھ ہریاول تھی.. اور بہت نیچے ایک دریا گہرائی میں تھا اور اس کے پار ایک دل کش پہاڑ برفوں تک جاتا تھا..

”جناب یہاں.. یہ“ میں نے کارڈ ان کے سامنے کیا۔ ”یہ صوبیدار صاحب... کہاں رہتے ہیں؟“

”وہاں رہتے ہیں..“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اپنی شام کی سیر میں مست ہو کر پھر چلنے لگا.. بلکہ ہم پر واک آؤٹ کر گیا..

ہم وہاں گئے..

سڑک سے ہٹ کر... گھاس کے ایک میدان کے آخر میں ایک نفیس اور ستھری سی ریسٹ ہاؤس نما ایک عمارت تھی.. اور شام کے دھندلکے میں تھی.. اور اس کے سامنے آلوچے اور خوبانیوں کے چند درخت تھے اور ویرانی میں ایک ٹھہری ہوئی خاموشی تھی..

اس خاموشی میں ہماری جیپیں رک گئیں..

وہاں کوئی نہ تھا..

ہم کس سے دریافت کرتے کہ یہاں فلاں صوبیدار صاحب اگر ہیں تو کہاں ہیں..

بہت دیر انتظار کیا.. ادھر ادھر جھانکتے رہے لیکن تنہائی کے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا.. چند درخت تھے تو ان سے کیسے پوچھتے..

اور شام اتر کر رات میں بدلنے والی تھی..

اور ہم سب تھکے ہوئے پژمردہ اور مرجھائے ہوئے تھے... وادی بھنڈر سے نکلے ہوئے تھے اور دل ہی دل میں شندور ہٹ کو ترک کرنے کے فیصلے کو کوستے تھے.. زیادہ سے زیادہ رات کو نمونیا ہو جاتا اور کیا ہوتا..

تب ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد وہی معمّر... عینک زدہ شخص اپنی

سوچوں میں گم مزے سے واک کرتا ہوا ہم تک پہنچ گیا.. ہم نے اسے پھر دبوچ لیا۔
"معاف کیجئے گا جناب.. یہ صوبیدار صاحب.. ہمارے پاس پرنس محی الدین کا ذاتی کارڈ ہے.. تو یہ کہاں ہوتے ہیں؟"

"ادھر ہوتے ہیں—" اس نے ریسٹ ہاؤس سے پرے ایک مبہم سا اشارہ کیا۔ یہ مہمان خانہ بھی ان کا ہے.. لیکن وہ خود اس کے نیچے اپنے آبائی گھر میں رہتے ہیں.. وہ پھر سے اپنی سیر پر آمادہ ہوا تو میں نے فوراً درخواست پیش کر دی۔ "کیا آپ انہیں بلا سکتے ہیں.. پلیز.."

"میں دیکھتا ہوں—" ہرچین کے اس فلسفی نے سر ہلا کر قدرے ناگواری سے کہا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا مہمان خانے سے پرے ہو کر کہیں نیچے اتر گیا۔

ہم اپنی طویل مسافت کی تھکن سے ٹوٹے ہوئے.. اپنی مختصر تصویر وادی پھنڈر کو یاد کرتے ہوئے اور اب تو وہ ایک خواب لگتی تھی.. اور شندور ہٹ کی رائل ایوڈ کو یاد کرتے جیپوں میں پہلو بدلتے رہے.. یہاں شندور ٹاپ کی نسبت سردی کم تھی۔ اگرچہ اتنی کم بھی نہ تھی..

تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں کہ مہمان خانے کے عقب میں سے ایک خلقت نمودار ہو رہی ہے.. اور اس خلقت کی ایک جنرل کی طرح رہنمائی کرتا ہوا ایک بلند قامت، رعنا اور مضبوط شخص ہے جو شلوار قمیض اور ہلکے سویٹر میں ہے اور اس کے سر پر ایک ترچھی براؤن رنگ کی چترالی کیپ ہے.. اور اس کے پیچھے پیچھے نہایت مؤدب اور ڈری ہوئی ایک ایسی خلقت ہے جس میں شام کی سیر کرتا ہوا ہرچین کا وہ فلسفی بھی شامل ہے جس نے کہا تھا کہ.. "میں دیکھتا ہوں۔"

یہ شخص.. براؤن چترالی کیپ میں.. دراز قد اور مضبوط.. پروقار اور ایک گہرے اطمینان اور ٹھہراؤ والا شخص.. وہی صوبیدار صاحب تھے جن کا نام کارڈ پر درج تھا.. گل ولی خان
"اچھا تو.. تارڑ صاحب—" اس نے ایک ہمدم دیریں کی طرح مجھے گلے سے لپٹا لیا۔ آپ ادھر کیسے آ گیا.. اس چھوٹے سے قصبے میں کیسے پہنچ گیا.. اچھا اچھا بیگم صاحب بھی تشریف لائی ہیں.. اچھا اچھا تو بچے بھی ساتھ ہیں.. خوش آمدید۔
میں نے اپنا ٹرمپ کارڈ پیش کرنے کی کوشش کی تو وہ ہنس کر کہنے لگے۔

"محی الدین ہمارا دوست ہے.. لیکن آپ بھی تو ہمارا دوست ہے.. ادھر آ کیسے گیا.. واہ دل خوش ہو گیا تارڑ صاحب.. اچھا تو ان سے ملئے.." انہوں نے اپنے پیچھے ہاتھ باندھے، سر جھکائے مخلوق کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ سب میرے بیٹے ہیں.."

اور ان میں وہ بیٹا بھی شامل تھا جو شام کی سیر کرتا ہوا ہمیں ہرچین کی سرحد پر ملا تھا اور اس فلسفی نے قطعی طور پر یہ ضروری نہیں سمجھا تھا کہ ہمیں آگاہ کر کے اطمینان دلاتا کہ جناب جن صوبیدار صاحب کا کارڈ آپ اٹھائے دربدر ہوتے ہیں، وہ میرے والدِ محترم ہیں.. تو میں آپ کو انکے پاس لئے چلتا ہوں.. وہ واقعی ہرچین کا پوشیدہ ارسطو تھا..

صوبیدار صاحب کے جتنے بھی بیٹے تھے.. سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور آغا خان فاؤنڈیشن اور دیگر محکموں میں معزز عہدوں پر فائز تھے اور اپنے والدِ محترم کے عقب میں ہاتھ باندھے نہایت فرمانبرداری سے کھڑے تھے..

ہرچین میں.. درہ شندور کے دامن میں.. ایک انجانی وادی کے گمنام گاؤں ہرچین میں.. ہمیں ایسا چین ملا جو چین میں بھی کہاں ہو گا..

مہمان خانے کے کمرے کھول دیئے گئے.. صوبیدار صاحب کے گھر سے صرف ہمارے لیے ایسے بستر آئے.. ایسی چادریں اور رضائیاں آئیں جن میں ایک کنواری اور ستھری مہک تھی.. جتنے بیٹے تھے وہ سب کے سب ہماری خدمت کے لیے کمربستہ ہو گئے.. اور ان کمروں سے ملحقہ ایسے صاف اور لشکتے غسل خانے تھے جن کے کموڈ اتنے سرد اور جما دینے والے نہ تھے جتنے اس شندور ہٹ کے تھے.. اگرچہ ان پر کسی رائل پشت یا امیر المومنین کا نزول نہ ہوا تھا...

فوری طور پر ہمارے لیے شام کی چائے کے بندوبست ہو گئے..

ہم پہلی بار چترالی مہمان نوازی کی فراخ دلی اور روایتوں سے آشنا ہوئے..

دستور کچھ یوں ہے کہ مہمان کے لیے سجائی گئی کھانے کی میز کا اگر کوئی حصہ خالی رہ جائے تو میزبان اسے اپنی شدید بے عزتی جانتے ہوئے خودکشی کے بارے میں غور کرنے لگتا ہے.. بے شک یہ ناشتہ ہو یا شام کی چائے لیکن پوری میز خوراک سے ڈھکی ہونی چاہیے.. اور یہ بھی نہیں کہ اہل چترال اس دستور کی وجہ سے کھانے کی میزیں مختصر رکھتے ہیں بلکہ طویل ترین رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے سامنے شام کی چائے

کے لیے جو میز آراستہ ہوئی وہ خاصی طولانی تھی اور مکمل طور پر ڈھکی ہوئی اور خوراک پوش تھی.. چائے، کافی، شربت، ابلے ہوئے انڈے، آملیٹ، بسکٹ، چترالی کیک اور کچھ ایسی اشیائے خورد و نوش جنہیں ہم پہلی بار دیکھ رہے تھے.. صوبیدار صاحب کا خودکشی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

اس دوران صوبیدار صاحب کی مطیع مخلوق جسے ہم نے مسلسل ہاتھ باندھے، سر جھکائے ان کے پیچھے کھڑے دیکھا تھا جیسے کہ وہ امام ہوں۔ ان میں سے ایک صاحب یعنیکے از بیٹا جانی محبوب نام کے ہم پر خصوصی عنایت کرتے تھے اور مہربان ہوتے تھے.. محبوب آغا خان رُول سپورٹ پروگرام کے کسی شعبے کے انچارج تھے اور پشاور اور ہرچین کے درمیان اپنی طاقتور جیپ میں سرگرداں رہتے تھے.. بلند قامت تھے اور عینک پہنتے تھے.. کسی بھی گفتگو کا آغاز جھک کر باقاعدہ کورنش بجا لاتے ہوئے ایک نہایت سازشی سرگوشی میں.. "یور میجسٹی.. میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں" سے کرتے تھے.. بلکہ صرف ہیلو بھی نہیں کہتے تھے.. یور میجسٹی.. میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ.... ہیلو.... ہی کہتے تھے... اب یہ "یور میجسٹی" کی عادت انہوں نے پرنس ڈیانا کے دورے کے دوران اختیار کی تھی یا ان کی خصلت میں شامل تھی، یہ میں نہیں جانتا۔

ابھی ہم درہ شندور سے بے آسرا اترتے تھے.. کچھ پتہ نہ تھا کہ رات کہاں اور کیسے بسر ہو گی.. تھکے ہوئے اور لاچار تھے.. اور ابھی نئی نئی سوندھی خوشبو والی رضائیاں تھیں، ستھرے بیڈ روم اور نکھرے باتھ روم تھے... چترالی مہمان نوازی کی خوراکیں تھیں اور ہم یور میجسٹی تھے۔

"میں بھول جاتی ہوں کہ ہم کہاں ہیں۔" میمونہ نے سر جھکا کر مجھ سے پوچھا۔ "یہ کونسی جگہ ہے؟"

"ہرچین——"

"اور یہ... کہاں ہے؟"

"جہاں ہم ہیں.."

وہ ناراض ہو گئی "اور اب میں پوچھوں گی کہ ہم کہاں ہیں تو آپ کہیں گے کہ... کس چین میں؟"

"ہرچین میں——"

چائے سے بمشکل فراغت ہوئی تو صوبیدار صاحب نے باقاعدہ کمانڈ دی "تارڑ صاحب آپ اور بھابھی صاحبہ اور دیگر بچے تھکے ہوئے ہیں.. رات کے کھانے تک آپ ذرا آرام کر لیں.. ہم پھر حاضر ہوں گے۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی مخلوق کو اشارہ کیا جو سب کے سب ان کے پیچھے سر جھکائے ڈائننگ روم سے نکل گئے..

البتہ محبوب نے جانے سے پیشتر جھک کر "یور میجسٹی——"

ہم نے آرام کیا کرنا تھا.. بستروں پر لوٹنیاں لگاتے رہے اور خوش ہوتے رہے..

رات کے کھانے کے لیے بھی وہی وسیع میز ایسی خوراکوں سے زیبائش شدہ تھی جن میں سنٹرل ایشیا کی مہک در آتی تھی۔ یہ یاد دلانے کے لیے کہ چترال ہمیشہ سے برصغیر کی نسبت درہ بروغل کی قدیم گزرگاہ کے راستے بدخشاں اور ازبکستان سے زیادہ قریب تھا۔

میرا خاندان اس چترالی مہمان نوازی کی وسعت کے مظاہر کو ایسی حیرت سے تکتا تھا۔ جیسے سمندر میں گم شدہ اور بھٹکتے ہوئے مسافر یکدم پانیوں میں سے ابھرتے ہوئے ایک جزیرے کو دیکھتے ہیں، اس کے ساحل پر جھومتے پام کے درختوں، گھنے سبزے والے دھند آلود پہاڑوں اور ان میں گرتے ہوئے سفید شرابور آبشاروں کو دیکھتے ہیں۔ دم پخت کی ہوئی مرغی.. پنیر اور مکھن کی روٹیاں۔ قیمے اور مقامی جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ کوئی پیزا نما شے... سلاد... مچھلی.. اور جانے کیا کیا..

میں ابھی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ بسم اللہ کہاں سے کی جائے کہ تاریکی میں سے محبوب صاحب جھکے ہوئے داخل ہوئے.. ان کے ایک ہاتھ میں ایک لالٹین جھولتی تھی۔ جھکے جھکے میرے کان کی قربت میں آئے اور اپنے تئیں ایک سرگوشی میں بولے "یور میجسٹی.. میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں.."

"کہیے..." میں نے مسکرا کر کہا.. مجھے ہمیشہ سے اس قسم کے کردار مرغوب رہے ہیں..

"آپ فی الحال کھانا اگر نہ تناول فرمائیں تو میں شکر گزار ہوں گا... یور میجسٹی آپ میرے ساتھ آئیں.."

"کہاں؟"

"جہاں میں آپ کو لیے جاتا ہوں جناب.." محبوب نے لالٹین بلند کر کے میرے چہرے کو غور سے ایسے دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں..

"لیکن کہاں؟" میں نے ذرا اچھلا کر کہا..

"ناراض نہ ہوں یور میجسٹی—" وہ پھر اتنا جھکا کہ اس کی عینک کے شیشے پلاؤ کی ایک طشتری کو چھونے لگے اور شاید اس پر کچھ دانے چاولوں کے بھی چپکے جن کی وجہ سے اس کی بصارت بھی قدرے دھندلائی "ادھر ذرا اوپر ہمارے آبائی قلعے میں چند دوست آپ کا انتظار کرتے ہیں۔"

"تو میں جلدی سے کھانا کھا لیتا ہوں اور پھر چلتے ہیں—"

"کھانا تو وہاں قلعے میں کھائیں گے—"

یہ گفتگو سرگوشیوں میں ہوتی تھی... یا بھی لالٹین بلند ہو کر میرے چہرے کو دیکھتی تھی..

اب ہر چیمن ایسی گمشدہ کوہستانی بستی میں، درہ شندور کے دامن میں، وادیٔ چترال کی پہلی رات میں، اگر ایک لالٹین روشن ہو کر کہتی ہے کہ ذرا بلندی پر کسی قدیم قلعے میں چند دوست آپ کا انتظار کر رہے ہیں تو میرا ردعمل کیا ہو سکتا تھا.. میرے اندر تجسس اور ایڈونچر کا جو کوبرا کنڈلی مارے سدا سے مقیم تھا، وہ اپنا پھن اٹھا کر یہ نہ کہتا کہ... چلو چلو.. وادیٔ چترال کی اس رات میں، کسی گاؤں ہر چیمن کے اوپر بلند پہاڑوں میں جو پتہ نہیں کس کا آبائی قلعہ ہے، وہاں چلو.. کوبرے نے یہی کہا۔

میں اس طعام بے نظیر کو چھوڑ کر اٹھا تو میمونہ کہنے لگی۔ "کھانا تو کھا کر جائیں.. لیکن آپ جا کہاں رہے ہیں؟"

"مجھے کیا پتہ.. جہاں یہ لے جا رہے ہیں—"

"اور یہ کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"جہاں یہ لے جا رہے ہیں۔"

میمونہ بے اختیار مسکرا دی اور لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ بے حد پرکشش لگ رہا تھا۔ "تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"ہندوکش میں ایک کچا قلعہ، توڑے دار بندوقیں اور رات"

ہم دونوں مہمان خانے سے باہر رات میں آئے اور پھر جانے کدھر چلنے لگے بلکہ محبوب تو جانتا تھا، میں نہیں جانتا تھا کہ کدھر... چلنے لگے..

وہ اپنی بلند قامتی کو ایک مسلسل جھکاؤ میں حرکت دیتا ہاتھ میں لالٹین تھامے، اسے کبھی کبھار میری نابینائی کو روشنی دینے کے لیے اپنے چہرے سے بلند کرتا، میرے آگے آگے چلا جا رہا تھا..

اور میں ٹھوکریں کھاتا.. اندھیرے کی گپھاؤں میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سوائے مزید اندھیرے کے اور کچھ نہ دیکھتا تھا.. ہاتھ پھیلائے ٹٹولتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اب وہ پتھر آئے گا جس کے ساتھ میرا پاؤں ٹکرائے گا اور میں اوندھے منہ کہیں گر جاؤں گا..

محبوب کا کمال یہ تھا کہ اگرچہ اس نے مجھے رائلٹی کے مرتبے پر فائز کر رکھا تھا لیکن مہمان خانے سے نکلنے کے بعد اس نے مجال ہے جو مجھ سے کلام کیا ہو، میرا خیال رکھا ہو، پیچھے مڑ کر ایک بار بھی دیکھا ہو کہ اغوا شدہ چلا آتا ہے یا فرار ہو چکا ہے.. یا کسی ندی میں گر چکا ہے.. نزدیکی کھائی میں گر کر جاں بحق ہو چکا ہے.. یا اس جنگل میں کھو گیا ہے جس کے درختوں سے لالٹین ٹکراتی تھی اور اس کی لو بجھنے کو آتی تھی.. وہ ایک سنگ دل محبوب ہو چکا تھا، پیچھے مڑ کر دیکھتا ہی نہ تھا.. یہ قیاس ہی نہ کرتا تھا کہ جس چترالی چڑھائی پر میں ایک مارخور کی طرح چڑھتا چلا جاتا ہوں، اغوا شدہ اس پر چڑھتے ہوئے لڑھک تو نہیں گیا.. نہ.. وہ چلا جاتا تھا..

اور نہ صرف تاریکی اور چڑھائی تھی، ایک ندی تھی جس کے پار ہم گئے.. بلکہ سردی بھی تھی.. اور ایسی تھی کہ اس بھگدڑ اور ہانپتی ہوئی پسینے بہانے والی ورزش کے دوران بھی میں برف میں لگے ایک شہتوت کی طرح ٹھنڈا ٹھار ہوا جا رہا تھا..

اور صدیوں کے سفر کے بعد لالٹین کی روشنی ایک غیر مرئی ہاتھ کی طرح ایک بڑے اور سال خوردہ پھاٹک کی کسی ایک زنگ آلود لوہے کی کیل پر پڑی.. پھاٹک جو بھربھری لکڑی میں خستہ ہو رہا تھا.. روشنی کے اس مدھم ہاتھ نے اسے دھکیلا اور وہ ہمیں گزرنے کے لیے جگہ دینے لگا.. کھلنے لگا..

ہم اندر داخل ہو گئے..

اندر ایک صحن تھا جو مٹی کی دبیز اور بارشوں اور برفوں سے گھلتی ہوئی ایک کچی فصیل کے اندر تھا۔ وہ صحن کتنا وسیع تھا، اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ لالٹین کی روشنی دور تک نہ جاتی تھی، چند قدم چلتی تھی اور دم توڑ جاتی تھی.. اور یہ مدھم روشنی جہاں تک بھی جاتی تھی وہاں سے بہت آگے وہ کچی اور دبیز چار دیواری تاریکی میں ہم پر امڈتی تھی.. اس مٹی کی فصیل کے ساتھ لگی نیچی چھتوں والی چند کوٹھڑیاں تھیں..

ان میں سے ایک کوٹھڑی کے نیم وا در میں سے روشنی کی ایک لکیر فرار ہو کر اندھیرے میں تیرتی ہماری لالٹین کی لو تک آنے کی کوشش کرتی تھی..

ایک در نیم وا میں بھی انسانی تخیل کو مہمیز دینے کے کیسے کیسے امکانات موجود ہوتے ہیں.. اس دروازے کے اندر کیسے کیسے بھید ہوتے ہیں... گمشدہ کائناتیں ہوتی ہیں، وہ کچھ پوشیدہ ہوتا ہے جس کی آرزو زندگی بھر بے چین رکھتی ہے..

یا شاید یہ صرف ایک طلسم ہے کہ دروازے کے پیچھے بھی کچھ ہے.... جب کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے..

مذہب اور محبت دونوں در نیم وا ہیں..

ان کی کشش ہی یہی ہے کہ یہ کبھی مکمل طور پر کسی پر ظاہر نہیں ہوتے.. بس ان کے نیم وا در سے روشنی کی ایک لکیر دکھائی دیتی ہے اور انسان اس آرزو میں رہتا ہے کہ یہ دروازہ کھلے اور میں اس روشنی کے منبعے کو دیکھ سکوں..

محبوب، مجھے اغوا کرنے والا محبوب اسی طرح جھکا ہوا اس در نیم وا کے قریب

ہوا اور اسے دھکیل کر کھول دیا..

ایک چھوٹے سے کچے کمرے کی چھت کے جو شہتیر تھے، وہ بوسیدہ اور صدیوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے.. ان کے نیچے چند کرسیاں تھیں، ایک میز تھی اور کچا فرش تھا اور ایک گیس لیمپ کی دودھیا روشنی میں برسوں پیشتر اس قلعے اور اس کوٹھڑی کی تعمیر کے لیے جو مٹی گوندھی گئی تھی، اس کا ایک ایک ذرہ نمایاں ہو رہا تھا..

میز کے گرد محبوب کے چند ہر چینی دوست بیٹھے تھے اور منتظر تھے..

کمرے کی کچی اور ناہموار دیواروں پر دو توڑے دار بندوقیں، زنگ آلود... متروک محبت کی طرح یادداشت سے گم ہوتی حالت میں آویزاں تھیں..

ان بندوقوں کے درمیان شکستگی سے دوچار چند فریموں میں ایسی تصویریں تھیں جو انگریز صاحب بہادر کے لکھے گئے "یارقند کی جانب ایک سفر" اور "بخارا اور سمرقند کے سفروں کا بیان" قسم کے قدیم سفرناموں میں دھندلاتی ہوئی ملتی ہیں.. ان میں طویل چوغوں، لمبے بالوں اور کمر سے بندھی تلواروں والے بے ترتیب داڑھیوں اور یاک کی کھال میں لپٹے ہوئے ان علاقوں کے امیروں اور نوابوں کی تصویریں ہوتی ہیں..

شکستگی سے دوچار فریموں میں.. ایسی ہی پرانی تصویریں تھیں.. یہ غالباً محبوب کے آباؤ اجداد کی تھیں.. جو تلواروں اور ڈھالوں سے مسلح نہ ہوتے تو اپنی داڑھیوں اور کندھوں تک آتے بالوں کی وجہ سے سائیں اور ملنگ بابے ہوتے.. اور وہ اپنی زندگی میں پہلی بار ایک کیمرے کے لینز کو گھور رہے تھے۔

محبوب کے دوست نہایت دھیمے، ذرا سنجیدہ اور کچھ خاموش تھے.. وہ اگرچہ ان تصویروں میں ساکت اپنے بزرگوں سے مختلف تھے لیکن ان کے چہروں پر وہی پرچھائیاں تھیں، وہی نین نقش اور برصغیر کی تہذیب سے ایک طویل اور دشوار راستوں کے بعد دکھائی دینے والی پہاڑی سلطنت میں ہزاروں برس سے رہنے والے باشندوں کی ایک تنہائی نقش تھی..

"آپ شہتوت پسند کرتے ہیں یور میجسٹی..." محبوب جو اب میرے سامنے بیٹھا تھا، یہ دریافت کرتے ہوئے جھکا اور اس کی تیکھی ناک میز کی سطح کو چھونے سے بال بال بچی.. شہتوت.. میں نے سوچا.. اس کمبخت محبوب نے مجھے اُس عالی شان

ضیافت سے کیا صرف اس لیے اٹھایا تھا.. اک شب دیجور میں، لالٹین کی روشنی میں، ندیوں، جنگلوں اور گھاٹیوں میں سے گزار کر یہاں تک صرف اس لیے لایا تھا کہ مجھے شہتوت کھلائے..

"لیکن..." محبوب سیدھا ہو گیا.. "یہ عام قسم کے شہتوت نہیں... چترال کے سفید رس بھرے لامبے وہ شہتوت ہیں جن کا تذکرہ جنت کے کے میووں میں شامل ہونے سے جانے کیوں رہ گیا ہے۔"

"مجھے کچھ خاص رغبت نہیں.. دراصل پھل فروٹ سے کبھی بھی مجھے کوئی خصوصی لگاؤ نہیں رہا.."

"لیکن یور میجسٹی..." وہ مزید سیدھا ہوا اور مجھے خدشہ ہوا کہ اس کا سر چھت کی کڑیوں سے جا چھوئے گا۔ "ہم ان شہتوتوں میں سے ان کا سفید رس کشید کرتے ہیں.. اور یہ ہمارا دستور ہے کہ جو مہمان آئے، اس کی خاطر اس رس سے کرتے ہیں.. تو نوش کیجئے.."

اس رس میں کہیں بھی رسیلے شہتوت کی مٹھاس کا ذائقہ نہ تھا....

وہ کسیلا اور شفاف تھا..

یہ آریاؤں کا پسندیدہ سوم رس نہ تھا.. چترالیوں کا من پسند شہتوت رس تھا.. لیکن اس میں ایک دہکتا ہوا الاؤ ایسا تھا جو کچی دیواروں پر آویزاں تصویروں میں جتنے بھی لمبے چوغوں اور نیم وحشی داڑھیوں والے، تلواروں اور بھالوں کو تھامے کردار تھے اُن کے بجھے ہوئے چہروں کو روشن کرتا تھا اور وہ دھیرے دھیرے زندہ ہونے لگتے تھے.. توڑے دار بندوقوں کے مٹی ہو چکے، بارود کو بھی بھک سے اڑا سکتا تھا..

قلعے کے صحن میں چند خدام دہکتے کوئلوں پر مرغی کی ناتواں کلیجیاں بھونتے تھے.. در نیم وا میں سے وہ نظر آتے تھے.. وہ تو نہیں، ان کے ہیولے آگ پر جھکے نظر آتے تھے.. کوئلوں میں سے چنگاریاں اٹھتی تھیں تو وہ قلعے کی کچی فصیل پر جھکے آسمان تک نہیں جاتی تھیں.. فصیل سے اونچی ہونے سے پہلے ہی بے مراد جگنوؤں کی طرح بجھ جاتی تھیں..

یہ خدام.. بے نام.. بے حیثیت جھکے ہوئے کمرے میں آتے اور ہمارے

سامنے میز پر سیاہ جھلتی ہوئی کلیجیاں رکھ کر نظریں بھی جھکائے ہوئے واپس چلے جاتے.. ہر انسان کی مانند میری زندگی میں بھی ایسی راتیں آئیں کہ میں نے ان کو تادیر یاد رکھا.. یاد کیا..

ایسی شبوں کا تذکرہ بہت طویل ہو گا... ایک مختصر داستان امیر حمزہ ہو گی.. ان میں شاید ہوس کی کوئی داستان نہ ہو... صرف کیفیت اور کیف اور دیوانگی کی کوئی داستان ہو.. لیکن ان سب کے سامنے، ہر چین کے کچے قلعے میں محصور وہ شب.. سب سے الگ ہے.. کیونکہ اس شب میں وہاں نہ تھا.. مہمان خانے کے سامنے گھڑی جیبیں ابھی ایجاد نہیں ہوئی تھیں.... ابھی وہ پہلا کیمرہ وجود میں نہیں آیا تھا جس نے دیوار پر آویزاں تصویریں اتاری تھیں.. ابھی تلوار اور ڈھال ہی مدافعت اور مردانگی کی علامت تھیں اور لباس میں لمبے چوغے اور بھاری پگڑیاں تھیں۔ ہندوستان کے آخری سرے پر.. پہاڑوں میں گھری اس وادی میں مہتر چترال کا راج تھا.. اس کے قلعے چترال۔ کوغزی اور مستوج میں تھے.. اور ادھر سے بدخشاں اور بخارا کو راہیں نکلتی تھیں..

اس کچی کوٹھڑی کے اندر میں گئے زمانوں کی قید میں تھا.. اور وقت وہیں تھم چکا تھا۔ اس.. وقت کے بہاؤ کے آگے.. دو توڑے دار بندوقیں تھیں، چند تصویریں تھیں اور.. گیس لیمپ کی دودھیا روشنی تھی.. شہتوت کا کسیلا ذائقہ تھا اور نیم سوختہ کلیجیاں تھیں.. اور مجھے بار بار اپنے آپ سے پوچھنا پڑتا تھا کہ میں کہاں ہوں؟

اور یہ سوال میں نے ہمیشہ اپنے آپ سے پوچھا تھا، جب بھی میں کسی گزرے ہوئے وقت کے حصار میں آیا تھا..

جب میں نے ہڑپہ کی پہلی منقش ٹھیکری اٹھائی تھی.. گندھارا عہد کے ایک ٹکڑے سے مٹی ہٹا کر مہاتما بدھ کی شبیہ کو نمودار ہوتے دیکھا تھا..

جب دریائے گھاگھرا کی خشک گزرگاہ کے بلند کناروں میں سے ایک ایسی ٹھیکری کرید نکالی تھی جس پر پکّی کے اُلیکے ہوئے گل بوٹے تھے۔

وادیٔ اشکومن کی ہزاروں برس پرانی قبروں میں سے دریافت ہونے والے سونے کے پرندے دیکھے تھے..

بہت سے ایسے زمانے آئے.. جب میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ.. میں

کہاں ہوں؟ اور آج شب یہ سوال میں پھر پوچھتا تھا.. وقت کے بہاؤ کو روکنے کے لیے.. صرف دو توڑے دار بندوقیں اور چند تصویریں تھیں.. قلعے کے صحن میں سرد ہواؤں میں اڑتی چنگاریاں تھیں.. اور کمرے کے اندر گیس لیمپ کی روشنی تھی۔

جیسے ان بھوری ہوتی قدیم تصویروں کا کوئی ری پرنٹ نہ تھا.. تو ایسی شب کا بھی کوئی ری پرنٹ نہیں ہوتا.. کوئی ثبوت نہیں ہوتا.. کہ اسے بعد میں ثابت کیا جا سکے.. کہ وقت کی سرحد سے پرے جو کوئی بھی جاتا ہے.. خرد سے پار جو کوئی بھی سفر کرتا ہے.. اس کی داستان کا یقین نہیں کیا جاتا..

چند تصویریں تھیں جن کے کردار ابھی زندہ ہوتے تھے اور ابھی راکھ ہونے لگے..

دو توڑے دار بندوقیں تھیں جن کا بارود ابھی سلگ اٹھنے کو تھا اور اب مٹی ہونے کو تھا..

کچے در و دیوار تھے..

درہ شندور کے دامن میں...

شہتوت کے رس کی بے وفا رفاقت تھی..

اور چند چنگاریاں تھیں جو ہر چین کے اس کچے قلعے کے صحن سے بلند ہوتی تھیں تو ایک سرد شب کے آسمان تک نہ پہنچتی تھیں.. بجھتی جاتی تھیں...

"مستوج کا قلعہ - بلند چنار اور "یاک سرائے" کو جانے والا راستہ"

میں اُس قلعے سے نکلا تو.. ایک اور قلعے میں آیا..

یہ مستوج کا قلعہ تھا..

یہاں بھی جو حیرت انگیز موٹائی کی کچی دیواریں تھیں.. اپنی تاریخی قدامت میں شانت.. ایک موٹی اگرچہ شاندار عورت کی طرح اپنی چوڑی نشست پر براجمان.. مستوج کے قصبے سے آگے.. چنار کے بلند اور گھنے درختوں میں گم شدہ.. بلند فصیلوں اور سرد سکوت میں آئے ہوئے ایک وسیع حصار میں خوابیدہ.. قلعۂ مستوج۔

ہم سب... میمونہ، سلجوق، سُمیر اور عینی.. منہ اٹھائے قدامت اور تاریخ کی سزا یافتہ اس عمارت کو تکتے تھے جس کے چناروں کی چھاؤں میں سردی بہت تھی.. اس کے در و دیوار میں خنکی کی ہمیشگی قیام پذیر تھی..

"تیج آف مستوج" کا تذکرہ ہر تاریخی کتاب میں ملتا ہے..

جب انگریز صاحب بہادر نے اپنے پسندیدہ حصار گلگت میں سے نکل کر.. انہی راستوں پر سفر کیا جدھر سے ہم آئے تھے.. صرف اس لیے کہ شندور پار کے باغیوں کی سرکوبی کی جائے.. وفادار ہندوستانی سپاہ کی قیادت کرتے ہوئے.. بھاری توپوں کو درہ شندور کے پار لاتے ہوئے.. اپنی من مرضی کی حکومت قائم کرنے کے لیے.. انہوں نے اسی قلعے کا محاصرہ کیا تھا..

آج سویرے.. ایک نہایت تکلیف دہ.. ایک انتہائی وسیع ناشتے کو نوش کرنے کے بعد.. سردار گل ولی صاحب کی مہمان نوازی کے آگے بچھتے ہوئے.. شرمندہ ہوتے ہوئے.. ان کی مخلوق سے اجازت لیتے ہوئے.. ہر چھن قلعے کی پچھلی شب کے لیے محبوب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم واپس چترال روڈ پر آئے تھے..

ہمارے برابر میں.. بلکہ کہیں نیچے گہرائی میں دریائے مستوج بہتا تھا اور ہم ایک چٹانی بلندی پر چترال روڈ پر کچھ خوفزدہ.. اور کچھ ہر چھن سے خوش سفر کرتے تھے..

ابھی ہم ایک کوہستانی سفر کی ردھم سے ہم آہنگ بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک پُل سامنے آیا.. پُل کے برابر میں دائیں ہاتھ پر ''مستوج.. ۴ کلو میٹر'' ایک بوسیدہ سا بورڈ آویزاں تھا.. جیپیں پل کے پار جانے کے لیے آہستہ ہوئیں تو میں نے غازی سے کہا ''غازی.. مستوج جائیں گے..''

''مستوج...'' اس نے بریک لگا دی ''لیکن صاحب.. چترال تو پُل کے پار ہے.. روڈ ادھر جاتا ہے—''

''لیکن فی الحال ہم مستوج جائیں گے..''

''وہاں کیا کریں گے صاحب.. سفر کھوٹا ہو گا..''

''مستوج.. اس وادی کا چترال کے بعد سب سے اہم نام ہے.. صرف چار کلو میٹر کے فاصلے پر ہے.... ذرا ایک نظر دیکھیں گے اور واپس آ جائیں گے..''

غازی نے ناگواری سے جیپ دوبارہ سٹارٹ کی اور اسے بورڈ کے برابر میں مستوج کو جانے والے راستے پر ڈال دیا..

اسلم کی جیپ نہایت وفاداری سے ہمارے پیچھے آنے لگی.. مستوج کا راستہ ایک نہایت اجاڑ اور دل کو خوشی سے عاری کر دینے والا ایک ایسا بلند مرتبت راستہ تھا جس کے نیچے صرف خصوصی موت تھی، کوئی خاص منظر نہ تھا.. کوئی برف کے جادو والا پہاڑ یا ہری بھری وادی نہ تھی.. کچھ بھی نہ تھا.. سوائے دھول کے اور ویرانی کے..

اور جب مستوج پہنچے ہیں تو وہ بھی شاید لاہور سے زیادہ قدامت رکھتا ہو لیکن زیادہ سے زیادہ ایک اور پہاڑی قصبہ تھا.. ایک چھوٹی سی سڑک جس کے کناروں پر کچے مکان.. کھیت.. ان میں بہتے ہوئے گلیشیر کے پانی.. سفید باریک دھول.. چند دکانیں..

دو تین ہوٹل جو ادھر آ نکلنے والے کوہ نوردوں کے لیے غنیمت تھے..

ہم اس قصبے میں ٹھہرے نہیں.. اس پر ایک نظر کی اور نکل گئے.. قلعہ مستوج گاؤں سے کچھ فاصلے پر واقع تھا..

اور اب ہم اس تاریخی قلعے میں سانس لیتے تھے.. اس میں گھومتے تھے.. منہ اٹھائے اسے تکتے تھے اور چنار کے سایوں سے بچتے تھے کہ ان میں بلا کی ٹھنڈک ٹھہری ہوئی تھی اور ایک بے انت خاموشی تھی..

ہم یہاں شب کے لیے ٹھہر سکتے ہیں..

اس مقام پر قیام کرنے کے لیے بھی ہمارے پاس ایک ''کھل جا سم سم.. کھل جا قلعۂ مستوج'' کارڈ تھا.. پرنس محی الدین کی ہمشیرہ یہاں رہائش رکھتی تھیں جو اس صبح چترال جا چکی تھیں.. اور ان کے جھکے جھکے خاموش خدام ہمیں نہایت شائستگی سے التماس کرتے تھے کہ.. آپ کے لیے مہمان خانہ کھلے گا.. خوراک حاضر ہو گی.. ہر طرح کا آرام ہو گا.. آپ رات ادھر کریں..

لیکن مستوج کے قلعے کی تنہائی اور اس کے بلند چناروں اور کچی فصیلوں میں گھرے ایک مہمان خانے میں میزبان کی غیر موجودگی میں، تن تنہا ایک رات کرنا ہمیں کچھ زیادہ خوش آئند نہ لگا.. جہاں دن کے وقت اتنی ٹھنڈک اور ویران بلند قید تھی، وہاں رات میں جانے اس کے کچے برجوں اور فصیلوں پر کیسی کیسی نادر روحیں اور ماضی کی فوت شدہ چترالی رانیاں گھومتی ہوں گی..

ہم خدام سے معذرت کر کے قلعے کے پھاٹک سے باہر کھلی فضا میں آ گئے..

اُس راستے پر آ گئے جس کے دونوں جانب تا حد نظر ہریاول کی کاشت کاری تھی.. کھیت اور مکان تھے.. لیکن مجال ہے ان کھیتوں میں کام کرتا ہوا ایک شخص بھی ہمیں دکھائی دیا ہو.. اور ان کھیتوں کے عین اوپر آسمان کو اٹھتی ہوئی بے روح سنگلاخ بلندیاں تھیں..

سلجوق اور سُمیر کی جیپ ایک اچھے ڈوگی کی طرح دھول اڑاتی ہمارے پیچھے چلی آتی تھی.. اگر ہم مستوج کے قلعے سے نکل کر دائیں ہاتھ گاؤں کی جانب مڑنے کی بجائے بائیں طرف نکل جاتے تو ہم کہاں جاتے..

مستوج سے دور افتادہ وادی بروغل کو راستہ جاتا تھا..

یہاں سے چند گھنٹوں کی مسافت پر بھنگ نام کا آخری گاؤں تھا جہاں پہنچ کر جیپ روڈ بھی دم توڑ دیتی تھی.. اور وہاں سے کوہ نورد پیدل ہو جاتے تھے اور بالآخر اس وادی میں پہنچتے تھے جس کا ذکر اہل چترال بھی مسرت سے کرتے تھے۔ اگرچہ ان میں سے اکثر نے صرف اس کے قصے سن رکھے تھے.. اس تک پہنچے نہیں تھے.. وہیں سے درّہ درکوت کو پار کر کے وادیٔ گلگت میں اترا جا سکتا تھا.. جہاں سے دریائے مار خون نکلتا تھا جو دریائے چترال کا آغاز تھا.. اور درّہ بروغل کے پار سنٹرل ایشیا کی قدامت ایک روزہ مسافت کی زد میں تھی.. اور جس وادی کی برف اونچائیوں اور کوہ پامیر کے دامن میں استغنا یک تھے کہ آوارہ گرد کوہ پیما اسے "یاک سرائے" کا نام دیتے تھے..

اس "یاک سرائے" میں چند روز میں نے بھی قیام کیا تھا.. لیکن اس سفر چترال کے کئی برس بعد.. اور تب میں نے چکار کے مقام پر پہنچ کر.. جہاں دریائے مار خون ایک مختصر آبشار کی صورت گرتا تھا اور قوس قزح کی پینگ بناتا گرتا تھا اور مجھے یہاں سے بلند ہو کر درّہ درکوت کے پار جانا تھا.. تب میں نے چکار کی بلندی پر چڑھنے سے پیشتر اس راستے کو ایک نظر دیکھا تھا.. جو بھنگ نامی کسی گاؤں تک جاتا تھا.. جہاں سے چترال کے لیے.. مستوج کے قصبے کے لیے ایک سواری مل سکتی تھی..

مجھے یہ راستہ یوں بھی یاد ہے کہ میں دریائے مار خون کے کنارے اس کے پانیوں کی آبشار سے جنم لینے والی رنگین پینگ.. رنگیلے جھولے کو بہت دیر تک تکتا رہا تھا کہ اس پینگ پر میرے ساتھی کوہ نورد اپنی اپنی آرزو.. اپنی اپنی گجری کو جھولتے دیکھتے تھے.. یہ ضروری نہیں کہ ایسی گجری کا وجود ہو.. وہ ہر شخص کے لیے اس کی آزردگی اور ناآسودگی اور ناخوشی میں سے وجود میں آتی ہے.. اور وہ اسے خاص لمحوں میں رنگ برنگے جھولے میں جھولتا دیکھتا ہے.. تو میری بھی ایک گجری تھی.. بھرے بدن اور گورے پنڈے والی جو دریائے مار خون کی آبشار کے اوپر قوس قزح کے رنگوں میں جھولا ڈالے جھولتی تھی اور جدائی میری آنکھوں میں نمی بھرتی تھی.. اس نمی میں بھی.. اس کی پھوار میں بھی ایک ست رنگی پینگ تھی.. اور اس میں بھی وہی گجری ہلارے لیتی تھی.. اس لیے مجھے وہ راستہ یاد ہے..

ہم مستوج کے بازار میں سے ایک مرتبہ پھر گزرے.. اور وہاں ابھی تک اس دھول کے کچھ ذرے ہوا میں معلق تھے جو قلعے کو جاتے ہوئے جیپ کے ٹائروں میں سے اٹھی تھی..

ہم واپس اس مقام پر پہنچے جہاں ایک پل تھا۔

جس کے پار چترال روڈ تھی..

اور جہاں ہم نے "مستوج.. ۳۰ کلو میٹر" کا بورڈ دیکھا تھا اور ادھر چلے گئے تھے..

اس پل کا نام.. کوراغ پل تھا.. اور یہاں.. اس مقام پر.. پل کے نیچے جو دریا تھا.. اسے دریائے رامن بھی کہتے تھے.. وہی دریائے مار خون.. جو کبھی دریائے مستوج ہو جاتا ہے.. ادھر رامن ہو کر.. آگے بہتا جاتا ہے تو دریائے چترال ہو جاتا ہے..

ہم کوراغ پل کے پار ہو گئے..

”ترچ میر چوٹی کے قصے جو کرنل مبشر نے سنائے تھے“

جیپ روڈ کے عین نیچے دریا پھیلنے لگا..

اُس کی گزرگاہ میں ایک حیرت ناک وسعت تھی.. اُس کا پھیلاؤ اور ریتلے بیابانوں کی تنہائی ایسی عظیم تھی کہ بہت دور.. اس بیاباں سے پرے جو پہاڑ تھے وہ ہم سے طویل فاصلوں پر تھے...

ہم نے گلگت اور چترال کی لینڈ سکیپ میں ایک واضح فرق محسوس کیا..

وہاں.. سبزہ، آبشاریں اور ندیاں بہت تھیں.. باغ اور بہاریں بہت تھیں.. لیکن یہاں چٹانوں میں بیابانی اور چٹیل وسعت تھی اور خشک موسم تھے.. اگرچہ اس کے منظر، چترال کے منظر بہت پر شکوہ اور گرنیڈ تھے..

غازی نے کم از کم یہ تو درست کہا تھا کہ گلگت اور چترال الگ الگ ملک ہیں.. ان کی شخصیت اور مزاج جدا تھے.. گلگت کی گوپس، پھنڈر اور ٹیرو اور لنگر میں بھی ہماری جیپیں اگرچہ ہریاول کی وادیوں میں سفر کرتی تھیں لیکن سمٹ سمٹ کر ان میں قید اور گھری ہوئی سفر کرتی تھیں جب کہ یہاں وہ اتنی بلند اور وسیع پھیلاؤ میں تھیں کہ بے حیثیت اور گمنام ہوتی تھیں.. اتنی بڑی لینڈ سکیپ میں ان کا وجود نمایاں نہ ہوتا تھا.. اگر وہ نمایاں ہوتی تھیں تو صرف اس دھول سے جو ان سے بلند ہو کر ان کا پتہ دیتی تھی..

اور یہ لینڈ سکیپ تسلسل میں نہ تھی.. ہر لمحے بدلتی جاتی تھی۔

کبھی وادی کے چوڑے چٹیلے وجود پر صحرا کی وحشتوں کا نزول ہونے لگتا..

کبھی دریا کے پار جو چٹانوں کی اونچی فصیلیں تھیں ان کے پتھر رنگ بدلتے..

اور کبھی ان رنگ بدلتے پہاڑوں کے اندر کوئی ایسی آبادی دکھائی دیتی جس کے مکین اگر اپنی کھڑکیوں کے کواڑ کھول کر ادھر دیکھتے تو کچھ نہ دیکھتے سوائے چترال روڈ پر اٹھتے دھول کے دو بگولوں کے...

اس خشک مزاج کوہستانی وسعت میں جو دھوپ اترتی تھی تو بے دریغ اترتی تھی... اور جب ہم نے اس بے آب و گیاہ راستے کے کناروں پر چند درخت دیکھے اور گھاس کی ہریاول دیکھی اور اس میں سے گرتے ایک چشمے کو سڑک پر پھیلتے اور بھگوتے دیکھا تو ہم رک گئے.. اپنے پیاسے حلق تر کیے، جیپوں کے دھواں دیتے گرم اور پیاسے انجنوں کو سیراب کیا...

اگرچہ وادیٔ گلگت میں... شندور روڈ کی نسبت یہاں راستہ چوڑا اور ہموار تھا لیکن وہاں سبزے اور باغوں کی ہمسائیگی ہم سفر تھی، بے شک وہاں خلطی ایک کی ہاتھی ڈباؤ آبی موت بھی ہم رکاب تھی اور ہم اس کی آغوش میں جھلکتے ہوئے اکثر خوفزدہ ہو کر ہچکیاں بھرتے سفر کرتے تھے لیکن منظروں کو آنکھوں میں اتار لینے کی آرزو کرتے تھے.. اور یہاں وادیٔ چترال میں ہم ایک عظیم پر شکوہ وسعت میں سفر کرتے تھے اور بے خطر کرتے تھے لیکن.. یہاں آرزو نہیں آزردگی تھی..

وہاں شندور روڈ پر جب ہماری جیپیں چلتی تھیں تو ہم اس کائنات کا ایک لازی جز بن جاتے تھے.. وہاں اگر ہماری جیپیں نہ ہوتیں تو اس وادی کی دل ربائی میں تھوڑی بہت ہی سہی لیکن کمی ضرور واقع ہوتی.. یہاں وادیٔ چترال میں سے اگر ہماری ان دو جیپوں کو منفی بھی کر دیا جاتا تو اس لینڈ سکیپ کو ذرہ برابر فرق نہ پڑتا.. ہم وہ ذرے تھے جن کی کوئی حیثیت نہ تھی.. اس لیے ہم پژمردہ تھے، تھکے ہوئے نڈھال ہوتے تھے.. اور بار بار پیاسے ہوتے تھے.. اور جب ہم آزردگی میں مبتلا... اور کہاں آ گئے ہم چمن سے نکل کے.. ورد کرتے تھے تو دریائے چترال کے صحرائی پھیلاؤ کے پار جو چٹانیں رنگ بدلتی تھیں، ان میں سے ایک برفیلا وجود سربلند ہوا اور منظر کی خشک وسعت میں ٹھنڈک کا طلسم پھونکنے لگا.. اور میں جان گیا کہ یہ ترچ میر ہے..

ان علاقوں کی سرتاج اور کوہ پیمائی کی دنیا میں ایک نمایاں برفیلی بلندی..

لیکن ترچ... بہت پوشیدہ اور پر تکبر پہاڑ تھا..

وہ آسانی سے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتا تھا..

وہ راکاپوشی نہ تھی جو پوشیدگی میں یقین نہ رکھتی تھی... جو شاہراہ ریشم کے عین اوپر.. ہر ویگن، ہر کار میں سوار مسافروں پر اپنا متناسب سفید بدن جھکائے بے لباس ہوتی تھی..

نانگا پربت بھی نہ تھی کہ اس کے نام میں ہی برہنگی ہے.. وہ گلگت سے ذرا ادھر، رائے کوٹ پل کے پار ہونے پر ایک نیم ریتلے میدان سے پرے ڈھلتی شام کی سرخی میں نظر آنے لگتی ہے.. اپنی برہنگی میں کسی شرم سے سُرخ ہوتی پھر بھی نظر آنے لگتی ہے..

ترچ... ایک ایسا پہاڑ تھا جو وادیٔ چترال کی شناخت ہونے کے باوجود اس سے روٹھا ہوا، بہت الگ اور بہت جدا.. اور بہت پرے تھا.. اس کے منظر کا حصہ نہ بنتا تھا.. اس کے باوجود... وہ شاید صرف ہمارے لیے... کبھی بہت قریب چلا آتا تھا اور کبھی بہت دور ہو جاتا تھا اور اس کی برفیں رنگ بدلتی چٹانوں کے اندر ہی اندر دفن ہوتی چلی جاتی تھیں۔

پھر دریا کے پار طویل فاصلوں پر وادیٔ اویری کی ہریاول دکھائی دی..

اویری، ترچ میر کی وادی ہے..

یہیں سے ترچ میر کے بیس کیمپ کو راستہ جاتا ہے..

ترچ میرے لیے ایک ذاتی چوٹی تھی۔

میرا چھوٹا بھائی مبشر جو کبھی "نکلے تری تلاش میں" کے زمانوں میں نیم لفٹین ہوا کرتا تھا اور اب کرنیل ہو چکا ہے، اسی وادی سے گزر کر ایک اطالوی کوہ پیما مہم کے ہمراہ رابطہ افسر کے طور پر ترچ میر کے دامن تک گیا تھا اور کیمپ ون تک پہنچا تھا۔

میں اب بھی اسی اطالوی ٹیم کے رُک سیک اور سلیپنگ بیگ استعمال کرتا ہوں کہ مبشر کرنیل ہونے کے بعد نوجوانی کے اس طلسم سے آزاد ہو چکا ہے جب وہ فوج کی افسری ترک کر کے کوہ نورد ہو جایا کرتا تھا..

اور اس نے اس مہم سے واپسی پر مجھے ترچ کے بارے میں کیسے کیسے قصے

سنائے تھے..

ترچ کے ویران اور بلند بیس کیمپ میں مہم کا نمبردار یا ہیڈ پورٹر جو فوج میں صوبیدار ہوا کرتا تھا، اسے ترچ کی کہانیاں سناتا تھا..

یہ سنے سنائے قصے کہانیاں میں آپ کو سناتا ہوں..

"ترچ میر کے بیس کیمپ کا بیان"

مبشر کا کہنا تھا کہ ترچ میر کے بیس کیمپ میں جب پہلی سویر کے آثار ہوئے اور وہ اپنے خیمے میں سلیپنگ بیگ میں لیٹا ہوا تھا تو صرف ایک سرد سناٹا تھا، کوئی آواز، کوئی سرسراہٹ نہ تھی.. سردی کی شدت بدن کو برف کرتی تھی.. کچھ دیر بعد اسے ایک ٹپ کی آواز آئی اور پھر مکمل خاموشی.. پھر ایک اور ٹپ ٹپ ہوئی.. اور چند لمحوں بعد ایسا محسوس ہوا جیسے یہ ہلکی بارش کی آواز ہو.. پھر یہی آواز جھرنے کے ایک بہاؤ کی طرح بہتی ہوئی آئی اور بالآخر ایک آبشار کی طرح کانوں میں گرنے لگی.. اور جب مبشر خیمے سے باہر آیا تو واقعی وہاں ترچ کے دامن میں چھوٹی چھوٹی آبشاریں گرتی تھیں اور جھرنے رواں ہوتے تھے.. اور اس سناٹے سے شور تک کے سفر کا جواز بالکل سادہ تھا.. بیس کیمپ میں جونہی رات اترتی تھی درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے گر جاتا تھا اور جھرنے اور آبشاریں جم جاتی تھیں.. صبح ہوتی تو وہ آہستہ آہستہ پگھلنے لگتی تھیں.. اسی طور شام ہونے پر وہ بہاؤ کی آواز سے واپس ایک ایک قطرے میں منجمد ہوتی جاتی تھیں.. ٹپ ٹپ.. اور پھر خاموشی۔

"ایک عجیب ہنی مون کا قصہ"

مبشر اپنی مہم کے ہمراہ ایک دشوار گزار گلیشیر کو عبور کر کے ایک مختصر سی وادی میں پہنچا تو وہاں ایک نہایت دل کش ہریاول کے منظر اور ندیوں کے درمیان اسے ایک تنہا خیمہ نظر آیا.. اتنی بلندی اور تنہائی میں وہ کون تھا جو یہاں قیام پذیر تھا؟... ایک نوجوان جوڑا... نوجوان ایک بار اپنی کوہ نوردی کے دوران ادھر سے گزرا تو اس سپاٹ کی حسن آمیز تنہائی دیکھ کر اس نے فیصلہ کیا کہ جب کبھی وہ شادی کریگا تو ہنی

مون کے لیے بس یہیں آئے گا... شادی ہوئی تو اسی روز دونوں میاں بیوی نے یورپ کو چھوڑا اور بے شمار صعوبتیں سہتے بالآخر اس خواب آور مقام پر پہنچ گئے... اور اب یہاں پچھلے ایک ہفتے سے قیام پذیر تھے..

"افغانستان میں گر جانے والے کوہ پیما کی کہانی"

نمبردار نے ایک کہانی بیان کی... بہت عرصہ پہلے ترچ میر کو فتح کرنے کے لیے ایک یورپی ٹیم آئی جس میں دو نہایت قریبی دوست بھی شامل تھے.. آخری کیمپ تک صرف یہ دو دوست پہنچے اور باقی ممبر ناکام ہو گئے.. اگلی صبح موسم بالکل صاف اور چمکیلا تھا.. اور وہ بالآخر ترچ میر کی چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے.. چونکہ موسم بہت صاف اور روشن تھا، اس لیے وہ خاصی دیر تک چوٹی پر ٹھہرے رہے اور ظاہر ہے وہ بہت خوش تھے اور اپنی محبتوں اور خواہشوں کے تذکرے کرتے ہنستے اور خوش ہوتے تھے.. چوٹی سے اترنے سے پیشتر انہوں نے ایک دوسرے کی تصویریں اتارنے کا فیصلہ کیا.. پہلے ایک دوست نے دوسرے کی تصویریں اتاریں اور پھر دوسرے دوست نے اسی کیمرے کے سامنے پہلے کو کھڑا کیا... کیمرے میں دیکھتے ہوئے اس نے اشارہ کیا کہ ذرا پیچھے ہو جاؤ، تصویر بہتر بنے گی.. وہ بے دھیانی میں پیچھے ہوا اور تازہ اور نرم برف پر لڑھکتا ہوا ترچ میر کی دوسری جانب تقریباً بیس پچیس فٹ نیچے ہموار برف پر جا گرا... تازہ برف کی وجہ سے وہاں سے نیچے لڑھکنا بچوں کے ایک کھیل کی طرح تھا.. وہ اٹھا اور کپڑے جھاڑ کر اس مزیدار قلابازی پر ہنسنے لگا.. چوٹی پر کھڑا نوجوان بھی بے حد محظوظ ہوا اور قہقہے لگانے لگا اور پھر کہنے لگا کہ یار اب آ جاؤ، واپس چلتے ہیں.. اس نے متعدد بار اس برف پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن زاویہ کچھ ایسا تھا کہ چند قدم اوپر آنے پر وہ واپس لڑھک جاتا.. اور اوپر آنے کے لیے صرف بیس پچیس قدم درکار تھے.. وہ دونوں اتنے قریب تھے کہ آواز بلند کیے بغیر باتیں کر سکتے تھے.. چوٹی والے کوہ پیما نے اسی طرح ہنستے ہوئے خوشگوار موڈ میں کوہ پیمائی کا رسہ کھول کر اس کی جانب پھینکا تا کہ وہ اسے تھام کر آسانی سے اوپر آ جائے.. لیکن رسہ نیچے کھڑے کوہ پیما سے صرف پانچ سات فٹ کے فاصلے پر جا کر ختم ہو گیا.. اس نے بہت کوشش کی کہ اس پانچ سات فٹ

کے فاصلے کو طے کر کے رسے کے سرے تک پہنچ سکے لیکن ہر بار وہ واپس گر جاتا.. اسی کوشش میں شام ہونے لگی.. تب نیچے کھڑے نوجوان نے چوٹی پر کھڑے اپنے دوست سے کہا، نہیں میں کبھی بھی اوپر نہیں پہنچ سکوں گا.. شام ہونے کو ہے تم چوٹی سے اتر کر فوراً نیچے کیمپ تک پہنچو... رات ہو گئی تو تم زندہ نہ بچو گے... اس لمحے ابھی دھوپ تھی.. دونوں دوست ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے... یاد رہے کہ ترچ میر کی چوٹی کے دوسری جانب افغانستان ہے.. اور نیچے کھڑا دوست دراصل افغانستان کی سرزمین پر تھا اور چوٹی پر منتظر دوست پاکستان میں تھا.. اور وہ جانتا تھا کہ ابھی رات ہو گی اور میرا دوست لمحوں میں منجمد ہو جائے گا لیکن وہ اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکتا تھا.. اور اس نے ہاتھ ہلا کر اسے خدا حافظ کہا اور پاکستان کی جانب اترنے لگا.. کیا یہ ایک خوفناک تجربہ نہیں کہ آپ کا بہترین دوست تقریباً آپ کے پاس کھڑا ہو اور آپ جانتے ہیں کہ ابھی تھوڑی دیر بعد وہ ہلاک ہو جائے گا اور آپ بے بس ہیں.. اور مجبوراً اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں..

"ترچ میر کے تابوت کا قصہ"

نمبردار نے مبشر کو جتنے قصے سنائے، ان سب میں سے ترچ میر کے تابوت کا قصہ ایسا ہے جو ایک یونانی المیے کی طرح آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے.. میں نے سوچ رکھا ہے کہ جب کبھی میرے وسائل نے اجازت دی، میں اس ٹریجک کہانی پر ایک فلم یا ٹیلی ویژن ڈرامہ تخلیق کروں گا.. نمبردار کا کہنا تھا کہ موسم سرما کا اختتام ہو رہا تھا۔ ترچ کی وادیوں میں برفیں پگھل رہی تھیں اور ندیاں شور کرنے لگی تھیں.. تب تین ہسپانوی کوہ نورد اس کے گاؤں تک پہنچے۔ ان کی خواہش تھی کہ نمبردار ان کے ہمراہ ایک گائیڈ کے طور پر ترچ میر کے دامن تک چلے.. انہیں پورٹرز کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنا سامان خود اٹھانا چاہتے تھے.. ترچ کے بیس کیمپ تک کے سفر کے دوران وہ اس سے بے تکلف ہو گئے۔ اس میں دو مرد تھے اور ایک نوجوان لڑکی۔ عمر رسیدہ مگر ہاتھ پاؤں سے مضبوط مرد اس نوجوان لڑکی کا باپ تھا اور دوسرا کوہ نورد اس کا منگیتر تھا.. یہ تینوں ایک مدت سے پاکستان کے شمال میں سربلند چوٹی ترچ میر کی محبت میں مبتلا

تھے.. ان کی زندگی اتنی پر آسائش نہ تھی کہ وہ آسانی سے اس سفر کے لیے رقم نکال سکتے.. انہوں نے دو تین برس تک پارٹ ٹائم مشقت کر کے اور اپنی خواہشوں کو محدود کر کے اس خواہش کی تکمیل کے لیے سفر کے اخراجات جمع کیے تھے.. اس خواہش کی شدت صرف باپ اور منگیتر میں تھی، وہ لڑکی زیادہ پر جوش نہ تھی.. صرف اس لیے ساتھ چلی آئی کہ اسے اپنے منگیتر سے بے پناہ محبت تھی اور وہ جانتی تھی کہ جب تک یہ ترچ میر کو دیکھ نہ لے گا، اسے سر کرنے کی کوشش نہ کر لے گا.. شادی سے کترائے گا.. چنانچہ وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد اس برفانی سوکن سے اس کا ملاپ ہو اور وہ اس کے ساتھ شادی کر لے.. بیس کیمپ میں پہنچ کر انہوں نے اپنے خیمے نصب کیے.. دو تین روز اپنے آپ کو موسم کے ساتھ مفاہمت کرنے کے لیے قیام کیا.. چوٹی پر پہنچنے کے لیے تیاری کی.. کچھ سامان اگلے کیمپ تک پہنچایا اور پھر ایک روز یہ چاروں افراد بیس کیمپ سے نکل کر بمشکل اس کیمپ تک پہنچے جہاں سے اگلی صبح انہوں نے چوٹی تک پہنچنے کے لیے کوہ پیمائی کرنی تھی.. اس رات ہسپانوی لڑکی پر موسم کا اثر ہو گیا اور وہ ہلکے ہلکے بخار میں پھنکنے لگی.. بلندیوں پر ایسی بیماری مہلک ثابت ہو سکتی ہے.. صبح ہوئی تو اس کے بخار میں شدت آ گئی.. منگیتر نے اس کی حالت دیکھ کر فیصلہ کیا کہ وہ چاروں بیس کیمپ واپس چلے جائیں گے.. اس مقام سے ترچ میر کی چوٹی نظر آ رہی تھی اور وہ لڑکی اپنے باپ اور منگیتر کی آنکھوں میں ایک حسرت بھری اداسی دیکھتی تھی... وہ جانتی تھی کہ اگر وہ یہاں سے لوٹتے ہیں تو کبھی بھی واپس نہ آنے کے لیے لوٹتے ہیں.. چنانچہ اس نے اصرار کیا کہ وہ دونوں ہر صورت چوٹی پر پہنچنے کے لیے قسمت آزمائی کریں.. بلندی زیادہ تھی، اس لیے باپ اور منگیتر نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کو نمبوار کے ساتھ نیچے بیس کیمپ میں بھیج دیا جائے تاکہ اس کی بیماری کو کچھ افاقہ ہو اور وہ دونوں چوٹی کی طرف روانہ ہوں گے اور اگلے روز بیس کیمپ واپس پہنچ جائیں گے.. نمبوار اس لڑکی کو سہارا دے کر بڑی مشکل سے گلیشیرز کو عبور کرتا اور دراڑوں سے اسے بچاتا شام تک بیس کیمپ میں لے آیا.. جونہی شام ہوئی اس کا بخار شدت پکڑ گیا.. وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی اور نمبوار کا کہنا ہے کہ بخار کی حدت سے اس کے رخسار دہکتے تھے اور اس کی قربت میں بھی آنچ آتی تھی... وہ کچھ بھی کھانے پینے کے قابل نہ تھی.. جب نمبوار

نے اسے سلیپنگ بیگ میں لپٹا کر آرام کرنے کو کہا اور خود اپنے خیمے میں جانے لگا تو لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا.. وہ انگریزی سے ناآشنا تھی اور ایک ہذیانی کیفیت میں ہسپانوی زبان میں جانے کیا کیا کہتی تھی.. لیکن وہ یہی کہتی تھی کہ مجھے اکیلا مت چھوڑو.. مجھے تنہا مت چھوڑو.. وہ سرد اور منجمد رات ایسی تھی کہ لڑکی نمبوار کا ہاتھ تھامے مسلسل بولتی رہی.. اور اس کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی.. پھر ایک ایسا وقت آیا کہ نمبوار وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا جو وہ کہہ رہی تھی.. اور وہ نمبوار کی زبان کھوار سمجھنے لگی.. یہ دو اجنبی زبانوں کا مکالمہ تھا جو صرف اس بلندی پر.. اس منجمد تنہائی اور مرگ کی قربت میں آشنائی تک پہنچ گیا تھا.. وہ اسے اپنے بچپن کے قصے سناتی رہی.. منگیتر سے پہلی ملاقات کا احوال سناتی رہی.. کبھی مسکراتی اور کبھی روتی رہی.. اور اس کے بخار میں ایسی شدت تھی کہ وہ برف کو بھی پگھلا سکتا تھا.. اور نمبوار اسے اپنے بچپن کی کہانیاں سناتا رہا.. اپنی محبتوں کی کہانیاں کہتا رہا.. اور وہ دونوں کبھی خوش ہوتے، کبھی قہقہے لگاتے اور کبھی اشک بار ہو جاتے.. رات گزرتی گئی.. صبح کی قربت میں نمبوار پر نیند نے غلبہ پایا اور تھوڑی دیر بعد جب وہ بیدار ہوا تو وہ خوبصورت ہسپانوی لڑکی مر چکی تھی.. ترچ میر کے دامن میں ایک لاش اکڑی ہوئی تھی.. نمبوار نے اس کے خیمے کو بند کیا اور چوٹی کی جانب سفر کرنے لگا.. ابھی اس نے آدھی مسافت طے کی تھی کہ سامنے سے باپ اور منگیتر چلے آ رہے تھے اور وہ نعرے لگا رہے تھے اور پر مسرت ہو کر ایک دوسرے کو گلے لگا رہے تھے کہ وہ ترچ میر کی چوٹی کو سر کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے.. جب وہ نمبوار کے نزدیک آئے تو اس سے لپٹ گئے اور اسے اپنی کامیابی کی داستان سنانے لگے.. پھر انہیں احساس ہوا کہ نمبوار کو تو لڑکی کے پاس ہونا چاہیے تھا.. وہ یہاں تک کیوں آ گیا ہے اسے تنہا چھوڑ کر.. نمبوار نے انہیں بتایا کہ وہ مر چکی ہے.. یہ خبر سن کر ان کے قہقہے چیخوں میں بدلے اور وہ نہایت بلند آواز میں آہ و زاری کرنے لگے.. وہ اس چوٹی کی جانب دیکھتے جس کے لالچ میں وہ اسے بھول گئے تھے اور پھر سینہ کوبی کرنے لگتے.. ہسپانوی خون دیگر یورپی اقوام کی طرح ٹھنڈا اور پریکٹیکل نہیں ہوتا.. وہ دکھی ہوتے ہیں تو اپنے دکھ کے اظہار کے آگے بند نہیں باندھتے.. نمبوار کا کہنا ہے کہ ان کی بلند آہ و زاری سے ترچ میر کا دامن گونجتا تھا اور یہ ایک عجیب خوفناک منظر

تھا.. وہ تینوں بیس کیمپ میں پہنچے.. نمبردار نے تجویز پیش کی کہ لڑکی کو یا تو یہیں دفن کر دیا جائے اور یا کسی گلیشیر کی دراڑ میں اتار دیا جائے.. لیکن وہ دونوں اسے نیچے گاؤں میں لے جا کر کسی باقاعدہ قبرستان میں دفن کرنا چاہتے تھے.. اس کی لاش کو سلیپنگ بیگ میں لپیٹ کر انہوں نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور دو دن کے سفر کے بعد نیچے وادی میں گاؤں تک پہنچے.. جب اسے ایک ندی کے کنارے قبرستان میں.. ایک مقامی ترکھان کے جوڑے ہوئے تابوت میں رکھ کر دفن کیا جانے لگا تو مقامی مولوی صاحب آ گئے کہ یہ مسلمانوں کا قبرستان ہے، یہاں کافروں کو دفن نہیں کیا جا سکتا.. اس پر نوجوان منگیتر نے.. جو مرگ سے اور مسافت سے نڈھال اور فاترالعقل ہو چکا تھا، اپنے لاما پستول سے بے دریغ فائرنگ شروع کر دی.. مولوی صاحب فوراً پسپا ہو گئے اور ندی کے کنارے اس تابوت کو دفن کر دیا گیا..

کیا یہ قصہ یہاں اختتام کو پہنچا؟.. نہیں، ابھی اس کا ڈراپ سین باقی ہے..

کچھ موسم گزرے.. وہ مرگ قصۂ پارینہ ہوئی.. نمبردار وہ موت کہانی بھول گیا اور پھر ایک رات جب بارش کئی دنوں سے اور راتوں سے مسلسل برس رہی تھی اور نمبردار سو چکا تھا، اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ کمبل لپیٹے ہوئے ٹھٹھرتا ہوا کہ آگ بجھ چکی تھی، دروازے تک آیا اور کنڈی اتار کر اسے کھولا.. باہر دو پورٹر کچھ سامان اٹھائے کھڑے تھے اور ان کے ہمراہ ایک قدرے فربہ بوڑھی عورت تھی جس کے سفید بال بارش کے پانیوں سے نچڑتے تھے اور وہ سردی سے ٹھٹھرتی تھی..

اس نے اٹکتی ہوئی انگریزی میں پوچھا۔ "کیا تمہارا نام ہی فلاں نمبردار ہے؟"

نمبردار نے سر ہلایا..

"کیا تم ہی آج سے تین برس پہلے دو ہسپانوی مردوں اور ایک لڑکی کو لے کر ترچ میر تک گئے تھے؟"

نمبردار نے پھر سر ہلایا..

"اور وہ لڑکی مر گئی تھی؟"

"ہاں—"

"کیا تم جانتے ہو کہ وہ کہاں دفن ہے؟"

"ہاں.."

"مجھے اس کے پاس لے چلو.."

"آپ کون ہیں؟" نمبردار نے پوچھا۔

"میں.. اس کی ماں ہوں اور اسے لینے آئی ہوں۔"

اگلی صبح وہ اس بوڑھی عورت کو لے کر اس ندی کے کنارے گیا جہاں مقامی قبرستان تھا.. بیشتر قبریں موجود تھیں لیکن ہر برس ترچ میر سے جو پانی اترتے ہیں، جو سیلاب جنم لیتے ہیں، ان کی زد میں آ کر اس لڑکی کی قبر کا وجود بہہ چکا تھا.. ایک گیلا اور ریتلا کنارا تھا اور ہموار تھا اور کچھ نہ تھا..

"میں اپنی بچی کو لینے آئی ہوں.. وہ یہیں کہیں ہے.. میں اس کے بغیر واپس نہیں جاؤں گی.. تم اس گاؤں میں جتنی کدالیں ہیں، وہ لے کر آؤ.. کھدائی کرنے والے لاؤ اور اس گیلی اور ریتلی زمین کو کھودو.. وہ یہیں کہیں ہے، میں محسوس کر سکتی ہوں.. اس کا باپ اور منگیتر تو اسے دیکھ کر گیا تھا اور انہیں قرار آ گیا.. لیکن میں نے اسے دیکھا نہیں.. میں نے تین برس ایک فیکٹری میں مزدوری کر کے اتنی رقم جمع کی ہے کہ یہاں تک آ سکوں۔ اپنی بچی کو دیکھوں اور اسے واپس ہسپانیہ لے جا سکوں، اپنے آبائی قبرستان میں دفن کرنے کے لیے.."

کھدائی شروع ہو گئی..

اور جب رات ہوئی تو اس کا بوسیدہ اور ٹوٹا ہوا تابوت ظاہر ہو گیا.. اور اس کا چہرہ بھی.. نمبردار کا کہنا ہے کہ تین برس بعد بھی اس کے رخسار تمازت سے دہکتے تھے..

وہ ماں اپنی بچی کے تابوت کو واپس ہسپانیہ لے گئی..

تو یہی تھا.. ترچ میر کے تابوت کا قصہ!

اسی لیے ترچ میر میرے لیے ایک ذاتی چوٹی تھی۔

میرے سامنے مبشر اور نمبردار کے قصے زندہ ہوتے تھے۔

”بابا سیار۔ریشن اور کوغزی کی مسجد“

جیپ روڈ چوڑی ہو کر ایک باقاعدہ شاہراہ میں بدلنے لگی۔۔

اور اسے ایک عام کوہستانی راستے کی بجائے ایک ٹرک ایبل روڈ میں بدلنے والے چینی مزدور اور کاریگر تھے۔۔ وہ بجری بچھا رہے تھے، تارکول پگھلا کر بجری کے سنگریزوں کو قید کر رہے تھے اور روڈ بلڈنگ مشینری کو چلا رہے تھے۔۔

ٹریفک کچھ دیر کے لیے رکی رہی۔۔ ہم بھی رکے رہے۔۔

یہ علاقہ براس کہلاتا تھا۔۔

چینی بھائی ایک اٹھتی ہوئی چٹان کو بارود سے اڑا کر پتھروں کو ہٹا رہے تھے۔۔

ٹریفک۔۔ شاہراہ قراقرم کی نسبت۔۔۔ بہت کم تھی۔

راستہ صاف ہوا اور ہماری جیپیں پھر سے حرکت میں آ گئیں۔۔

وادیٔ چترال میں ایک انجانی دہشت کی تنہائی تھی۔۔ ہم اس کی وسعت میں بہت بے توقیر اور بے نام ہو کر سفر کرتے چلے جاتے تھے۔۔

صرف ترچ میر تھی۔۔ اس کی سفیدی تھی۔۔ اس کے قصے تھے جو ہمیں ڈھارس دیتے تھے کہ چلے چلو، ابھی منزل نہیں آئی۔۔

ایک چھوٹی سی آبادی کا ظہور ہوا۔۔

سڑک کے کنارے۔۔۔ دریا سے اوپر۔۔ آپ کو اس سے بچانے کے لیے ایستادہ پتھروں کے پہلو میں ایک مزار تھا۔ چند رنگ رنگ کے جھنڈے تھے جو نیم سرد ہوا میں کبھی کاہلی سے اٹھتے اور سرسراتے تھے اور کبھی تھک ہار کر اپنے ڈنڈوں سے لپٹ جاتے تھے۔۔۔ یہ کسی بابا سیار کا مزار تھا۔

بہت بعد میں شمال کے ایک شیدائی نے مجھے بہت مطعون کیا کہ تم چترال کے سب سے عظیم صوفی شاعر کے مزار سے اگر لاتعلق ہو کر گزر گئے تو تم نے گناہ کیا۔۔ چند لمحوں کے لیے رک کر اس درویش شاعر کی عظمت کو سلام کیوں نہ کیا۔۔ تم نے گناہ کیا۔ بابا سیار چترال کے لیے وہی کچھ ہیں۔۔

جو دہلی کے لیے نظام الدین اولیا ہیں۔۔ اجمیر کے لیے معین الدین چشتی ہیں۔۔ سندھ کے لیے بھٹائی ہیں اور لاہور کے لیے داتا صاحب ہیں۔۔

دراصل ہر درویش، صوفی اور شاعر کا مرتبہ، اس کی درویشی، تصوف اور شاعری کی عرش مزاجی کے مطابق نہیں ہوتا۔ بلکہ اس شہر اور اس مقام کے مطابق ہوتا ہے جہاں وہ دفن ہوتا ہے۔۔ اگر وہ شہر یا مقام متمول ہو، اہم ہو تو وہ بزرگ بھی اہم اور برگزیدہ ہو جاتے ہیں ورنہ۔۔ بابا سیار کی طرح نسبتاً گمنام ہو جاتے ہیں۔۔

داتا گنج بخش بھی اگر لاہور میں نہ ہوتے۔۔۔ کسی گوپس یا وادی ترچ میر میں ہوتے تو شاید اتنے پیر کامل اور مشکل کشا نہ ہوتے۔۔ جتنے کہ اب لاہور میں ہیں۔ اس کے علاوہ شہر کی دولت۔۔ اور ناجائز دولت بھی کسی بزرگ کو برتر ثابت کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوتی ہے۔

بابا سیار کے بعد۔۔ ریشن آیا۔۔

یہ ایک عجب ڈھکا چھپا گاؤں تھا۔۔

یہاں قیام کرنے کے لیے بھی ہمارے پاس ایک کھل جا سم سم کریڈٹ کارڈ تھا۔۔ لیکن یہ کارڈ بھی جس شخصیت کے نام تھا، وہ بھی مستوج کی شہزادی کی طرح نیچے... یعنی چترال شہر جا چکی تھی اور ان کے خدام بار بار مہمان خانے کو کھول کر۔۔ جھاڑ پونچھ کرتے۔۔ ہمیں باور کرواتے کہ اگر ہمارے مالک یہاں موجود نہیں تو آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔۔ آپ کے پاس پرنس محی الدین کا کارڈ ہے۔۔ ایک شہزادے کی گواہی ہے تو آپ معزز مہمان ہیں، یہاں قیام کریں۔۔

ریسٹ ہاؤس کے سامنے اناروں کے چار درخت تھے۔۔

خوبانیوں کا ایک باغ تھا۔۔

ریشن کا نام ہمیں شک میں مبتلا کرتا تھا۔۔ ریشم جیسا ایک گاؤں۔۔

میری بدنی تھکاوٹ نے فیصلہ کر دیا کہ ہم آج کی شب یہیں ریشن میں بسر کریں گے.. لیکن اس لمحے ایک قطعی اور نہایت جامع اعتراض عینی کی جانب سے وارد ہوا "ابو... میں نے ایک ہفتے سے پیپسی کولا نہیں پیا.. اور آپ نے کہا تھا کہ جب ہم چترال پہنچیں گے تو وہاں پیپسی کولا ہو گا.. تو وہ کہاں ہے؟"

"وہ تو چترال شہر میں ہو گا۔"

"تو ابھی سیدھے چترال شہر کیوں نہ چلیں.. اِدھر رات کر کے کیا کریں گے؟"

"بیٹے اِدھر.. ہم کل صبح ریشن کا گاؤں دیکھیں گے.. مقامی تہذیب اور ثقافت کا بغور مطالعہ کریں گے.. خوبانیوں اور اناروں کے باغوں میں پکنک کریں گے۔"

"لیکن ابو... جب ہم اس گاؤں میں داخل ہوئے تھے تو ہم نے تو صرف ورکشاپیں دیکھی تھیں.. جن کے آگے موبل آئل کا کیچڑ تھا اور پرانے ٹریکٹر کھڑے تھے۔"

عینی کا مشاہدہ کسی حد تک درست تھا..

ریشن ایک ایسا گاؤں دکھائی نہ دیتا تھا جہاں ہم ایک لاپتہ میزبان کے باوجود.. ایک آرام دہ ریسٹ ہاؤس میں شب گزارنے کے باوجود... ہر چین ایسی شب گزار سکتے.. دونوں جیپیں پھر سے رواں ہو گئیں..

دھوپ کم ہو رہی تھی..

ہم آج صبح کہاں سے چلے تھے؟ یہ ایک قصہ پارینہ تھا... شاید شندور ٹاپ کے دامن میں کسی ہرچین گاؤں سے چلے تھے... مستوج میں ٹھہرے تھے.. ترچ میر کے قصے سنے تھے.. اور دھوپ کم ہو رہی تھی..

ہم "سروئی" کی مختصر بستی میں سے گزر کر آگے چلے گئے..

آگے، ایک گاؤں کے سرسبز اور پوشیدہ سے.. ہریاول بھرے آثار نظر آئے..

یہ کوغزی تھا..

کوغزی کا نام سن کر... اب بھی.. اتنے برس بعد بھی... میرے دل کی ایک دھڑکن گم ہو جاتی ہے.. جیسے محبوب شکل کا نام بے شک کسی اور مطلب یا معنی میں استعمال ہو تو ایک دھڑکن خاموش ہو جاتی ہے..

ایسے کوغزی... میرا سب سے دل پسند چترالی گاؤں۔

شب کی آمد کی آزردگی میں دائیں جانب ایک ایسی عبادت گاہ کو دیکھا جسے دیکھ لینا اور نہ رکنا ایک گناہ کبیرہ تھا..

جیپ روڈ کے پہلو میں.. لکڑی کا ایک سال خوردہ زینہ.. دو تین قدم رکھنے کے بعد ذرا بلندی پر کوغزی کی یہ مختصر مسجد.. اس لمحے خاموش اور مہکتی ہوئی ٹھنڈک میں بسرام کرتی ہوئی.. چھوٹے سے ہری گھاس سے اٹے صحن میں گلابوں کے چند بوٹے.. ایک سرد اور تنہا خنکی میں کھلتے تھے..

اور شام ڈھل رہی تھی..

ایک چشمہ جانے کہاں سے اترتا تھا.. اس کے صحن میں یوں بہتا تھا جیسے اوپر جو بلند برفیں ہیں، وہ پگھلی ہی کوغزی کی اس پاکیزگی کے لیے ہیں..

ترشنگ کی پگوڈا نما مسجد۔ وادیٔ شگر کی مختصر اور قدیم ترین عبادت گاہ.. قلعہ لاہور کی موتی مسجد... ریلوے لائن کے برابر میں کوئی ایک کمرے کی تازہ قلعی شدہ مسجد جس کی دیوار کے ساتھ ایک ہینڈ پمپ ہے.. اور یہ... کوغزی کی مسجد... ایسے مقام جہاں وہ باقاعدہ محسوس ہوتا ہے، اس کی موجودگی بلاتی ہے... کہ اور کچھ نہ سہی شکرانے کے دو نفل تو ادا کرو..

مسجد کے اندر شمال کی وہی تنہائی اور سرد اداسی تھی.. لکڑی کا ایسا دل کش کام تھا.. ماحول میں اس کی قربت تھی.. ایسی تھی کہ اندر قدم رکھنے والا درویشی میں پہلا قدم رکھتا تھا۔

کوغزی کی اس مسجد میں اگر شہر کا باسی راہبانیت اختیار کر لے.. تو اسے الزام نہیں دیا جا سکتا کہ یہاں ماحول ہی ایسا ہے کہ ترک دنیا پر طبیعت مائل ہونے لگتی ہے.. گھاس اور گل بوٹوں میں بہتے چشمے کے پانیوں سے میمونہ اور عینی وضو کر رہی تھیں اور سلجوق اور سمیر مسجد کے اندر ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

اور یہاں کسی خاص عقیدے کی بنیاد پرستی کی بھی ضرورت نہ تھی۔

اگر کوغزی کی مسجد میں کوئی بدھ آ جاتا.. کوئی ہندو یا پارسی آ نکلتا تو وہ بھی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا..

دل سے، نیت سے جھکنے کیلئے کسی مسجد، مندر یا آتش کدے کی تخصیص نہیں..

اذان کہیں بھی دی جا سکتی ہے..

گھڑیال مندر کا ہو تو بھی بجایا جا سکتا ہے..

کسی بھی ستوپے کے گرد طواف کیا جا سکتا ہے..

مقدس آگ کہیں بھی روشن کی جا سکتی ہے..

اور یہ فیصلہ تو بہت بعد میں ہو گا... لاؤڈ سپیکروں پر چیخنے والے مُلا.. پادری یا بھکشو تو یہ فیصلہ نہیں دے سکتے کہ ان میں سے قبولیت کسے نصیب ہو گی..

معاملہ تو صرف دل کا ہے اور نیت کا ہے..

بس اسی کا اجر ملے گا..

کوغزی... وادئ چترال کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھا.... اس گاؤں کے اوپر گھنے جنگل، برفانی تودے اور وسیع چراگاہیں تھیں.. یہ یہاں سے نظر نہ آتے تھے لیکن ان میں سے جو ہوائیں اترتی تھیں، وہ سنائی دیتی تھیں اور محسوس ہوتی تھیں.. برف بلندیوں سے اترنے والی ندیوں کا شور شام کی آمد سے زیادہ واضح اور اونچا ہوتا جاتا تھا..

یہ ایسی شام تھی جس کی گرفت میں آیا ہوا شخص کہیں کا نہیں رہتا.. ویسے بھی ایسے علاقوں میں پہنچنے والا شخص کہیں کا نہیں ہوتا تو ادھر آ نکلتا ہے..

مسجد کے صحن کے برابر میں جہاں برفانی پانی شور کرتا تھا اور وضو کے لیے تھڑے بنے ہوئے تھے، ان کے عقب میں.. ذرا اندر ہو کر دو نیچی چھت کی کوٹھڑیاں تھیں، گیان دھیان کے لیے.. اور ان کے اندر تاریکی گہری ہو رہی تھی اور ٹھنڈک ٹھہر چلی تھی۔ میں ایک کوٹھڑی کے اندر گیا تو چشمے کا شور ختم گیا.. ایک گہرا نیم تاریک سناٹا سرد ہوتا تھا.. ایک چھوٹا سا کچا روشندان جس میں سے کوغزی کی شام میں ڈھلتی ہریاول اور پہاڑوں کی برفیں دکھائی دیتی تھیں.. فرش پر مہک آور جنگلی گھاس بچھی تھی..

میں ایک کونے میں بیٹھ گیا.. گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ گیا... دنیا اگر باہر کہیں تھی تو اس کی یادداشت گم ہوتی تھی.. خاندان اگر تھا تو بھولتا جاتا تھا.. سب کچھ غیر ضروری ہو گیا... اس کوٹھڑی کی قید مجھے آزاد کرتی تھی..

جیپ کا ہارن مسلسل بج رہا تھا.. ایک صور تھا جو پھونکا جا رہا تھا اور مجھے اس ازلی

آرام سے بیدار ہوتا تھا۔

کوغزی کے بعد... دریا پار جو بلندیاں تھیں، وہ خشک اور بے روح نہ تھیں، ان میں ہریاول اور باغوں کے زینے تھے جو پانیوں تک اترتے تھے.. چولہوں میں سے دھواں اٹھتا تھا... انار کے باغ ڈھلتی شام میں سرد ہوتے تھے... اور پھر یکدم تہذیب کے پھیکے اور بے جان آثار شروع ہو گئے.. عمارتیں، سکول، سرکاری رہائش گاہیں، دفاتر اور ٹریفک... وہ دریا جو کبھی مارخون تھا، کبھی مستوج اور کبھی تھار، دریائے چترال ہوا اور اس پر ایک پُل تھا.. چیو پُل!

اور اس کے پار چترال شہر تھا..

”چترال۔درّہ لواری سرنگ اور بچھو“

”رور سائڈان“ کے پرانی طرز کے آسودگی اور گھریلو خاموشی والے کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں ایک مختصر لان پر کھلتی تھیں جس کے آگے گلاب کی گھنی جھاڑیاں تھیں جن کے پھولوں کا جوبن ٹہنیوں کے بدن سے سہارا نہیں جاتا تھا اور وہ دوہری ہوتی جاتی تھیں کہ گلاب اتنے بڑے اور بھاری مہکتے تھے اور اس لان کے کناروں پر بشام میں دریائے سندھ کی سرمئی چادر کی طرح دریائے چترال کے پانی ایک قدرے بلند سرگوشی میں بہتے چلے جاتے تھے۔.ایک بے جان تسلسل کے ساتھ...ایک ایسے مسلسل بہاؤ کے ساتھ کہ ان کا مدھم شور گلاب کے گل بوٹے، لان کی گھاس اور دروازے کے اندر کمرے میں ہم بستروں پر براجمان ادھر تکتے ایک ہی تصویر ایک ہی موسم کا حصہ بنتے تھے..

”رور سائڈان“ کے پرانی طرز کے آسودگی اور گھریلو خاموشی والے کمروں میں...

چترال مختلف تھا..

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ چترال شہر نے پہلی جھلک میں مجھے مایوسی کی دراڑ میں دھکیل دیا تھا لیکن... یہ ان کوہستانی شہروں اور وادیوں سے مختلف ضرور تھا جہاں میں اس سے پیشتر جا چکا تھا.. دریائے چترال بہت گدلا اور ریت آلود پانیوں کا بہاؤ تھا اور اس کے کناروں پر جو بستی آباد تھی، اس کے مین بازار یعنی شاہی بازار میں سے گزرتے ہوئے مجھ میں ایڈونچر اور نامعلوم کی کشش کا کوئی پاگل خواب نہ جاگا.. کسی گلگت، سکردو، ناران یا چپلو کی صدا نہ آئی۔ کسی بشام کی شام نے آواز نہ دی... نہ من مندر میں کوئی بین باجی جس کی دھن پر میرے اندر کا آوارہ گرد بھیر سانپ پھن پھیلا کر کھڑا ہو

جاتا اور بے اختیار جھومنے لگتا..

چترال مختلف تھا..

شاہی بازار کچھ ایسا بھی شاہی نہ تھا.. وہاں افغانوں اور پٹھانوں کے خوانچے، سبزی کے ٹھیلے، پرانے کپڑوں کے ڈھیر اور چائے خانے تھے اور ویگن سٹینڈ تھے.. دکانیں تھیں، کچھ ہوٹل تھے۔ایک پولیس کانسٹیبل تھا اور اس تنگ بازار میں دندناتی فل سپیڈ میں لڑھکتی جیپیں اور ان سے بچتے راہگیر تھے.. بازار میں جو چہرے تھے، ان میں بھی اجنبیت اور اسرار کی کوئی کشش نہ تھی.. موسم میں بھی کوئی خاص رنگ نہ تھا.. بلکہ ہوائیں ٹھنڈک سے اجتناب کرتی تھیں..

مقامی روایت تھی کہ ایک چترالی قدرے آرام طلب ہوتا ہے.. وہ اگر ایک دن میں بیس روپے کما لے تو تب تک دوبارہ کام پر نہیں جاتا جب تک وہ بیس روپے خلاص نہ ہو جائیں اور ظاہر ہے بچاتا کچھ نہیں..

ایک پٹھان ہر کام کر لیتا ہے.. پنجاب کی کشمیری برادری کی طرح.. مشقت اس کے لیے ایک ایسی محبت ہے جس میں وہ ہمیشہ جتلا رہتا ہے۔وہ روزانہ پچاس روپے کماتا ہے تو ان میں سے صرف پانچ روپے خرچ کرتا ہے اور باقی شلوار کے نیفے میں سنبھال لیتا ہے..

جب کہ ایک افغان.. اگر وہ بدخشاں کا افغان ہے تو محنت مشقت سے اپنا بدن توڑ لیتا ہے، سو روپے روزانہ کماتا ہے اور پھر عمدہ خوراک کھاتا ہے، قہوہ پیتا ہے اور بدخشانی قالینوں پر براجمان ہو کر موسیقی سنتا ہے.. اگر ممکن ہو تو کچھ بچا لیتا ہے اور اگر نہیں تو نہ سہی..

چترال میں جتنے کام محنت اور مشقت کے ہیں، وہ پٹھان اور افغان کرتے ہیں اور چترالیوں کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اس سرزمین کے بیٹے ہیں اور کھوار زبان کی یکتائی اور ثقافت پر فخر کرتے ہیں..

ایک ایسی ثقافت جو چاروں طرف سے بلند اور دشوار گزار پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے.. اس پر بیرونی اثرات کم کم اترتے ہیں..

ایک جانب درّہ لواری.... جو ریاست سوات اور دیر سے آگے اپنے پُرپیچ پہاڑی وجود کے ساتھ سر اٹھائے ایک ناقابلِ عبور فصیل کی صورت کھڑا ہے.. اکثر برف سے ڈھکا رہتا ہے.. اور اگر کھلتا ہے تو ماہ مئی میں.. اگر چترالیوں کی قسمت کھلے تو کھلتا ہے..

لواری... اہلِ چترال کے لیے سانس لینے کا.. باہر کی دنیا سے رابطے کا.. خوراک اور دیگر اشیائے ضرورت کے حصول کا تقریباً واحد راستہ ہے.. یہ بند ہو جاتا ہے تو چترالیوں کے گھروں میں جو چائے بنتی ہے، اس میں شوگر نہیں ہوتی.. ان کے چولہے سرد ہونے لگتے ہیں، مشینیں تھم جاتی ہیں.. ان کے دل تھم جاتے ہیں.. لاہور، پشاور، کراچی یا کوئٹہ میں رہنے والا کوئی شخص قطعی طور پر ایک چترالی کی اس بے بس تنہائی کی بے چارگی سے آگاہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے چاروں جانب راستے کھلتے ہیں.. وہ جب جی چاہے پاکستان کے ہر قصبے، ہر گاؤں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے.. ہر قصبہ، ہر گاؤں اس تک آ سکتا ہے.. بے شک وہ ساری عمر اپنے گھر سے باہر قدم نہ رکھے لیکن اس کے اندر ایک بااختیار وسعت جنم لیتی ہے اور اسے ایک اعتماد دیتی ہے.. کہ وہ کہیں بھی جا سکتا ہے، کچھ بھی حاصل کر سکتا ہے.. چترالیوں کے پاس یہ اختیار نہیں ہے، اعتماد دم توڑ دیتا ہے جب باہر کی دنیا سے وہ مکمل طور پر کٹ جاتے ہیں.. اسی لیے، لواری ان کے لیے ایک زندگی بخش مذہب کی طرح مقدس ہے اور لواری سرنگ ان کے لیے اسرائیلیوں کے من و سلویٰ سے کہیں زیادہ اہم ہے اور ان کے ایمان کا ایک جز ہے.. لواری ٹاپ میں دیر کی جانب سے ایک ایسی سرنگ جو چترال میں آ نکلے، انہیں ہر موسم میں دنیا کے ساتھ ملائے رکھے.. اس کے راستے وہ سانس لے سکیں، یہی ان کا سب سے بڑا خواب ہے.. ذوالفقار علی بھٹو نے ایک ایسی سرنگ کا آغاز تو کیا تھا جو چند کلو میٹر اندر جا کر ٹھپ ہو گئی.. اور اب دیر کی جانب سے درے کے آغاز پر ایک آہنی دروازہ دکھائی دیتا ہے جس کے اندر چند کلو میٹر کی سرنگ ہے اور چترالی اسے حسرت سے تکتے ہیں کہ جانے یہ دروازہ کب کھلے گا اور کب یہ سرنگ پار جائے گی..

لواری ٹنل ایک انتہائی مہنگا پروجیکٹ ہے.. اربوں روپے کی لاگت کا.. چترال کی مختصر آبادی کے لیے اتنی بڑی رقم مختص کرنا معیشت کے ماہرین کے نزدیک ایک حماقت

ہے.. جب کہ پنجاب کے کئی دیہات میں صرف پینے کا پانی حاصل کرنے کے لیے عورتیں دس دس کلو میٹر کا فاصلہ طے کرتی ہیں.. نصف سندھ میں بجلی نہیں ہے، بلوچستان میں سوئی گیس کے باوجود ایسے گاؤں ہیں جہاں تک پکی سڑک بھی نہیں جاتی..

لیکن اہلِ چترال ان تمام حقائق سے باخبر ہونے کے باوجود لواری سرنگ کے خواب دیکھتے ہیں.. اور خواب دیکھنے سے کسی کو بھی روکا تو نہیں جا سکتا..

چترال میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہی لواری سرنگ ہے کہ کم از کم بھٹو نے اس کا آغاز تو کیا.... وہ ابو ظہبی کے سلطان اور ایران کے شہنشاہ کے آگے کشکول پھیلا کر اس قسم کے ناقابلِ عمل منصوبوں کے لیے رقم حاصل کر لیا کرتا تھا.. مجھے کچھ عرصہ پہلے شاہ کے زمانے کے ایک وزیر اعظم کی آپ بیتی کا ایک حصہ پڑھنے کا اتفاق ہوا.. اس کا کہنا ہے کہ شاہ آف ایران بھٹو سے بہت عاجز آیا ہوا تھا کیونکہ وہ ملاقات کا وقت طے کیے بغیر تہران پہنچ جاتا تھا اور کہتا تھا کہ میں نے اپنے عزیز از جان دوست سے ملنا ہے کیونکہ میں اس کے لیے اداس ہو گیا ہوں.. اور جب کئی روز کے لیت و لعل کے بعد مجبوراً اسے شام کے کھانے کے لیے مدعو کر لیا جاتا تھا تو وہ شاہی محل سے رخصت ہونے کا نام نہیں لیتا تھا.. شام بھیگتی تو شاہ صاحب کے لیے عمر خیام کی رباعیوں کی تفسیر کی صورت، آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے.. میز سجا دی جاتی اور بھٹو استاذ ہین اور چالاک شخص تھا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ آتشِ شیراز کے کتنے جرعوں کے بعد آریہ مہر ذرا بہک جاتے ہیں اور وہ ان کا ساتھ دینے کے باوجود چوکنا رہتا تھا اور اس لمحے کا انتظار کرتا تھا.. اور تب اس سابق ایرانی وزیر اعظم کے بقول عین اسی لمحے جب شاہ صاحب بھٹکنے لگتے تھے، بھٹو اپنا کاسۂ گدائی شاہ کے سامنے کھنکھنانے لگتا تھا کہ اے آریہ مہر، شہنشاہوں کے شہنشاہ.. دنیا کے سب سے طاقتور حکمران.. تاابد زندہ رہنے والے اور حکمران رہنے والے تابندہ شاہ.. تیری خیر ہو.. ذرا دیکھ کہ تیری اک عنایت سے میرے چولستان کے فلاں حصے میں ایک ہسپتال بن سکتا ہے.. سندھ میں ایک نہر بن سکتی ہے.. کچھ کرم کر تو لواری ٹنل کا منصوبہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے.. سخی بابا اس کشکول میں کچھ ڈال دے.. اور شاہ اس مخمور اور مخمور حالت میں اسے کچھ نہ کچھ بھیک دے دیتا تھا اور اگلی صبح بہت پچھتاتا تھا.. اسی سابق وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ بھٹو ہمیشہ کسی نہ کسی

منصوبے کے لیے مانگتا تھا.. اپنے لیے کبھی کچھ نہ مانگتا تھا..

بھٹو اگر ایک زمانے میں عوام کا پسندیدہ تھا تو اس کی بھی کچھ وجوہات تھیں اور اگر وہ تختۂ دار تک گیا تو اس کی بھی کچھ وجوہات تھیں.. اور وہ سراسر اس کی اپنی تھیں.. آج بھی نہایت مذہبی اور بنیاد پرست چترالی دکانداروں نے اگر بھٹو یا بیگم بھٹو کی تصاویر آویزاں کر رکھی ہیں تو صرف اس لیے کہ انہوں نے لواری ٹنل کا آغاز کیا تھا..

لواری ٹاپ کے علاوہ دوسری جانب شندور ٹاپ ہے جو چترال کو گلگت سے ملاتا ہے... اور گلگت خود ایک جزیرہ ہے جس پر کبھی جہاز اترتا ہے اور اکثر اوقات نہیں اترتا.. شاہراہ ریشم کا بھی کچھ اعتبار نہیں.. کہ کب بلاک ہو جائے تو اس کا فائدہ...

ایک اور راستہ برادر اسلامی اور طالبانی ملک افغانستان میں سے ہو کر چترال پہنچتا ہے.. لیکن اس راستے میں قباحت صرف اتنی ہے کہ افغانی برادران اسلام دوران سفر اکثر اوقات مسافروں سے اسباب دنیا چھین لیتے ہیں تاکہ ان کی آخرت سنور سکے اور بعض اوقات کسی مسافر کو شرعی طور پر یرغمال بھی بنا لیتے ہیں..

اور آخری رابطہ.. ہوائی جہاز کا ہے.. بے شک پورے پاکستان میں دھوپ آنکھوں کو خیرہ کرتی ہو، موسم نیلے اور چمکیلے ہوں لیکن درہ لواری کے عین اوپر ضدی بادلوں کا ایک ایسا جمگھٹا ہے جو مستقل وہاں قیام پذیر ہے اور پائلٹ کے آگے ایک اندھی دیوار کی طرح حائل ہو جاتا ہے.. میں ذاتی طور پر متعدد بار پشاور سے چترال جانے والی فلائٹ میں تشریف فرما ہوا ہوں.. حفاظتی بند باندھے ہیں.. دوپہر تک باندھے رکھے ہیں اور پھر کھول دیے ہیں کہ خواتین و حضرات درہ لواری پر گھنے بادلوں کی وجہ سے...

چنانچہ اہل چترال کے لیے رابطے کا واحد سانس لواری ہے..

"رور سائڈان" کے پرانی طرز کے، آسودگی اور گھریلو خاموشی والے کمرے کا دروازہ... گلاب کے بھاری پھول اور ان سے پرے دریائے چترال بہتا چلا جاتا تھا..

چترال مختلف تھا..

چترال اور گلگت کے درمیان ہمیشہ سے ایک مخاصمت رہی ہے.. انہوں نے کبھی بھی ایک دوسرے کو قبول نہیں کیا..

چترال ہمیشہ اپنی ثقافت اور زبان کے حوالے سے اپنے آپ کو برتر سمجھتا رہا اور شاید وہ حق بجانب بھی ہے.. اور اس نے گلگت کو ہمیشہ غیر تہذیب یافتہ قرار دیا.. چترال پر امن اور تہذیب یافتہ تھا اور گلگت کی کوئی شناخت نہ تھی.. چترال والے برسک کے سیون اَپ چشمے تک اپنی ریاست پھیلاتے ہیں اور درہ شندور کو اپنی جائیداد گردانتے ہیں.. اگرچہ اب وہ نصف گلگت کا ہے اور بقیہ چترال کے حصے میں آتا ہے.. جب کبھی شندور ٹاپ پر پولو ٹورنامنٹ ہوتے ہیں تو گویا انڈیا پاکستان کے مقابلے ہوتے ہیں.. چترالیوں کے لیے اہل گلگت کے گھوڑے نرے خچر اور گدھے ہیں.. اور گلگت والوں کا کہنا ہے کہ پولو تو ہم نے ایجاد کیا ہے، یہ سست چترالی تو گھوڑوں کی پشت پر سو جاتے ہیں..

ان دونوں وادیوں کی دیرینہ مخاصمت اپنی جگہ.. لیکن میں تو کوہ نورد ہوں.. سیاست دان ہوتا تو کسی ایک کے حق میں فیصلہ کر دیتا.. میرے لیے تمام جھیلیں، تمام برف پوش چوٹیاں، وہ سب وادیاں جو مجھے جینے کا جواز مہیا کرتی ہیں، مقدس ہیں..

میرے نزدیک.. گلگت ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول اور بوٹے ہیں.. ان کے ساتھ کانٹے بھی ہیں۔ قبل از تاریخ کی بود و باش کے آثار ہیں.. بے شمار مذہب اور ثقافتوں کی جنم بھومی ہے.. ان شاندار اور بلند قامت سٹوپوں کے زمیں بوس ہو چکے نشان ہیں جن کا تذکرہ چینی سیاح فاہیان نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ اگرچہ گلگت میں ایسے اکھڑ اور منتقم مزاج قبیلے بھی آباد ہیں جہاں سیاح قدم رکھنے سے گریز کرتے ہیں.. جب کہ وادی چترال کی یکتائی میں کسی کو شک نہیں.. درہ بروغل ہزاروں برسوں سے تہذیبوں کے میل جول کا سنگم رہا ہے.. کھوار زبان اور بابا سیار کے کلام سے کون کلام کر سکتا ہے..

دریائے چترال کے مٹیالے پانیوں پر ایک بے حجاب سرخی اتر رہی تھی اور ان کا بہاؤ جیسے ڈھلتی شام میں تھمنے لگا..

ہم سب "رور سائڈان" کے نہایت دیدہ زیب... مارخور کے سینگوں سے آراستہ، سنو ٹائیگر کی ایک جعلی تصویر سے پیراستہ.. اور چترال کے گزشتہ حکمرانوں کی بھوری اور مدھم تصویروں سے سجائے گئے ڈائننگ روم کی بجائے چترال کے شاہی بازار میں جاکر کسی مقامی خوراک کو نوش کرنے کی خواہش میں کمربستہ ہونے لگے..

اور کمربستہ ہونے کے دوران ہم نے اپنے اپنے جوگرز الٹ پلٹ کر زمین پر پٹخ کر یہ اطمینان کر لیا..

وارڈروب میں سے اپنے ملبوسات نکال کر انہیں بار بار جھٹک کر اطمینان کر لیا کہ ان میں کوئی چترالی بچھو تو پنہاں نہیں ہے..

ہمیں گلگت میں چترال کے بچھوؤں کے بارے میں خبردار کر دیا گیا تھا.. اگرچہ شمال کی سردیوں میں بیشتر حشرات الارض بہت کم پنپتے ہیں لیکن چترال میں وہ بہت تھے اور بہتات میں تھے.. اگرچہ ان کا کاٹا ہوا بار پانی مانگتا تھا اور صرف دو چار روز کے بعد صحت یاب ہو جاتا تھا لیکن.. اگر ان میں سے کوئی ایک بچھو کمینگی پر اتر آئے اور بار بار آپ کو کاٹے تو آپ کی زندگی کی ڈور بھی کٹ سکتی تھی..

ریڈیو پاکستان کے ایک پروگرام پروڈیوسر جو شامتِ اعمال چترال میں تعینات ہو گئے، انہوں نے بھی مجھے نہایت دلچسپ بچھو باتیں سنائی تھیں.. کا کہنا تھا کہ جس کمرے میں وہ رہائش رکھتے تھے، اس کی چاروں دیواروں پر جگہ جگہ سُرخ مار کر کے کراس لگائے گئے تھے.. فرش پر بھی متعدد مقامات پر اس قسم کے کراس تھے اور یہ وہ مقاماتِ خصوصی تھے جہاں انہیں چترال کے قیام کے دوران بچھو رینگتے نظر آئے اور انہوں نے اپنی پاپوش مبارک سے زدوکوب کر کے ہلاک کیا اور پھر جانے والے تیرے قدموں کے نشاں باقی ہیں کے مصداق وہاں کراس لگا دیے.. تاکہ سند رہے.. لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمیں چترال یاترا کے دوران کسی ایک بچھو کا بھی دیدار نہیں ہوا.. یہ ہماری زہرناکی تھی جو انہیں ہم سے دور رکھتی تھی یا پھر یہ ان کے ظاہر ہونے کے موسم نہ تھے..

"قلعہ چترال میں ایک رائل بینکوئٹ اور پرنس چارمنگ"

ہم چترال شہر میں اپنی پہلی شام کے کھانے کے لیے کمربستہ ہو رہے تھے جب ہمارے دروازے پر خفیف سی دستک ہوئی..

چٹخنی اتار کر میں نے دروازہ کھولا۔

ایک نامعلوم صاحب اکڑے ہوئے چترالی رات کی خنکی میں اکڑے ہوئے کھڑے تھے..

"آپ کون ہیں؟" انہوں نے سلام دعا کے بغیر سوال کیا۔

"آپ نے کس سے ملنا ہے؟"

انہوں نے اپنی سفید پٹو کی اونی جیکٹ میں سے اپنا ہاتھ برآمد کیا جس میں ایک چٹ تھی.. اس چٹ کا انہوں نے تادیر مطالعہ کیا اور پھر اٹک اٹک کبھی مجھے دیکھ کر کبھی چٹ کو پڑھتے کہا "آپ... مس مس... تن تن.. سر... ہیں؟"

"میں ہوں—"

"تو پھر آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو شہزادہ صاحب نے اوپر قلعے میں کھانے کے لیے مدعو کیا ہے.."

دریائے چترال کے کناروں پر مہتران چترال کا قدیم اور دیدہ زیب قلعہ تھا اور ہمارا ہوٹل "رور سائڈان" اس کے مین گیٹ کے عین نیچے واقع تھا..

"کب بلایا ہے؟" میں نے اکڑے ہوئے نامہ بر سے دریافت کیا۔

"ابھی.. اور اسی وقت.. فوراً آجائیں کیونکہ شہزادہ صاحب نے بلایا ہے۔"

میں نے پیچھے مڑ کر بیگم کی طرف دیکھا.. میں دل ہی دل میں از حد مسرور تھا کہ آج رات کے کھانے کا متوقع خرچہ بچ رہا ہے اور ایک مفت کی رائل فیسٹ میں شمولیت کا پروانہ مل رہا ہے۔ "کیوں میمونہ؟"

میمونہ نے اس دعوت پر زیادہ مسرت کا اظہار نہ کیا اور اس کے رموز و اسرار پر تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہنے لگی "ٹھیک ہے لیکن یہ جو بھی پرنس ہے چترال کا.. تو بھلا یہ خود دعوت دینے کیوں نہیں آیا.."

"جی صاحب.." میں نے پلٹ کر ان صاحب سے دوبارہ رجوع کیا.. اور وہ چترال کی خنک شب میں مزید اکڑ چکے تھے "وہ.. جو پرنس ہیں تو خود نہیں آئے ہمیں دعوت دینے.."

وہ صاحب اس سوال پر ششدر رہ گئے، گنگ ہو گئے اور دیر بعد ذرا ہوش میں آکر کہنے لگے "وہ.. انہوں نے مجھے بھیجا ہے.. وہ ذاتی طور پر کیسے آتے.. وہ پرنس ہیں۔"

"وہ پرنس ہیں.." میں نے پلٹ کر میمونہ کو اطلاع کی..

"پرنس ہیں تو اپنے گھر میں ہوں گے۔" اس کی سورج بنسی راجپوتی نخوت نے سر اٹھایا۔ "ہم بھی کوئی کمی کمین تو نہیں ہیں کہ منہ اٹھائے ان کی دعوت میں چلے جائیں، بن بلائے.. ہم کوئی دعوتوں کے بھوکے ہیں.."

میں نے ذرا خفیف سا احتجاج کیا "میمونہ بیگم اگر ہم بازار جا کر کھانا کھائیں گے تو پتہ نہیں کیسا کھانا کھائیں گے اور خرچہ بھی ہو گا تو.."

"نہیں ـــ" اس نے اٹوٹ فیصلہ دے دیا"... پرنس ہو گا تو اپنے گھر میں.."

میں نے تقریباً یہی جذبات ذرا ملفوف اور شریفانہ انداز میں ان صاحب تک پہنچا دیئے۔

وہ صاحب ایک مرتبہ پھر ششدر اور گنگ ہوئے اور پھر سر ہلاتے چلے گئے۔

"تم نے ایک مفت کا ڈنر گنوا دیا میمونہ بیگم.." میں نے رنجیدہ ہو کر کہا..

"ہاں.." اس نے بھی اتنی ہی رنجیدگی سے سر ہلایا۔ "اب پتہ نہیں چترال کے بازار میں کیسا مخدوش سا کھانا ملے.. خرچہ بھی ہو گا۔"

"اس وقت تو بڑی راجپوتی شان دکھا رہی تھیں؟"

"وہ تو دکھانی ہی پڑتی ہے ناں.."

ہم غازی اور اسلم کو طلب کر کے بازار جانے ہی والے تھے کہ ایک اور دستک ہوئی۔

میں نے پھر دروازہ کھولا..

"میرا نام میجر شمس ہے.. میں ہز ہائی نیس کا سیکرٹری ہوں.. پرنس ذاتی طور پر آنا چاہتے تھے لیکن قلعے میں مہمان آرہے ہیں.. تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ.. کھانے کے لیے.."

"کیوں میمونہ.." میں نے پلٹ کر ایک رحم طلب نگاہ کی..

"خود آجاتے تو بہتر تھا.. لیکن چلو اتنی محبت سے بلا رہے ہیں بے چارے پرنس۔"

"ریور سائیڈان" کے عین اوپر چترال کے قدیم قلعے کے شاندار چوبی دروازے پر جب ہماری جیپ کی ہیڈ لائٹس نے اس پر جڑے آہنی کیلوں اور کوکوں... اور شکستگی سے دوچار شہتیروں کو روشن کیا تو اس کے بھاری اور بلند کواڑ دھیرے دھیرے یوں وا ہوئے جیسے صدیوں پیشتر افغانستان کی کسی کارواں سرائے کا پھاٹک کسی قافلے کی آمد پر کھلتا تھا..

چوبی دروازے کے اندر ایک ایسی رہائش گاہ تھی جو شاید متروک ہو چکی تھی..

ایسے برآمدے تھے جن میں کوئی نہیں چلا تھا..

محرابیں ایسی تھیں جنہیں تمام کر کسی نے ان کے نیچے بہتے دریائے چترال کو نہیں دیکھا تھا..

اور ان راہداریوں اور برآمدوں کے اندر.. ایک سرنگ نما راستے میں چلتے ہوئے یکدم ایک منظر کھلا.. قلعے کی عمارت کے کہیں اندر.. ایک وسیع باغ تھا، اونچی فصیلوں میں گھرا ایک باغ تھا جس کا منظر کھلا..... چترال کی وادی کی طرح دنیا جہان سے کٹا ہوا ایک بلند چار دیواری کے اندر ایک سبزہ زار تھا اور اس میں.. خنک اور بدن کو سرد کرتی رات میں ایک ایسی دعوت تھی جس میں چترال کی تمام تر بیوروکریسی.. رائلٹی.. اور رعایا کے اہم رکن مدعو تھے..

ایک.. درمیانے قد کے.. نہائت خوش نما.. خوش لباس شخص، ایک سنہری چشمے میں، ہاتھ میں ایک عمدہ چھڑی.. ہماری جانب آئے اور اٹکتے ہوئے لہجے میں کہنے لگے "خوش آمدید تارڑ صاحب.. میرا نام اسد الرحمٰن ہے.. بیگم صاحب میں آپ کو بھی چترال میں خوش آمدید کہتا ہوں۔"

"آپ کیا کرتے ہیں؟" میمونہ نے سوشل ہونے کی کوشش کی..

"میں؟" وہ شخص یعنی اسد الرحمٰن بے حد متعجب ہوئے۔ "میں.. میں تو پرنس ہوں.. کراؤن پرنس ناصر کا چچا.. اور بس.. قلعے کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔"

"آپ یہیں رہتے ہیں؟"

"زیادہ تر تو اسلام آباد میں قیام رہتا ہے۔ چترال ہاؤس میں.. مجھے ابھی ایک ملازم نے بتایا کہ آپ اپنے خاندان کے ہمراہ نیچے ہمارے ہوٹل میں تشریف لائے ہیں تو.. یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ چترال میں ہوں اور ہم آپ کی پذیرائی نہ کریں.."

"آپ نے ہماری پذیرائی کے لیے کچھ زیادہ بندوبست نہیں کر دیا؟" میمونہ نے حیران ہو کر قدیم قلعے کے سبزہ زار میں.. چترال کی رات میں خنکی سے بھیگتے اُن خیموں اور قناتوں کو قدرے متحیر ہو کر دیکھا جن کے نیچے وسیع دستر خوان سج رہے تھے، خادم طشتریاں اٹھائے بھاگ دوڑ کر رہے تھے، ویٹر باوردی کھڑے تھے اور سینکڑوں معزز مہمان ہماری آمد سے قطعی طور پر لا تعلق سوشل گپ شپ میں مصروف تھے..

"بیگم صاحب.. وہ دراصل.." اسد الرحمٰن ذرا سے شرمندہ بھی ہوئے اور سرخ بھی۔ "ہم نے چترال کے نئے ڈپٹی کمشنر کے اعزاز میں.... یہ حقیر سی.. مختصر سی دعوت دی تھی تو آپ آگئے تو.."

"یعنی یہ انتظامات ہمارے لیے نہیں ہیں.." میمونہ بھی ذرا مایوس ہوئی..

"آپ کے لیے بھی ہیں بیگم صاحب.." اسد الرحمٰن مزید سرخ ہوئے۔ "آئیے میں آپ کو مہمانوں سے ملاتا ہوں۔"

روشنیاں اور رونقیں ایک قدیم حصار کے اندر.. چہل پہل.. پاؤں کے راستے گھاس کی ٹھنڈک بدن میں بلند ہو کر ایک کپکپی طاری کرتی ہوئی اور روشن الاؤ کی

تپش اس بدن کو گرماتی اور شرارے اڑاتی ہوئی..

مجھے آج بھی قلعہ چترال میں.. ایک سرد رات میں روشن حصار کے اندر اس ضیافت کے ذائقے یاد ہیں.. روسٹ چترالی بکرے.. پیزا نما روٹیاں.. بھنے ہوئے گوشت کی مختلف اقسام اور فرانسیسی کیک.. جنہیں تیار کرنے کے لیے باورچی اسلام آباد سے آئے تھے۔ مجھے ان ڈپٹی کمشنر کا نام یاد نہیں جن کے اعزاز میں یہ دعوت دی گئی تھی.. اور ہم اس میں محض اتفاقاً مدعو کر لیے گئے تھے.. یوں بھی کسی ڈپٹی کمشنر کا کوئی نام نہیں ہوتا صرف اس کا عہدہ ہوتا ہے..

پرنس اسد نے ایک پل کے لیے ہمیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا.. ہمارا خیال رکھا.. وہ اتنے کیوٹ تھے کہ بچہ لوگ نے انہیں "پرنس چارمنگ" کا خطاب دے دیا..

ہم کہاں سے کہاں آگئے تھے؟

مہتران چترال کی اس تاریخی آماجگاہ کے اندر.. کچی فصیلوں میں گھرے اس سبزہ زار کی رونقوں اور روشنیوں میں کہاں آگئے تھے..

وادی گوپس، پھنڈر اور لنگر کی ندیوں کے پار.. درہ شندور کی کرنٹ مارتی سرد میز کے پار.. ڈیانا اور ضیاء الحق کے رائل اور اسلامی کموڈ کے پار... ہر چین کے قلعے کی شہتوتوں کے رس کی رات سے ادھر.. مستوج کی تاریخی تنہائی سے آگے.. کوغزی کے اناروں میں سے گزرتے ہم کہاں آگئے تھے...

ہم یہاں آگئے تھے..

"تمہاری قسمت میں شہرت اور ناموری تو بہت ہے لیکن ایک ایسے قلعے میں رہنا نہیں ہے۔" میمونہ حیرت سے چترال قلعے کے قدیم در و بام کو تکتی تھی..

"قلعوں میں رہنے والے ہمیشہ قید میں رہتے ہیں.. اپنے ماضی اور روایات کی قید میں رہتے ہیں.. ہم لوگ اپنے حال میں ہوتے ہیں اور مست ہوتے ہیں.. ایسی مستی ان کے نصیب میں کہاں.." اور اس لمحے جب ہم اس بے مثل ضیافت سے پُر ہو چکے تھے، پرنس اسد میرے پاس آئے۔ "تارڑ صاحب.. اس قلعے کا مہمان خانہ ایک عرصے سے بند پڑا ہے.. میں اسے کھلوا کر جھاڑ پونچھ کروا دیتا ہوں۔ میری گزارش ہے کہ آپ یہاں شفٹ

کر جائیں.. جتنے روز چترال میں ہیں، ہمارے مہمان رہیں.. مجھے بے حد مسرت ہوگی۔"

"شکریہ.. لیکن ہم کل صبح شاید گرم چشمہ چلے جائیں.."

"وہاں میرے عزیز پرنس شجاع کا قلعہ اور گھر ہے... میں انہیں فون پر اطلاع کرتا ہوں کہ آپ آرہے ہیں.. لیکن گرم چشمہ سے واپسی پر آپ ہمارے پاس ٹھہریں گے۔"

"واپسی پر تو ہم شاید براہِ راست وادی کالاش چلے جائیں۔"

"کالاش.. وہاں کیا کریں گے.."

"کچھ کفار سے رسم و راہ کریں گے.. اور آخری عمر میں.. عشق بتاں کے بعد... مسلمان ہونے کی کوشش کریں گے.."

"ہاں.. آں—" پرنس اسد بھی بیشتر چترالیوں کی طرح کالاش سے قدرے الرجک تھے۔ "ٹھیک ہے.. لیکن وہاں سے واپسی پر.."

"واپسی پر تو.. شاید ہم وہیں سے اسلام آباد لوٹ جائیں.."

"نہیں.." وہ کچھ کچھ پرنس ہوگئے۔ "آپ کالاش سے واپس چترال تشریف لائیں۔ ہمارے مہمان خانے میں قیام کریں اور پھر.. رختِ سفر باندھیں۔"

"کیوں میمونہ—"

"کیوں نہیں.." وہ فوراً بولی اور پھر میرے نزدیک آکر قدرے رومانوی سرگوشی میں بولی جو کہ عام حالات میں اس سے سرزد نہیں ہوتی۔ "اتنے سویٹ اور کیوٹ قسم کے پرنس ہیں.. اگر ہمیں ذاتی طور پر مدعو کر رہے ہیں تو کیوں نہیں.. ایک پرنس چارمنگ کا دل توڑنا اچھی بات نہیں.."

پرنس چارمنگ اپنی سنہری عینک کو ناک پر درست کرتے ہوئے یہ جانتے تھے کہ ہم جیسے مڈل کلاسیے ظاہری طور پر پھوں پھاں میں رہتے ہیں اور اندر سے ایک قلعے کے شاہی مہمان بننے کے لیے مرے جاتے ہیں..

"لیکن کل تو ہم گرم چشمہ جا رہے ہیں.." میں نے میمونہ سے کہا۔

"ہاں.. کل سویرے تو ہم گرم چشمہ جا رہے ہیں۔"

"تو ہو آیئے—" پرنس اسد نے مسکرا کر کہا۔

"لعلِ بدخشاں کی جانب ایک سفر"

ہم "زور ساندان" سے نکل کر شاہی بازار میں آئے۔ پھر پی ٹی ڈی سی کے موٹل سے گزر کر چیو پل تک آئے..

لیکن ہم واپس نہیں گئے.. چیو پل کے پار نہیں گئے..

دریائے چترال کے اسی جانب.. جس روز سے ہم کوغزی کی جانب سے آئے تھے، اس کے متوازی واپس دریا کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگے..

اگر ہم یہاں سے مسلسل سفر کریں تو ہم اس وادی تک پہنچ سکتے تھے جو ترچ میر کے دامن میں ہے..

یہ ایک واپسی کا سفر تھا لیکن دریا کے کنارے مختلف تھے...

ہم گرم چشمہ کو جا رہے تھے..

گرم چشمہ کی جانب جانے کا مجھے کوئی اشتیاق نہ تھا..

گرم چشمہ.. چترال کی نامور بستیوں میں سے ایک تھا لیکن میں نے اس کے بارے میں کوئی قصے کہانیاں، کوئی دل کشی کی داستانیں نہیں سنی تھیں سوائے اس کے کہ.. وہاں گرم پانیوں کے چشمے ہیں.. اور افغان مہاجرین کی ایک بستی ہے..

تو پھر ہم گرم چشمہ کیوں جا رہے تھے..

صرف اس لیے کہ.. مجھے خبر ہوئی تھی کہ گرم چشمہ سے پرے ایک مختصر سی مسافت ہے.. پھر ایک درّہ آتا ہے جو چترال اور افغانستان کے صوبے بدخشاں کی سرحد ہے.. اس بدخشاں میں داخل ہوتے ہی ایک جھیل ہے.. وہاں تک جانے میں کوئی پابندی نہیں.. کوئی رکاوٹ نہیں.. ہم آسانی سے بدخشاں میں اتر سکتے ہیں، اس جھیل

کنارے جاسکتے ہیں.. چنانچہ وہ بدخشانی جھیل ایک لعل کی طرح ہمارے تصور میں لَو دیتی تھی..

ایک لعل بدخشاں کی جانب ہم سفر کرتے تھے.. بے شک یہ لعل بھی غزنی اور ہرات کی طرح ایک اجڑا ہوا دیار ہو لیکن بدخشاں کے نام کے طلسم کا قدیم سکہ ہر زمانے میں رائج رہا ہے.. بدخشاں کے شہزادے اور پردہ پوش شہزادیاں.. داستان گو اور سوداگر..

تو ہم اگر گرم چشمہ جاتے تھے تو دراصل بدخشاں کے طلسم کے اسیر ہوئے جاتے تھے.. اور وہاں ایک جھیل تھی.. جس کی تصویریں میں نے پرنس اسد کی البم میں دیکھی تھیں.. زرد پہاڑوں میں ایک ٹھہرا ہوا منجمد زمرد جڑا ہوا..

تصویروں میں بھی جھیل کے پانیوں میں ایسی نازک نیلاہٹ تھی کہ ان پر تادیر نظر رکھنے سے وہ ٹوٹتی تھی..

ہم اس بدخشانی جھیل پر کچھ دیر نظر کرنے کے بعد شام سے پہلے گرم چشمہ لوٹنا چاہتے تھے..

گرم چشمہ روڈ میں ایک کوہستانی راستے کی خطرناکی اور منظروں کی دل کشی کا کوئی ہیجان، کوئی جوش نہ تھا.. اس پر ہماری جیپیں بہت سرد مزاج اور ایک اکتا دینے والے تسلسل کے ساتھ چلی جاتی تھیں..

دریائے چترال کا پاٹ چوڑا ہونے لگا اور دوسری جانب جو شندور روڈ تھی جس پر ہم سفر کر کے چترال پہنچے تھے، دور ہونے لگی..

پھر دریا گہرائی میں چلا گیا۔ یوں کہ اس کے دونوں جانب ایک دوسرے کے متوازی جو سڑکیں تھیں، خاصی بلندی پر ہو گئیں اور ان کے نیچے سرسبز کھیتوں اور باغوں میں بہت تنہا لیکن خوش نما گھر نمایاں ہونے لگے... کوغزی سے آتے ہوئے میں نے یہی خوش نظر مکان دریا کے پار دیکھے تھے اور اب وہ گرم چشمہ روڈ کے دائیں جانب دریا کے اس طرف گزرتے تھے.. ان مکانوں کے گرد باغ اور کھیت ڈھلوانوں پر اترنے لگتے تھے اور ان میں کچھ راستے نیچے دریا کی سطح تک جاتے تھے.. پاپلر کے ایک جھنڈ اور سیب کے باغوں میں گھرا ہوا ایک تنہا مکان ایسا نظر آیا جو ایک لمحے کے لیے

دکھائی دیا لیکن بہت دور تک اس کا نقش میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوا... کسی محبت کی رفاقت کے لیے وہ ایک ناممکن خواب دیر تک آنکھوں سے اوجھل نہ ہوا..

دوپہر کی دھوپ زرد ہوتی تھی۔ جب ہم دریائے چترال سے منہ موڑ کر گرم چشمہ کی وادی کے اندر سفر کرنے لگے..

یہاں ہریاول پھر سے ناپید ہوئی اور خشک چٹانوں نے سر اٹھایا.. ایک تیز رفتار ندی جھاگ کے چھینٹے اڑاتی تقریباً ہموار علاقے میں سے بہتی چلی آتی تھی.. یہ ندی بدخشاں کے پہاڑوں میں سے جنم لے کر وادی میں اتر رہی تھی اور شنید تھی کہ اس کے پانیوں میں بھی ٹراؤٹ مچھلی کثرت سے پائی جاتی ہے..

سڑک کے کنارے ایک دیدہ زیب افغان بزرگ ایک نہایت نخریلے اور چمکتے گھوڑے کی باگ تھامے چلے آ رہے تھے.. اور گھوڑے پر ان کا چادروں میں لپٹا خاندان سوار تھا..

بدخشانی ندی کے کنارے "گرم چشمہ" کا بورڈ نظر آیا..

اور پھر گرم چشمہ کی مختصر آبادی نظر آئی..

اس ندی کے کناروں پر ایک خشک پہاڑی سلسلے میں دوپہر کی زرد دھوپ میں ہم نے جو کچھ دیکھا، اس میں ویرانی بہت تھی.. چند سرکاری عمارتیں.. جھونپڑے.. کچھ مکان، ایک ہوٹل، ایک بازار اور ان پر جھکی ہوئی نیم پوشیدہ وہ رہائش گاہ جس میں پرنس شجاع کا قیام تھا.. اور اس کے برابر میں اس چشمے کے آثار جو اتنا گرم تھا کہ بھاپ اڑاتا تھا اور چترال بھر سے لوگ اس میں اشنان کرنے کے لیے آتے تھے..

ایک چترالی وکیل اپنے برخوردار کے ہمراہ ہمیں گائیڈ کرنے یا مس گائیڈ کرنے کے لیے ہمارے ساتھ چلے آئے تھے۔ انہوں نے میرے چہرے پر مایوسی کی کوئی پرچھائیں دیکھی تو کہنے لگے۔ "کچھ عرصہ پہلے گرم چشمہ بہت آباد تھا.. ادھر سے افغانستان کی جنگ کے لیے ہتھیار اور دیگر ساز و سامان سپلائی ہوتا تھا۔ ادھر سے ہزاروں بدخشانی ہجرت کر کے ادھر آئے اور ندی کے برابر میں ایک بستی آباد کر لی... ان میں سے بیشتر اب وطن واپس جا چکے ہیں اور گرم چشمہ بے رونق ہو گیا ہے۔"

"صاحب ادھر ٹھہرے گا ناں.." غازی نے جیپ آہستہ کر لی..

"نہیں ابھی ہم بدخشاں جائیں گے.. جھیل کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کریں گے اور واپس آجائیں گے.. چلے چلو۔"

ہماری جیپیں گرم چشمہ سے نکل کر بدخشانی ندی کے کنارے بلند ہونے لگیں اور اس کے ساتھ ہی روڈ کی حالت بھی دگرگوں اور پتھریلی ہونے لگی..

"ہم کتنی دیر میں اس جھیل کے کناروں تک پہنچ جائیں گے؟" میں نے وکیل صاحب سے پوچھا..

"شام سے پہلے پہنچ جائیں گے انشاءاللہ.. دو تین گھنٹے کی مسافت پر ایک درّہ ہے اور اس کے پار جھیل ہے.. آپ دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔"

جیپیں سوئے بدخشاں دھول اڑانے لگیں۔

نہ صرف یہ کہ روڈ بے حد خراب ہو رہی تھی بلکہ کئی مقامات پر پتھر راستہ روکتے تھے.. اور انہیں ہم سب مل کر دھکیلتے تھے اور ندی میں گرا کر راستہ صاف کرتے تھے..

دھوپ کی زردی میں سیاہی کی آمیزش کا شائبہ ہونے لگا..

"ہم واپس بھی تو اسی راستے سے آئیں گے۔" میں نے تھکاوٹ اور بوریت کے لہجے میں وکیل صاحب سے دریافت کیا جو یہ ٹرپ ہم سے زیادہ انجوائے کر رہے تھے..

"ظاہر ہے۔" انہوں نے دانش مندی سے سر ہلایا۔

"اور شب کی تاریکی میں واپسی ہوگی.."

"ظاہر ہے.." انہوں نے مزید دانش مندی سے سر ہلایا..

کیا بدخشاں کی ایک جھیل کو صرف ایک نظر دیکھنے کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لینا چاہیے کہ آپ کا پورا خاندان سفر میں ہو اور رات کی تاریکی میں بلند درے سے نیچے اترتے ہوئے آپ اس مخدوش روڈ پر ہوں.. جس پر جابجا پتھر بکھرے ہوئے تھے..

زردی جو دھوپ میں تھی، ڈھلتی شام کے آگے ایک خادمہ کی طرح جھکتی جا رہی تھی.. راستہ بلند ہونے کے ساتھ ساتھ دشوار بھی ہو رہا تھا اور جیپیں اپنا پورا زور لگا رہی تھیں.. اور ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ابھی بدخشاں کتنی دور ہے..

لیکن بدخشاں زیادہ دور نہیں ہو سکتا تھا.. کیونکہ اسی راستے پر بدخشاں لوٹنے والے افغان مہاجرین بھی چلتے تھے.. جو صاحب حیثیت تھے ان کا مال اسباب گھوڑوں

پر لدا تھا.. مڈل کلاس کی سواری پستہ قد گدھے تھے اور جو مسکین تھے، وہ اپنے سروں پر بوجھ اٹھائے وطن کا رخ کر رہے تھے.. تھک جاتے تو سڑک کے کنارے قالین بچھا کر اس پر سستانے لگتے اور جب ہماری جیپیں دیکھتے تو اس آس میں کھڑے ہو جاتے کہ شاید ان میں کوئی گنجائش ہو.. اور جب سائے لمبے ہونے لگے تو میں تشویش میں مبتلا ہوا..

ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں آیا.. ہم آرمی کی جیپوں میں سوار ہیں، ڈرائیور بھی فوج کے ہیں اور اکڑی ہوئی وردیوں اور بیری کیپس میں ملبوس ہیں.. بدخشاں بہر طور ایک غیر ملک میں واقع ہے اور وہاں حالات پتہ نہیں کیسے ہیں، کہیں کوئی اور مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے.. چنانچہ واپسی کا طبل بجانے کے لیے ڈھلتی شام کے علاوہ یہ فوجی جواز بھی کافی تھا..

"غازی... واپس چلو یار... جیپ موڑ لو.."

"درہ تو سامنے دکھائی دے رہا ہے۔" وکیل صاحب کہنے لگے۔ "اور اس کے پار جھیل ہے.. ہم لوگ اکثر پکنک منانے کے لیے ادھر جاتے رہتے ہیں۔"

"بس آپ کی گواہی پر ہم اعتبار کرتے ہیں کہ درے کے دامن میں جھیل ہے.. غازی واپس چلو۔"

غازی نے سٹیرنگ موڑا... جیپ کو متعدد بار اس تنگ راستے سے موڑنے کے لیے بیک کیا اور گرم چشمہ کی جانب رخ کر لیا.. اسلم بہت پیچھا تھا.. اس نے ہمیں پسپا ہوتے دیکھا تو وہ بھی وہیں سے بیک آؤٹ کر گیا.. اب اس کی جیپ جس میں سلجوق اور سمیر سوار تھے، بدخشانی ندی کے کنارے اٹھتی ہوئی روڈ پر شام کی اترتی سیاہی میں ڈھلتی دھول اڑانے لگی.. اور یہ دھول بھی اب سیاہی مائل لگتی تھی.. جب ذرا بلندی ہوتی تو اس پر چند کرنیں نچھاور ہو کر اس کے ذروں کو نمایاں کرتیں..

ہماری قسمت میں جھیل کا لعل بدخشاں نہ تھا..

"گرم چشمہ اور اجڑتی بدخشانی بستی"

گرم چشمہ میں ہمارے قیام کا بندوبست ایک بے وجہ مجھ سے الفت کرنے والے ایس ڈی او... نادر جان نے کیا تھا..

"آپ سر ادھر پرائم منسٹر ہاؤس میں رات کریں گے۔" چترال سے چلتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "میں نے آپ کی آمد کی اطلاع کر دی ہے۔"

"پرائم منسٹر ہاؤس؟... وہ تو غالباً اسلام آباد میں ہے۔"

"ایک گرم چشمہ میں بھی ہے" ستواں ناک اور سفید رنگت والے نادر جان ایک نیلی جیکٹ میں بہت جچتے ہوئے مسکرانے لگے۔ "ایک بار وزیر اعظم صاحب گرم چشمہ میں آئے تھے تو خصوصی طور پر ایک ریسٹ ہاؤس کو ان کے شایان شان بنانے کے لیے شاندار اخراجات کیے گئے تھے.. تب سے وہ پرائم منسٹر ہاؤس کہلاتا ہے.."

اور یہ پی ایم ہاؤس اگرچہ نو تعمیر شدہ تھا.. اس کے کمروں میں اور باتھ روموں میں بڑے شہروں کی آسائشیں مہیا کی گئی تھیں.. کمروں کے درمیان میں گیلری کے نیچے ایک ڈھکے ہوئے خالی سوئمنگ پول کے آثار تھے جس میں گرم چشموں کے گرم پانیوں کے پائپ آتے تھے اور معززین کی آمد پر اسے لبریز کیا جاتا تھا.. اور ایک شاندار پرائیویسی میں معززین اس میں ڈبکیاں لگا کر راحت حاصل کرتے تھے.. اس کا خالی ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ ہم معززین میں شامل نہ تھے.. لیکن یہ دیار اجڑ رہا تھا..

دیواروں کے پینٹ چپے چپے اتر رہے تھے.. باتھ روموں کی ٹائلز اکھڑ رہی تھیں اور فلش کام نہیں کرتے تھے.. قالین پھٹ چکے تھے.. کسی ایک وزیراعظم کی کسی ایک شب کے لیے اسے تعمیر کیا گیا تھا اور یقیناً اس وزیراعظم کو چند روز بعد یاد بھی نہیں رہا ہوگا کہ اس

مقام کا کیا نام تھا جہاں وہ کسی شام تقریروں اور وعدوں سے نڈھال ہو کر کسی بستر پر گرا تھا... لیکن اہل چترال کے لیے یہ ریسٹ ہاؤس ایک لینڈ مارک تھا اور اس پر پاکستان کا پرچم اب بھی قدرے سوگواری اور ویرانی سے کبھی کبھار بدخشانی ندی کے اوپر چلنے والی تیز ہوا کے زور سے لہراتا تھا اور سمٹ جاتا تھا۔

اس پرائم منسٹر ہاؤس کا اپنے چار چفیرے سے کوئی رابطہ کوئی میل نہ تھا..

یہ جدید تہذیب کا ایک کھنڈر تھا اور ہم اس میں قیام کرنے والے واحد مہمان تھے..

ہماری آمد سے پیشتر ہی اوپر سے بلاوا آ چکا تھا "اگرچہ پرنس شجاع گرم چشمہ میں نہیں ہیں، وہ پشاور جا چکے ہیں لیکن آپ اور آپ کے اہل خانہ رات کا کھانا ہمارے ہاں کھائیں گے.." اور اوپر سے جو بلاوا آتا ہے، اسے ٹالا نہیں جا سکتا.. اور ہم ٹالنا بھی نہیں چاہتے تھے بلکہ الٹا اشتہا رکھتے تھے..

پرنس شجاع کی رہائش گاہ ہمارے ریسٹ ہاؤس کے عقب میں واقع ایک پہاڑی پر تھی۔ چنانچہ رات کی تاریکی میں ہم کوہ پیمائی کرتے کرتے نڈھال ہو گئے..

بائیں جانب وہ حمام اور کمرے نظر آ رہے تھے جن میں گرم چشمے کے پانی روک کر ان سے اشنان کیا جاتا تھا..

ایک پژمردہ سی عمارت تک پہنچے... خاموش اور اداس سی.. میمونہ اور عینی اس کے مہمان خانے کے اندر کھلتی ایک کھڑکی میں سے سر جھکا کر اپنے آپ کو سنبھالتیں روپوش ہو گئیں.. کھڑکی کسی باغ میں کھلتی تھی جس کے آخر میں زنان خانہ اور گھر کے بقیہ حصے تھے.. ہم ایک چپ اور ویران کارواں سرائے میں جو کہ پرنس شجاع کا مہمان خانہ تھا، چپ بیٹھے رہے..

ہم سب خاموش تھے کہ گرم چشمہ کی تنہائی اور دور افتادگی میں ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا..

ہمارے وکیل گائیڈ نہایت مؤدب ہو کر سر جھکائے بیٹھے تھے کہ ان کے دل میں اب بھی چترال کی متروک شدہ رائلٹی کا احترام موجود تھا..

مہمان خانے کے باہر شب کے مہر بلب اندھیروں میں کوئی باغ تھا..

”گرم چشمہ اور اجڑتی بدخشانی بستی“

گرم چشمہ میں ہمارے قیام کا بندوبست ایک بے وجہ مجھ سے الفت کرنے والے ایس ڈی او... نادر جان نے کیا تھا..

”آپ سر ادھر پرائم منسٹر ہاؤس میں رات کریں گے۔“ چترال سے چلتے ہوئے انہوں نے کہا تھا ”میں نے آپ کی آمد کی اطلاع کر دی ہے۔“

”پرائم منسٹر ہاؤس؟... وہ تو غالباً اسلام آباد میں ہے۔“

”ایک گرم چشمہ میں بھی ہے“ ستواں ناک اور سفید رنگت والے نادر جان ایک نیلی جیکٹ میں بہت جچے ہوئے مسکرانے لگے۔ ”ایک بار وزیر اعظم صاحب گرم چشمہ میں آئے تھے تو خصوصی طور پر ایک ریسٹ ہاؤس کو ان کے شایان شان بنانے کے لیے شاندار اخراجات کیے گئے تھے.. تب سے وہ پرائم منسٹر ہاؤس کہلاتا ہے..“

اور یہ پی ایم ہاؤس اگرچہ نو تعمیر شدہ تھا.. اس کے کمروں میں اور باتھ روموں میں بڑے شہروں کی آسائشیں مہیا کی گئی تھیں.. کمروں کے درمیان میں گیلری کے نیچے ایک ڈھکے ہوئے خالی سوئمنگ پول کے آثار تھے جس میں گرم چشموں کے گرم پانیوں کے پائپ آتے تھے اور معززین کی آمد پر اسے لبریز کیا جاتا تھا.. اور ایک شاندار پرائیویسی میں معززین اس میں ڈبکیاں لگا کر راحت حاصل کرتے تھے.. اس کا خالی ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ ہم معززین میں شامل نہ تھے.. لیکن یہ دیار اجڑ رہا تھا.. دیواروں کے پینٹ چپہ چپہ اتر رہے تھے.. باتھ روموں کی ٹائلز اکھڑ رہی تھیں اور فلش کام نہیں کرتے تھے.. قالین پھٹ چکے تھے.. کسی ایک وزیر اعظم کی کسی ایک شب کے لیے اسے تعمیر کیا گیا تھا اور یقیناً اس وزیر اعظم کو چند روز بعد یاد بھی نہیں رہا ہوگا کہ اس

مقام کا کیا نام تھا جہاں وہ کسی شام تقریروں اور وعدوں سے نڈھال ہو کر کسی بستر پر گرا تھا... لیکن اہل چترال کے لیے یہ ریسٹ ہاؤس ایک لینڈ مارک تھا اور اس پر پاکستان کا پرچم اب بھی قدرے سوگواری اور ویرانی سے کبھی کبھار بدخشانی ندی کے اوپر چلنے والی تیز ہوا کے زور سے لہراتا تھا اور سمت جاتا تھا۔

اس پرائم منسٹر ہاؤس کا اپنے چار چفیرے سے کوئی رابطہ کوئی میل نہ تھا..

یہ جدید تہذیب کا ایک کھنڈر تھا اور ہم اس میں قیام کرنے والے واحد مہمان تھے..

ہماری آمد سے پیشتر ہی اوپر سے بلاوا آ چکا تھا۔ ”اگرچہ پرنس شجاع گرم چشمہ میں نہیں ہیں، وہ پشاور جا چکے ہیں لیکن آپ اور آپ کے اہل خانہ رات کا کھانا ہمارے ہاں کھائیں گے..“ اور اوپر سے جو بلاوا آتا ہے، اسے ٹالا نہیں جا سکتا.. اور ہم ٹالنا بھی نہیں چاہتے تھے بلکہ الٹا اشتہا ور کھتے تھے..

پرنس شجاع کی رہائش گاہ ہمارے ریسٹ ہاؤس کے عقب میں واقع ایک پہاڑی پر تھی۔ چنانچہ رات کی تاریکی میں ہم کوہ پیمائی کرتے کرتے نڈھال ہو گئے..

بائیں جانب وہ حمام اور کمرے نظر آ رہے تھے جن میں گرم چشمے کے پانی روک کر ان سے اشنان کیا جاتا تھا..

ایک پژمردہ سی عمارت تک پہنچے... خاموش اور اداس سی.. میمونہ اور عینی اس کے مہمان خانے کے اندر کھلتی ایک کھڑکی میں سے سر جھکا کر اپنے آپ کو سنبھالتیں روپوش ہو گئیں.. کھڑکی کسی باغ میں کھلتی تھی جس کے آخر میں زنان خانہ اور گھر کے بقیہ حصے تھے.. ہم ایک چپ اور ویران کارواں سرائے میں جو کہ پرنس شجاع کا مہمان خانہ تھا، چپ بیٹھے رہے..

ہم سب خاموش تھے کہ گرم چشمہ کی تنہائی اور دور افتادگی میں ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا..

ہمارے وکیل گائیڈ نہایت مؤدب ہو کر سر جھکائے بیٹھے تھے کہ ان کے دل میں اب بھی چترال کی متروک شدہ رائلٹی کا احترام موجود تھا..

مہمان خانے کے باہر شب کے مہر بلب اندھیروں میں کوئی باغ تھا..

سر شام کیسا نظارہ تھا مرے باغ میں.. ترے ساتھ ایک ستارہ تھا مرے باغ میں.. اور اس باغ کے آسمان پر.. مہمان خانے کی کھلی کھڑکی میں سے ایک ستارہ دکھائی دیتا تھا.. پھر جھکے جھکے خدام اندر آنے لگے..

طعام اور لذتیں سجانے لگے..

میں بھی چترالی مہمان نوازی کی وسعت ذائقہ سے ہر چھین اور اس کے بعد چترال فورٹ میں آشنا ہو چکا تھا.. لیکن یہاں گرم چشمہ میں بدخشاں کا اثر تھا.. ہمارے لیے اجنبی کھانے تھے.. ان میں بدخشانی ندی میں سے شکار کی گئی ٹراوٹ مچھلی بھی تھی جسے اہل چترال بد قسمتی سے کسی روڈ رولر کے نیچے رکھ کر بالکل فلیٹ کر دیتے تھے اور پھر تلتے تھے اور اسے مچھلی پکوڑہ قسم کی کوئی چیز بنا دیتے تھے.. پنیر اور قیمے کی روٹیاں تھیں. مرغ اور مچھلی کے کباب اور بدخشانی پلاؤ تھا.. روسٹ گوشت کی کچھ اقسام تھیں—— خوبانیوں کا سالن تھا اور شہتوتوں کے کیک اور شہد تھا..

قہوے کے فنجان ہمارے سامنے بوسیدہ ہوتے بدخشانی قالینوں پر رکھے گئے تھے..

بس ایک الجھن تھی کہ میزبان کوئی نہ تھا صرف خدام حاضر تھے..

گئی رات جب ہم لالٹینوں اور گیس لیمپس کی روشنی میں اپنے پرائم منسٹر ہاؤس کو اترتے تھے تو میمونہ میرا بازو تھام کر کہنے لگی "مہمان خانے سے اوپر جو رہائش گاہ تھی جہاں ہم گئے تھے، وہاں پرانے ستون اور محرابیں تھیں اور باغ تھے.. کاش آپ انہیں دیکھ سکتے.. پرنس شجاع کی بیگم اور والدہ تھیں اور نہایت پر شکوہ تھیں، کاش آپ انہیں دیکھ سکتے.."

بدخشانی مہاجر بستی میں اب بہت کم لوگ تھے..

گرم چشمے اور بدخشانی ندی کے درمیان جو ایک مہاجر بستی برسوں سے آباد تھی، وہ آہستہ آہستہ اجڑ رہی تھی..

بدخشاں کے پناہ گزیں اپنے وطن کو واپس جا رہے تھے.

بھلا اپنے بدخشاں کو چھوڑ کر کون پرائے گرم چشمہ میں تادیر رہ سکتا ہے.. یہ صرف مجبوری تھی..

مجبوری کا اختتام نظر آیا تو ان میں سے بیشتر اپنے گھروں کی راہ لے رہے تھے..

ایک بدخشانی بزرگ نے شاید اپنے گدھے کو اوور لوڈ کر دیا تھا.. گدھا اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھا احتجاج کر رہا تھا اور بزرگ اس کے گلے میں بندھی رسّی کو اپنی پوری قوت سے کھینچ رہے تھے.. ان کے اہل خانہ گدھے کے اٹھنے کے منتظر تھے اور بچے بزرگ سے چھیڑیں کر رہے تھے.. یہ خاندان بھی بستی کو چھوڑ رہا تھا..

بازار میں ابھی چند دکانیں کھلی تھیں.. زیادہ تر کاروبار ان جیکٹوں اور بوٹس کا تھا جو دوسرے ملکوں سے مجاہدین کے لیے بھیجے گئے تھے.. کرنسی کا لین دین بھی ہو رہا تھا.. آپ ان سے ڈش مارک اور ڈالر خرید سکتے تھے.. افغان کرنسی کے ناپائیدار پلندے حاصل کر سکتے تھے..

کچھ قہوہ خانے بھی موجود تھے جن کی دیواروں پر احمد شاہ مسعود کی تصویر لا پرواہ چترالی ٹوپی میں وطن کی آزادی کے خواب دیکھتی تھی.. اور تب مسعود نہیں جانتا تھا کہ کبھی پشتون طالبان بھی آئیں گے اور "جہاد" کا رخ اس کی جانب ہو جائے گا.. وہ مزار شریف کھو دے گا اور بدخشاں سے پھر قافلوں کا رخ گرم چشمہ کی جانب ہو جائے گا..

ایک مقامی گرم چشمی (بروزن نور چشمی) نے ہمیں بتایا کہ یہ بدخشانی عجیب لوگ ہیں.. دیگر افغانیوں سے سراسر مختلف.. ان کی مشقت میں کوئی کلام نہیں.. اپنے کچے جھونپڑوں کی دیواروں پر چھینٹ کے رنگا رنگ کپڑے چسپاں کر کے انہیں دیدہ زیب بناتے ہیں.. مٹی کے فرش پر بدخشانی قالین بچھاتے ہیں.. اپنے گھروں کو چھوڑتے ہوئے وہ اپنے ساتھ اور کچھ لائیں یا نہ لائیں اپنے قالین ضرور ساتھ لے آتے ہیں.. اور پھر ان قالینوں پر اکڑوں بیٹھ کر فنجان سامنے رکھ کر بدخشاں سے لائے ہوئے نازک پیالوں میں قہوہ نوش کرتے ہیں.. کھانے کا بھی نہایت نفیس اہتمام کرتے ہیں اور مقامی آبادی سے بہت کم میل جول رکھتے ہیں.. ان کی لڑکیاں سب کی سب لعل بدخشاں ہوتی ہیں اور اگر کبھی ان کے لیے کوئی مقامی رشتہ آ جائے تو مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں.. کچھ عجیب سے لوگ ہیں..

آج سویرے ہم نے اپنے پرائم منسٹر ہاؤس کے برابر میں پرنس شجاع کی

ہدایت پر ایک ایسے ہوٹل میں پر لطف ناشتہ کیا جس کا پنجابی منیجر جین اور فل بوٹ پہنے اب ایک لاوارث اور گمشدہ بچے کی طرح اس بدخشانی بازار میں گھومتا تھا.. ہوٹل آراستہ دکھائی دیتا تھا اور اس کے درمیان میں ایک سوئمنگ پول بھی تھا اور قابل فہم طور پر وہ گرم چشمے کے پانیوں سے لبریز کیا جاتا تھا..

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم ایک مرتبہ پھر بدخشاں جانے والی روڈ پر کچھ دور گئے اور اس کے پہلو میں بہنے والی تیز رفتار اور جھگوڑی ندی میں ان ٹراؤٹ مچھلیوں کو تلاش کیا جو ہماری قسمت میں نہ تھیں۔

بچے لوگ بار بار اپنی ڈور کاسٹ کرتے اور اس کے اختتام پر مچھلی کے لیے جو "جھانسہ" تھا وہ ندی کے پانیوں کی گردش میں آکر خالی باہر آجاتا..

اور تب سلجوق نے نعرہ لگایا "ابو مچھلی.."

اور یہ مچھلی اتنی نوزائیدہ اور مختصر تھی کہ اس پر ترس کھا کر اسے پھر سے بدخشانی ندی کے سپرد کر دیا گیا..

پچھلے پہر ہم چترال کو واپس ہوئے.. براہ راست وادی کالاش جانے کی بجائے ہم آج کی شب چترال شہر میں بسر کرنا چاہتے تھے۔

اگرچہ گرم چشمہ نے ہمیں کسی ہیجان خیز جذبے سے روشناس نہ کیا.. اس کی خاموشی اور سکوت نے ہمیں آزردہ کیا لیکن اس کے کناروں پر ایک باغ تھا.. بدخشانی قالین اور قہوے کے فنجان تھے اور وہ ایک ٹراؤٹ مچھلی تھی جسے سلجوق نے واپس بدخشانی ندی میں پھینک دیا تھا..

اور اس کے کناروں پر جو باغ تھا، اس سے پرے بدخشاں کی وہ جھیل تھی جس تک ہم پہنچ نہ پائے تھے.. جس کے پانیوں، وہ لعل الاؤ کی طرح جلتے تھے جن کے قصے ہم سنتے آئے تھے..

"بیک ٹو چترال"

چترال محل کے برآمدوں میں، اس کی سرخ محرابوں کے اندر قدیم نقش و نگار کے ایسے قالین بچھے تھے جو بوسیدگی کی منزلوں تک پہنچے ہوئے تھے..

ان محرابوں کے نیچے ایک دالان تھا جس میں قلعے کا پھاٹک کھلتا تھا اور دالان کے نیچے گہرائی میں دریائے چترال تھا، کناروں پر شہر تھا اور شہر سے پرے ترچ میر کی برفیں تھیں..

برآمدوں میں ماضی کے مہتروں یا ان کے شکاریوں کے ہاتھوں مارے گئے جانوروں کے بھُس بھرے سر اور سینگ آویزاں تھے اور ان کی شیشہ آنکھیں جھپکتی نہ تھیں۔ بس اسی جانب مسلسل دیکھتی تھیں جہاں محرابوں سے پرے دریائے چترال تھا، شہر تھا اور ترچ میر تھی۔

دیواروں پر پرانی زرہ بکتریں اور ڈھالیں اور تلواریں زنگ آلود ہوتی تھیں..

پرنس اسد کے آباؤ اجداد کی تصویریں ان کی تاریخ کی طرح مدھم ہوتی جاتی تھیں.. ان میں سے ایک تصویر میں ایک لمبے چوغے اور اس سے بھی لمبی داڑھی میں ایک توانا اور بارعب شخص ایک ہوائی جہاز کے سامنے کھڑا ہے.. یہ سابق مہتر چترال ہیں، پرنس سیف الرحمٰن.. پرنس اسد کے بھائی.. پرنس شجاع اور پرنس ناصر کے والد...

مہتران چترال کا شجرہ نسب خاصا پیچیدہ ہے.. کسی بھی شجرہ نصب کی مانند.. ہر کوئی تو نادر شاہ نہیں ہوتا کہ شمشیر ابن شمشیر کہہ کر فارغ ہو جائے.. متروک رائلٹی کے لیے یوں بھی یہ واحد ذریعہ فخر اور ماضی کی سیڑھی ہوتا ہے.. ریاست نہ ہو کم از کم حسب نسب تو ہو.. ہم ایسے لوگ تو دادا جان سے ذرا پرے ہوتے ہیں تو سوچ میں

پڑ جاتے ہیں کہ قبلہ پردادا جان کا نام کیا تھا.. پرنس اسد کے پردادا امان الملک تھے.. پھر مہتر شجاع الملک جن کے صرف سولہ بیٹے تھے.. ان کے بعد مظفر الملک اور ان کے بیٹے سیف الرحمٰن.. جو پرنس اسد کے بھائی تھے.. پرنس محی الدین، امان الملک کے بیٹے امیر الدین کے بیٹے تھے۔

شام کی چائے پر ان دنوں کے بلوچستان کے وزیر اعلیٰ جمالی صاحب مدعو تھے.. وہ سرکاری طور پر چترال آئے تھے اور اپنے قبیلے کے ساتھ آئے تھے اور اس قدیم محل کے برآمدے میں بیٹھے زیادہ تر اپنی سفید مونچھیں سنوارتے تھے..

"آپ نے اچھا کیا جو گرم چشمہ سے براہ راست کالاش نہیں گئے.. تھکا دینے والا سفر ہوتا.. اچھا کیا آج کی شب ہمارے پاس ٹھہر گئے.. لیکن کالاش سے آپ اسلام آباد نہیں جائیں گے.. پہلے ہمارے پاس آئیں گے.." پرنس اسد مجھ سے مخاطب ہوئے..

"آئیں گے.." میں نے مسکرا کر کہا..

"اور ہاں گرم چشمہ کا دورہ کیسا رہا.. شجاع تو وہاں نہ تھا.. لیکن آپ کی دیکھ بھال تو مناسب ہوئی.."

"جی.. بلکہ اتنی ہوئی کہ غیر مناسب ہوئی۔"

"اور گرم چشمہ؟"

میں نے ان کا دل دکھانا مناسب نہ سمجھا۔ "نہایت ذائقے دار اور بدخشانی مقام تھا۔"

"میں نے مہمان خانے کی جھاڑ پونچھ کروا دی ہے.. کہیں بھی کوئی بچھو نہیں ہے.."

"آج کی شب اگر آپ ہمیں ریور سائڈ ان میں رہنے دیں تو ہم شکر گزار ہوں گے... کالاش سے واپسی پر ہم آپ کے محل میں باقاعدہ فروکش ہو جائیں گے.."

"مناسب.." انہوں نے سر ہلایا۔ "وہ بھی اپنی جگہ ہے.. وہاں بھی آپ ہمارے مہمان ہوں گے.. لیکن.. کالاش کے لیے آپ کے دل میں اتنی رغبت کیوں ہے؟"

"چترال کی ایک اہم ترین کشش.. کالاش بھی ہے۔"

"ایک نہیں، شاید اہم ترین کشش.. یہی تو ہماری بدقسمتی ہے۔" پرنس اسد نے ماتھے پر رکھ کر کہا۔ "ادھر جو کوئی بھی آتا ہے، چترال کی شناخت اور قدیم تاریخ اور

زبان اور درجنوں حیرت انگیز وادیوں کو درگزر کرتے ہوئے سیدھا کالاش چلا جاتا ہے.. کالاش تو پورا چترال نہیں ہے.."

"لیکن کالاش بھی تو چترال کی شناخت ہے.."

"ہاں.." انہوں نے سر ہلایا۔ "شہزادی ڈیانا آتی ہے تو اسے بھی کالاش رقص ہی دکھایا جاتا ہے.. محکمہ سیاحت بھی اور حکومت بھی تمام تر توجہ کالاش پر نچھاور کرتی ہے..."

چترالی وادی کالاش کو بڑی مشکل سے قبولتے ہیں.. اور شاید کسی حد تک وہ درست بھی ہیں کہ وادی کالاش کی وجہ سے ان کی وادی اور شاندار تہذیب پس منظر میں چلی گئی ہے..

آج پچھلے پہر ہم چترال کے ایک بزرگ شاعر فگار صاحب کے ہاں مدعو تھے جہاں چترالی ادیبوں اور دانشوروں سے ایک مختصر ملاقات ہوئی.. نہ صرف شعر و ادب کی بات ہوئی بلکہ ایک ندی کے پار ایک پر رشک قیام گاہ کے باغ میں ہماری تواضع چترالی گھی میں چپڑی ہوئی پنیر کی روٹیوں اور طرح طرح کے پکوانوں سے کی گئی بلکہ مجھے، سلجوق اور سمیر کو نہایت نفیس چترالی ٹوپیوں سے بھی سرفراز کیا گیا.. میمونہ اور عینی کو چترالی اون کی گرم اور خوبصورت کڑھائی والی چادروں کا تحفہ ملا جو وہ اب بھی سنبھال سنبھال کر رکھتی ہیں..

برآمدوں میں قدیم نقش و نگار کے قالین..

شکار کیے گئے جانوروں کے سر.. قدیم تصویریں.. پرانی زرہ بکتریں.. ڈھالیں اور تلواریں.. سورج غروب ہوا تو ترچ میر کی برفیں مدھم ہونے لگیں اور قدیم محل کے اس برآمدے میں سردی بڑھ گئی جہاں ہم بہت دیر سے براجمان تھے.. دریائے چترال کا شور نزدیک آ گیا..

ہم بے حد تھک چکے تھے..

”کافرستان ایک سٹیج اور اس کے کردار..

کافر کردار“

دنیا ایک سٹیج ہے..

اور ہم سب اس سٹیج پر اپنے اپنے کردار ادا کر کے چلے جاتے ہیں..

شیخ انگلستان شیکسپیئر اپنے قلم کی روانی میں یہ فقرہ لکھ تو گئے.. لیکن ایک غلطی کر گئے.. اگر دنیا ایک سٹیج ہے اور ہم سب اس کے کردار ہیں تو... تماشائی کون ہیں؟ ایک ایسا فقرہ کہ اس دنیا کے ہر دوسرے شخص نے اس کا حوالہ کہیں نہ کہیں دیا ہوگا.. اور میں بھی وہی دوسرا شخص ہوں.. لیکن اس فقرے کا حوالہ میری مجبوری ہے..

اس لیے بھی کہ مجھ سے پہلے جتنے لوگوں نے یہ حوالہ دیا، وہ فریب میں تھے۔ وہ تحریر کی ساحری اور طلسم میں تھے... صرف میں تھا جو اس طلسم کے پار گیا اور اس سٹیج کو دیکھا.. اس پر داخل ہوا..

ایک دھچکے دیتی.. رکتی اور دھواں چھوڑتی جیپ میں سوار میں اس سٹیج پر داخل ہوا.. جہاں ایک عظیم ڈرامہ.. ایک مٹی ہوئی کافر تہذیب کا ڈرامہ سٹیج ہو رہا تھا..

اس سٹیج پر متروک خدا تھے.. بودلک کے جنسی خواب تھے.. قبرستانوں کے ڈھانچے تھے جو کلام کرتے تھے.. رڈیارڈ کپلنگ کا وہ شخص تھا جس نے بادشاہ ہونا تھا.. جارج رابرٹسن کے کئی برس تھے جو اس نے ان کافر اداکاروں کے درمیان گزارے۔ محو ایرانی کی نصف حقیقت اور نصف فینٹسی تھی... سرخ شراب تھی.. ڈھول بجتے تھے

اور لڑکیاں رقص کرتی تھیں.. وہاں بلھے شاہ، موہن سنگھ اور غالب بھی تھے۔

اس سٹیج کی لائٹنگ اتنی پرفیکٹ تھی کہ ہر کردار واضح اور صاف نظر آتا تھا.. چاہے وہ اپنے نیم سوختہ سیاہ گھر کے باہر بیٹھا ہے، کھیتوں میں اپنے ڈرامائی لباس میں اور نیلی آنکھوں والے چہرے کے ساتھ نلائی کر رہا ہے.. ”بتالی“ میں اپنے ”ایام“ گزار رہا ہے.. قربان گاہ کے گھوڑا نما دیوتاؤں کے قدموں میں قربانی کے خون کے چھینٹے اڑا رہا ہے.. ندی کے پانیوں پر جھکا بالوں میں کنگھی کر رہا ہے اور پانیوں سے باتیں کر رہا ہے.. کہ ندی اے ندی... یا ندی کے پار جو ڈھلوان پر ایک مردہ آرامگاہ ہے وہاں.. چوبی، سال خوردہ، برفوں سے کھوکھلے ہوتے ایک تابوت میں لیٹا ہے۔ ایسے کہ اس کا ڈھانچہ میڈیکل کے طالب علموں کے لیے ایک درس ہوتا ہے اور وہاں ان ڈھانچوں میں صرف بالغ کردار ہی نہیں، بچے بھی ہیں جن کی کھوپڑیاں چھوٹے چھوٹے سفید گیندوں کی مانند ہیں جن میں چھید ہو چکے ہیں.. ان کی آنکھیں سوراخ ہیں اور نہ رخسار ہیں اور نہ لب.. یہاں بوڑھے کردار بھی ہیں جن کی کمر کی ہڈی ابھی تک خمیدہ ہے.... اور ہاں چند دلہنیں بھی ہیں.. جن کے عروسی جوڑوں کی شوخی اور سرخی اب بھی چھب دکھلاتی ہے.. موت اسے زیر نہیں کر سکی.. لیکن ان جوڑوں کے اندر.. پہلی شب کے لیے بے تاب ہونے والے بدن نہیں ہیں، صرف ڈھانچے ہیں... ان کی ہڈیاں سلامت ہیں اور سیپیوں کے ہار ان کے گلے میں ہیں.. ماتھے پر پڑی مینڈھیاں بھی موجود ہیں لیکن ماتھا موجود نہیں.... رنگین دھاگوں اور سیپیوں کی ٹوپیاں بھی موجود ہیں لیکن بے تاب ہونے والے بدن خاک ہو چکے ہیں..

یہیں اس مردہ آرامگاہ میں.. کسی ایک تابوت کے اندر جو برفباری سے.. مینہ کی بوچھاڑ سے.. موسموں کی یلغار سے.. وقت کے گزرنے سے.. ازلی خاموشی کے درختوں کے سائے میں، ریزہ ریزہ ہونے کو ہے.. ایک دلہن کا ڈھانچہ ہے.. اس کے گرد اس کا عروسی لباس.. اپنی شوخی اور سرخی میں ابھی تک قائم اور موجود.. لیکن اس کی کھوپڑی میں جو آنکھیں مٹ چکیں، ان کے جو دو سوراخ ہیں، ان میں سے کچھ گھاس اور جنگلی بوٹے سر نکالتے ہیں.. بارشوں کے پانی سے.. مدتوں سے تابوت میں جمع ہونے والی مٹی نے کہیں سے وہ بیج جو ہوا کے دوش پر کہیں سے آئے تھے، اپنے آپ میں دفن

کیے تو ان میں سے... نہ صرف گھاس نے سر اٹھایا بلکہ کچھ گل بوٹوں نے بھی جنم لیا.. ایک تابوت.. ایک کھوپڑی.. اس کی آنکھوں کے سوراخوں میں سے سر اٹھاتا ایک ڈنٹھل جس کے سہارے پر ایک پھول تھا.. اور وہ سرخ رنگ کا تھا.. سب کہاں کچھ لالۂ و گل میں نمایاں ہو گئیں.. تو صرف ایک صورت تھی جو سارے قبرستان میں نمایاں ہوتی تھی۔

تو یہ سب صورتیں..

یہ سب کردار.. قربان گاہ میں.. کھیتوں میں.. گھروں کے باہر.. بیٹالی میں.. قبرستانوں میں، سب کے سب اس عظیم سٹیج پر پرفیکٹ لائٹنگ میں تھے.. ان کا ایک ایک نقش واضح اور صاف تھا.. وہ سب سے پچھلی نشستوں پر براجمان تماشائیوں کو بھی نظر آتے تھے اور وہ ان کی قربت محسوس کرتے تھے... ہر کردار مرکزی کردار دکھائی دیتا تھا لیکن ان سب میں نمایاں وہی ایک صورت تھی جس کی آنکھوں کے سوراخوں میں سے ایک سرخ پھول نمایاں ہوتا تھا..

اور میں اس سٹیج پر کیا کر رہا تھا؟

میں اس مٹی ہوئی تہذیب کے ڈرامے میں کیوں داخل ہو رہا تھا..

اس لیے کہ میں زندگی کی سٹیج کا ایک ناکام اداکار تھا.. میں ہر جگہ ہُوٹ ہو چکا تھا، اس لیے اب ایک شور مچاتی، دھواں اڑاتی جیپ میں سوار زبردستی اس سٹیج کے درمیان میں پہنچ گیا تھا..

رڈیارڈ کپلنگ جو میرے شہر لاہور میں رہا کرتا تھا.. بادشاہی مسجد کے میناروں پر بیٹھ کر شاعری کرتا تھا.. میرے گھر کے قریب "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے دفتر میں بیٹھ کر لاہور کے بارے میں کالم لکھا کرتا تھا... شاید اس نے وہیں بیٹھ کر اپنا ناول "دی مین ہو وڈ بی کنگ" تخلیق کیا جو اس سٹیج کے بارے میں تھا جس میں میں داخل ہو چکا تھا.. اس لیے وہ بھی یہاں ایک کردار تھا..

بلھے شاہ بھی میرے شہر کا باسی تھا.. اس لیے کہ اس کے شاہ عنایت بھی تو تخت لہور میں بسیرا کرتے تھے اور لُک چھپ ڈور کھینچتے تھے.. بلھے شاہ بھی تو اس کافر سٹیج پر ایک کردار تھے... کہ

تیتوں "کافرا! کافرا" آکھدے . .
توں "آہو، آہو" آکھ!

موہن سنگھ بھی ایک ایسے کفر کی طرف مائل تھا.. جس میں۔ لائی لگ مومن کولوں کافر کھوجی چنگا...

اور شاہ حسین اپنے اندر باہر لال ہے.. کے ساتھ اس سٹیج پر.. کافر دوشیزاؤں کے ساتھ رقص کرتا تھا اور اپنے مادھو کو یاد کرتا تھا..

ان سب میں تخت لہور کا خمیر گندھا ہوا تھا..

حیرت ہے.. شہر لاہور میں کفر کی ریت اتنی قدیم اور مستحکم ہے..

یقیناً وہاں داتا صاحب اور میاں میر صاحب اور بے شمار بزرگ و برتر ہستیاں ایسی بھی ہیں جنہوں نے اس ریت کو توڑنے کا جتن کیا.. لیکن یہ کیسا شہر ہے کہ اس میں کفر کا مکمل خاتمہ ہی نہیں ہوتا.. سوال پوچھے چلا جاتا ہے.. ایمان نہیں لاتا.. شک کرتا چلا جاتا ہے..

لیکن کُفر ہے کیا؟..

کیا کُفارِ مکہ اور کُفارِ کالاش میں کوئی فرق ہے؟.. یا اصل میں دونوں ایک ہیں اور یہ لوگ کعبے کے ان بتوں کے ٹکڑے اٹھا کر یہاں اس وادی میں لے آئے ہیں.. انہیں پھر سے جوڑ لیا ہے.. جنہیں ہم صدیوں پیشتر پاش پاش کر چکے تھے..

لیکن غالب ان بتوں کو اپنا مانتا تھا کہ کعبے کو ان بتوں سے ایک نسبت دور کی تو ہے..

میں اگر اس وادی کالاش یا کافرستان میں آیا تھا تو سراسر ایک بنیاد پرست مسلمان کی حیثیت سے آیا تھا.. میں تو نہیں کہتا تھا کہ.. میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا.. اگرچہ اس وادی میں ان دنوں مسئلہ یہی ہے.. کہ ہم ان کے لیے کافر ہوئے جاتے ہیں اور وہ کافر بوجوہ مسلماں ہو رہے ہیں..

چنانچہ وادیٔ کالاش.. ایک عظیم سٹیج تھی.. جس کی لائٹنگ اتنی پرفیکٹ تھی کہ ہر چہرہ.. ہر تابوت.. واضح اور برہنہ نظر آتا تھا.. وہ ایک گل لالہ دور سے دکھائی دیتا تھا اور ہماری جیپ ہو گئی ہوئی اس کے اندر ایک ناپسندیدہ دھارے کی

طرح داخل ہوتی جاتی تھی..

کسی بھی.. ہزاروں برس سے... اپنی روایت اور سچائی میں مستحکم تہذیب میں جب ایک جیپ داخل ہوتی ہے تو اس کا تانا بانا برباد کر دیتی ہے..

وہ جیپ ایک وحشی فاتح کی طرح روندتی ہوئی آتی ہے..

جب موہنجوڈارو میں اپنے "اسوا" پر سوار آریائی حملہ آور آئے تھے..

یا.. ہڑپہ... ہری یوپیہ کی گلیوں میں شمال کے نیم تہذیب یافتہ لیکن زور آور لوگ داخل ہوئے تھے..

اور مہر گڑھ کے نقوش اور مجسموں کو پامال کرتے حملہ آوروں کی یلغار تھی..

تب.. وہ شاندار تہذیبیں برباد ہو گئی تھیں..

تو ہماری جیپ بھی ایک آریائی گھوڑا تھی..

جو پھنکارتی ہوئی اس سٹیج میں داخل ہوتی تھی... اور اس کے انجن میں اس وادی کی بربادی کے بیج تھے..

میں چترال شہر سے چلا تھا..

دروداری کو جانے والی روڈ پر چلا تھا..

پھر روڈ سے نیچے آیا تھا ایک بگولے کی طرح چکر کھاتا.. دریا کنارے ایک زراعتی فارم کے کھیت اور باغ دیکھتا پل کے پار ہوا تھا.. دریا کے دوسرے کنارے یہ بگولا جو پہلے چکر کھاتا نیچے آیا تھا، اب پھر ہوا میں بلند ہو کر آیون کے خشک اور غیر دلچسپ قصبے تک پہنچا تھا.. یہیں سے کافرستان کی وادیوں میں سے ایک وادی بمبوریت کو راستہ جاتا تھا.. اس راستے کی خطرناکی کی داستانیں بہت سنی تھیں لیکن وہ صرف داستانیں تھیں یا ان لوگوں کے تجربے تھے جنہوں نے کبھی پھنڈر روڈ، دیوسائی یا استوار روڈ پر سفر نہیں کیا تھا..

راستے کے پہلو میں حسب روایت ایک تیز ندی گہرائی میں رواں تھی..

اسی ندی پر وہ پل تھا جس کے پار کفر کی چند بستیاں تھیں..

پل کے دوسری جانب ایک چیک پوسٹ تھی جہاں میں نے کفر کی وادی میں

اترنے کا تاوان ادا کیا.. دس روپے اگر آپ پاکستانی ہیں اور پچاس روپے اگر آپ غیر ملکی ہیں.. یعنی غیر ملکیوں کی نسبت پاکستانیوں کو کفر میں داخل ہونے کے لیے آسانی عطا کی گئی تھی..

پل کے پار ایک وارننگ بھی تھی..

براہ کرم ان وادیوں کی روایات کا احترام کیجئے... اور یہاں ہر قسم کی مذہبی تبلیغ پر پابندی ہے..

ان وادیوں کا مسئلہ ہی یہی ہے کہ یہاں ہر قسم کی مذہبی تبلیغ پر پابندی نہیں ہے.. عیسائی مشنری آتے ہیں... شکل سے سیاح لگتے ہیں.. جین جیکٹ میں.. کیمرے کے ساتھ.. لمبے بالوں میں.. اور کسی کو شک بھی نہیں ہوتا کہ موصوف "فادر" ہیں... وہ ان وادیوں میں اتر کر "کفار" سے کہتے ہیں۔ "بھائیوں اور بہنوں! اگر نجات چاہتے ہو تو یسوع کی بھیڑیں بن جاؤ.. آپ بے شک اپنا روایتی لباس ترک نہ کرو.. اپنی رسوم ادا کرتے رہو.. انگور کی شراب پیتے رہو لیکن یہ چھوٹی سی صلیب اور جیبی بائبل اپنے گھر کے کسی کونے میں رکھ لو... باقی بعد میں دیکھا جائے گا.." ... دوسری جانب ہمارے پیارے اور ہر دلعزیز مولوی صاحبان تشریف لاتے ہیں اور کہتے ہیں "اوئے کافر کا بچہ.. تائب ہو جاؤ یارا... اپنا عورت کو برقعہ ڈالو.. داڑھی رکھو.. کلمہ پڑھو اور یہ ناچنا گانا اور پینا بند کرو اور آخرت کا فکر کرو ورنہ عذاب الٰہی آتا ہے.." اور ہمارے مولوی پیارے قطعی طور پر ان کروڑوں مسلمانوں کی فکر نہیں کرتے جو دنیا بھر میں کفر کی انہی حرکتوں میں مشغول ہیں اور بھٹک چکے ہیں.. صرف ان دو تین ہزار کفار کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے ہیں..

چنانچہ غریب کفار ہمہ وقت... یلغار میں ہیں..

اور اس کے باوجود ان کفار کے پایۂ استقلال میں کمی نہیں آتی اور وہ بدستور قدرتی مظاہر کی پرستش کرتے ہیں... اپنے موسمی تہوار مناتے ہیں.. ڈھول اور بانسری بجاتے ہیں، رقص کرتے ہیں.... اور نہایت صوفیانہ زندگی بسر کرتے ہیں.. صوفیانہ اس لیے کہ اپنے آپ میں مست رہتے ہیں، تکبر نہیں کرتے، کسی کا دل نہیں دکھاتے، لڑائی جھگڑا نہیں کرتے اور.. ہمیشہ سچ بولتے ہیں..

جی ہاں ان کفار میں سب سے بڑی قباحت یہی ہے کہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں..

گناہ یا ثواب کے حوالے سے نہیں بلکہ اپنی روایت کے مطابق..

چترال کے ایک اسسٹنٹ کمشنر کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی عدالت میں ایک مسلمان نے ایک کالاش کافر کے خلاف مقدمہ کیا کہ اس شخص نے مجھ سے ایک برس کے وعدے پر اتنی رقم ادھار لی تھی لیکن ایک برس ہو گیا ہے اور رقم واپس نہیں کی گئی..

اے سی صاحب نے اس کافر نادہندہ کو طلب کیا تو اس نے اپنے بیان میں کہا کہ جناب میں بالکل مانتا ہوں کہ میں نے یہ رقم ایک برس کے وعدے پر ادھار لی تھی لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اس برس وادی میں بارشوں اور سیلاب کے باعث ہماری فصلیں خراب ہو گئی ہیں اور مویشیوں کا بھی نقصان ہوا ہے، اس لیے میں یہ رقم واپس نہیں کر سکا.. میں اب چھ ماہ کے اندر اندر یہ رقم ادا کر دوں گا کیونکہ اگلی فصل تیار ہونے کو ہے..

یہ میرا وعدہ ہے..

اے سی صاحب نے درخواست گزار سے پوچھا کہ اب کیا کہتے ہو.. وہ کہنے لگا کہ یہ کالاش سچ کہتا ہے کہ سیلاب کی وجہ سے بہت کچھ اجڑ گیا ہے.. ٹھیک ہے میں چھ ماہ انتظار کر لیتا ہوں... آپ معاہدہ کرا دیں..

چنانچہ معاہدہ طے پا گیا..

لیکن ابھی صرف تین ماہ گزرے تھے کہ مسلمان دعویدار نے پھر عدالت سے رجوع کیا کہ جناب میری رقم ابھی اور اسی وقت ادا کی جائے..

اے سی صاحب نے کہا کہ بھلے مانس تم نے خود چھ ماہ کی مہلت دی ہے اور ابھی تو صرف تین ماہ ہوئے ہیں.. تو اتنی بھی کیا ایمرجنسی ہو گئی ہے..

وہ مسلمان کہنے لگا.. حضور دراصل صورتحال میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہو سکتی ہے.. مجھے مصدقہ طور پر اطلاع ملی ہے کہ وہ کافر کالاش.. مسلمان ہونے والا ہے.. اور اگر وہ مسلمان ہو گیا تو میری رقم واپس نہیں کرے گا.. یہی ایمرجنسی ہے..

اس قصے میں مبالغہ ہرگز نہیں ہے.. حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی کالاش مسلمان ہو جائے تو اسے عہد کفر کے قرضہ جات سے بری الذمہ قرار دیا جاتا ہے.. اس طرح اگر کوئی کالاش اپنی بیوی سے علیحدگی کا خواہشمند ہو اور رواج کے مطابق وہ بھیڑوں.. گھی اور فصل کا تاوان ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو مسلمان ہو جانے سے کافر بیوی

خودکار طریقے سے الگ ہو جاتی ہے.. اور چینگ اور چھکری وغیرہ بھی نہیں لگتی.. اسی طور پادری حضرات ان بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو لالچ دیتے ہیں کہ اگر وہ راہ راست پہ آ جائیں تو شہر میں ان کو ملازمتیں دی جائیں گی اور ان کے بچے مشنری سکولوں میں مفت پڑھیں گے.. چنانچہ مولوی اور پادری صاحبان کفار کو اس قسم کی بے شمار "سہولتیں" دینے کا وعدہ کر کے ان کی آخرت سنوارتے ہیں..

چنانچہ ہم نے کفر کی وادی میں داخلے کا ٹکٹ کٹایا اور بمبوریت روڈ پہ سفر کرنے لگے.. ندی اب ہمارے بائیں جانب بہتی تھی.. سیاہ لکڑی اور پتھروں کا ایک واچ ٹاور نظر آیا.. اس کی ساخت قدیم تھی.. شاید یہ بمبوریت وادی کے دفاع کے لیے کسی زمانے میں تعمیر کیا گیا تھا..

ہم جسے درہ نما تنگی میں سفر کرتے تھے وہ یکدم کشادہ ہونے لگی... راستہ ہموار ہو گیا..

تب ہم اس سٹیج پر داخل ہوئے... جہاں ایک عظیم ڈرامہ.. ایک مٹتی ہوئی کافر تہذیب کا ڈرامہ سٹیج ہو رہا تھا..

ہر کردار واضح اور صاف نظر آتا تھا کہ سٹیج لائٹنگ اتنی پرفیکٹ تھی..

ہمارے گرد یہ کھیل کھیلا جا رہا تھا اور ہم اپنی جیپوں کی نشستوں میں اس کے تماشائی تھے.. سرسبز کھیت، گھنے شجر، اور ہموار چھتوں والے کچے گھر.. وسیع ہوتے جا رہے تھے..

اور جب ہم نے ایک کھیت میں جھکی ہوئی پھر جیپ کی آواز سن کر سیدھی ہوتی اپنی پہلی کالاش لڑکی کو دیکھا تو ہم سب ایک سٹیٹ آف شاک میں چلے گئے.. اگرچہ ہم نے ہزاروں مرتبہ ٹورسٹ کتابچوں، اخباروں اور کیلنڈروں پر کالاش لڑکیوں کی تصویریں دیکھی تھیں بلکہ ان کا روایتی لباس دیکھ دیکھ کر بیزار ہو چکے تھے.. ان وادیوں کے قصے پڑھے تھے، بہت کچھ سنا تھا اور یہاں ہمارے لیے کوئی حیرت کوئی عجوبہ منتظر نہ تھا لیکن اس کے باوجود جب ہم نے ایک کھیت میں جھکی سیاہ کالاش لباس میں ملبوس، سیپیوں کی جھالردار تکونی ٹوپی اوڑھے ایک لڑکی کو سچ مچ دیکھا تو ہم یقین نہ کر سکے.. کیونکہ ہم نے آج تک جو کچھ دیکھا تھا، وہ اس سے الگ تھی.. وہ ہمارے عہد کی نہ

تھی.. ہم شاید اپنی بچپنوں میں وقت کے غار میں کہیں واپس چلے گئے تھے، اپنے وقت سے بچھڑ کر پیچھے چلے گئے تھے.. اگر میں نے اس کافرداستان کے آغاز میں یہ بیان کیا ہے کہ ہم ایک سٹیج کے اندر چلے گئے تھے تو یہ ہرگز میری فینٹسی نہ تھی کہ ہمارے حواس اس پہلی لڑکی کو ایک حقیقت کے طور پر قبول نہیں کر رہے تھے.. وادی بمبوریت ایک سٹیج کی مانند ہی دکھائی دے رہی تھی جس پر بعید از قیاس منظر تھے جن میں ہزاروں برسوں سے کوہستانی گھاٹیوں اور وادیوں میں پوشیدہ "نیم وحشی" لوگ ابھی تک انہی وحشی لباسوں میں تھے..

جیپ بمبوریت کے بازار میں داخل ہو رہی تھی۔

چند کالاش بچے ایک دکان کے باہر چیونگم اور لالی پاپ خریدتے نظر آئے.. ان کا حلیہ بھی ایسے تھا جیسے یہ سکول کے فینسی ڈریس شو کے لیے ڈریس اپ ہو کر آئے ہیں.. وہ دکان سے الگ ہوئے تو جیسے خوش نما رنگوں کا جھرمٹ حرکت کرنے لگا ہو..

پھر روڈ سے اوپر جو کھیت اور شجر بلند ہوتے تھے، ان کے اختتام پر چٹانوں کی قربت میں مٹیالے ڈربہ نما گھروں، ہموار چھتوں اور چوبی برآمدوں والے تہہ در تہہ گاؤں کے آثار نظر آئے اور اس کی گلیوں میں بھی اخروٹ کے گھنے گھیر کے درختوں تلے ہمیں وہی عجیب ہیئت اور سیاہ لاعلمی والے پرکشش لبادے دکھائی دیے..

"میرا خیال تھا یہ لوگ صرف شادی بیاہ اور میلوں ٹھیلوں پر ہی اپنے روایتی لباس پہنتے ہوں گے۔" میمونہ کی انگشت شہادت حیرت کو روکنے کے لیے اس کے ہونٹوں پر تھی۔ "یہ عورتیں اتنے بھاری لباس میں بن ٹھن کر، ٹیں سنوار کر فل میک اپ کے ساتھ کھیتوں میں کیسے مشقت کر لیتی ہیں.."

"میں نے سنا ہے کہ یہ لوگ مہینوں نہاتے نہیں اور کافر لڑکیوں سے شدید قسم کی بوسیدہ اور ناگوار بُو آتی ہے.." سلجوق نے ذرا ایک سپیریئر آب و ہوا میں سانس لیتے ہوئے بیان دیا..

"آپ کو کیسے معلوم ہے بھائی جان؟" عینی نے پوچھا..

"یہ ابھی تک ایک بے وقوف بچی ہے۔" سمیر نے اپنے آپ کو سیدھا کیا۔

"بھئی.. یہ تو کامن نالج ہے کہ.. ان لڑکیوں سے بُو آتی ہے.."

"وے..." میمونہ نے سمیر کی کمر پر ایک دھپ رسید کی اور وہ قدرے دوہرا ہوا کہ وہ قدرے لم ڈھینگ ہے.. "تم نے ضرور قریب جا کر انہیں سونگھنا ہے.. یاد نہیں وادی ہوشے میں جو عورتیں اور لڑکیاں تھیں ان کے تو چہرے بھی کالک سے اٹے ہوئے تھے.. برف باری کے طویل موسموں میں وہ لوگ اپنے کچے گھروں میں بند مسلسل آگ پر جھکے رہتے تھے.. دھواں باہر نہیں نکلتا اور ان کے چہرے سیاہی سے پوتے جاتے ہیں.. لیکن یہاں.. کم از کم یہ کالاش لڑکیوں نے تو خوب رگڑ رگڑ منہ ہاتھ دھوئے ہوئے ہیں اور خوب گوری چٹی ہیں.. بلکہ" اس نے اپنے جوان ہوتے بیٹوں پر ایک پر تشویش نگاہ ڈالی۔ "کچھ زیادہ ہی گوری چٹی ہیں.. ایک کی تو آنکھیں بھی کچھ نیلی نیلی تھیں۔"

اگرچہ بیٹوں کی بجائے میمونہ کو ان کے باپ پر ایک پُر تشویش نگاہ ڈالنی چاہیے تھی..

دائیں جانب روڈ سے ذرا فاصلے پر کھیتوں کے درمیان پہاڑ کی قربت میں "جناح ہوٹل" تھا..

میں جناح کو مل چکا تھا. جناح ایک نہایت عمدہ کافر تھا.. بلکہ میں اس وادی میں آباد بہت سے کافروں اور کافر حسیناؤں سے مل چکا تھا..

لوک ورثہ کے میلے میں..

اسلام آباد میں.. کالاش سے ایک لشکر کفار اپنے روایتی رقص اور موسیقی پیش کرنے کے لیے خصوصی طور پر بلایا گیا تھا.. اور میں مسلسل چھ روز میلے کی سٹیج پر ان کافروں کا میزبان تھا.. ہر شام پروگرام کا آغاز پاکستان کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے گمنام گویوں اور موسیقاروں سے ہوتا.. پھر کوئی شہرت یافتہ لوک گلوکار رٹے رٹائے اور پٹے پٹائے نغمے پیش کرتا.. اور آخر میں.. بھیگتی شب میں.. اب جگر تھام کے بیٹھو کہ کافر آئے.. کافر آ جاتے.. ڈھول کی تھاپ اور بنسری کے بہاؤ کی ایک نہایت یکسانیت سے بھرپور دھن پر کالاش عورتیں ہاتھوں سے زنجیر بنائے دائروں میں گھومتیں اور "آ.. لو لو... ہو ہو.." کی آوازیں بلند کرتی رقص کرنے لگتیں.. اہل اسلام آباد کچھ سردی کے باعث، کچھ خصلت کے باعث نہایت بردباری اور تحمل اور خاموشی سے ان کا

رقص ملاحظہ کرتے.. نہ داد دیتے نہ ستائش کرتے کہ یہ عام لوگوں کی سطح تھی اور وہ بہت بلند تھے.... چپ بیٹھے پاپ پیتے رہتے جیسے کوئی شطرنج کی بازی دیکھ رہے ہوں.. زیادہ سے زیادہ احترام بھری سرگوشی میں اپنے برابر میں براجمان بیگم یا علی افسر کے کان میں "فیسی نیٹنگ کلچر.. ہاؤ ویری سویٹ" کہہ کر پھر سے خاموش مشاہدہ کرنے لگتے.. کہ یہ لوگ نہایت بلند پائے کے شاہد ہوتے ہیں.. وطن کے زوال کے بھی شاہد.. اسے بے آبرو ہوتے دیکھ کر.. اور اس بے آبروئی میں ان کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ تب بھی نہایت احترام بھری سرگوشی میں یہی کہتے ہیں کہ.. "ہاؤ ویری ٹریجک" لیکن اس سرد مہری اور ذوق جمال کی نابینائی کے باوجود ہر شب.. یہ کالاش لوگ بے حد مگن ہو کر.... صلے اور ستائش کی تمنا کیے بغیر.. اپنے آپ میں مست.. ناچتے رہتے کہ وہ پروفیشنل سٹیج پرفارمر نہ تھے کہ ان کی سرخوشی پر سرد مہری کی اوس پڑ جاتی اور وہ بجھ جاتے.. وہ یہ رقص اپنے لیے کرتے تھے اور بھول جاتے تھے کہ وہ اسلام آباد میں ہیں اور ہر شب اپنی وادی میں چلے جاتے تھے۔

میلے کی آخری شب جب میں نے انہیں ان کے آخری رقص کے لیے سٹیج پر مدعو کیا تو ان کی مسرت دیکھنے کے لائق تھی اور لوگوں کی فہم سے باہر ہوتی تھی.. اور میں جانتا تھا کہ وہ اپنی وادی کے لیے اور اس ندی کے لیے جو بمبوریت کے درمیان میں بہتی ہے، اداس ہو چکے تھے اور اب اس کی جانب لوٹنے کے خیال سے خوش ہوتے تھے.. کافر لڑکیوں نے ایک عرصے سے اسلام آباد یا راولپنڈی کے کسی تھرڈ ریٹ ہوٹل کے تھرڈ ریٹ باتھ روم میں اپنے بال سنوار کے ان میں روایتی مینڈھیاں گوندھی تھیں اور سرمے کاجل کا سنگھار کیا تھا، ایک ایسے آئینے کے سامنے جو بہت بڑا تھا.. جس میں وہ ساری کی ساری دکھائی دیتی تھیں.. اور انہیں عادت نہ تھی.. وہ تو بمبوریت کی ندی کنارے ایک پتھر پر بیٹھ کر... اس پتھر پر بیٹھ کر جس کے نیچے وہ اپنی کنگھی اور کلپ چھپا کے رکھتی تھیں.. اور ایک چھوٹے سے دو انچ کے آئینے کو چھپا کر رکھتی تھیں جو ان کے سامنے آتا تھا تو وہ اس میں صرف اپنے ہونٹ دیکھتی تھیں.. اسے اونچا کرتی تھیں تو اپنی آنکھ دیکھ لیتی تھیں اور ذرا اور اونچا کرنے پر اس آئینے میں اپنی وہ مینڈھی دیکھ سکتی تھیں جو انہوں نے گوندھ کر ماتھے پر سجائی ہوتی تھی.. اور یہاں اتنے بڑے

آئینے کے سامنے وہ پریشان ہو جاتی تھیں کہ وہ ساری کی ساری دکھائی دیتی تھیں..

تو اسلام آباد میں یہ ان کی آخری شب تھی.. کل وہ اپنے مختصر آئینے اور ندی کے پانیوں کو لوٹ جائیں گی، اس لیے ان کی مسرت اور بے قابو خوشی ایسی تھی کہ اسلام آباد کے برف چہروں کی مختصر سمجھ میں نہ آتی تھی..

چترالی ٹوپی میں رنگین پر تھا اور پٹو کی جیکٹ میں ملبوس کافر ڈھولی ایک وجد کے عالم میں سر جھکائے ڈھول کو پیٹ رہا تھا اور کالاش کی جوان اور بوڑھی عورتیں ایک دائرے میں " ہو ہو.. " کرتیں مولانا روم کے درویشوں کی طرح گھومتی چلی جاتی تھیں.. اور جب اس رقص کا اختتام ہوا تو ویسے نہ ہوا جیسے ہر شب ہوتا تھا.. وہ سر جھکا کر سٹیج کو خالی کرنے کی بجائے وہیں موجود رہیں..

ڈھول کی تھاپ خاموش ہوئی اور ہنسی ہونٹوں سے نیچے آئی تو ان سب نے ماتم کرتی عرب عورتوں کی طرح زبانیں نکال کر ایک عجیب "ہُوہُو.." کی کچھ خوفزدہ کر دینے والی آواز نکالی.. اور ان سب میں سے جو بزرگ عورت تھی.. جھریوں بھری پوپلی مگر ہوشیار چمکتی آنکھوں والی، وہ میرے پاس آئی، میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچتی ہوئی مجھے اپنے دائرے میں لے گئی اور پھر وہ سب کی سب اپنی زبان میں شور مچاتی.. ہنستی ہوئی میرے گرد ناچنے لگیں..

میں اگرچہ ایک نہایت شاطر اور کُہنہ مشق اور تیس برس سے شو بزنس سے جڑا ہوا ایک گھاگ میزبان تھا لیکن میں بھی نروس ہو گیا اور میری ٹانگیں لرزنے لگیں کیونکہ یہ آئٹم پروگرام میں شامل نہیں تھی..

وہ سب.. اپنے نوخیز ہاتھ اپنے جھریوں بھرے ہاتھ آگے کر کے.. مجھے چھوتے ہوئے مجھے اپنے رقص میں شامل ہونے کے لیے کہہ رہی تھیں اور ہنستی جاتی تھیں..

خاص طور پر وہ بوڑھی عورت.. جس کے منہ میں گنتی کے دانت تھے، اگر تھے.. لیکن اس کے بازو اور بدن شہتوت کی ٹہنی کی طرح لچکیلے اور شفاف تھے.. مجھ پر بہت مہربان تھی اور مسکرا مسکرا کر اپنی زبان میں جانے کیا کیا کہتی میرا ہاتھ تھامتی تھی..

اور جب بھی وہ میرا ہاتھ تھامتی میں شرم سے سرخ ہو جاتا کہ یہ سب کچھ ایک سٹیج پر..

ریہرسل کے بغیر.. سب کے سامنے ہو رہا تھا..

میں ان کے دائرے میں شامل ہو گیا..

یعنی کفر کی ریت کا ایک حصہ بن گیا..

میں ہوا کافر.. لیکن وہ کافر.. کافر ہی رہا..

اور میں ان دنوں پچاس کی قربت میں تھا.. آخری وقت تھا.. عشق بتاں میں گزری عمر کے بعد.. اب آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے..

تو میں ان کافروں میں صرف ایک شب کے لیے کافر ہو گیا..

ڈھول کی تھاپ تیز ہونے لگی.. ہنری نواز کے پھیپھڑے پھونک کو سہار نہ سکتے تھے.. تب ایک کافر لڑکی اپنے دائرے سے الگ ہوئی اور اس کے ہاتھوں میں ایک ہار تھا رنگین پنی تھی اور وہ اسے دونوں ہاتھوں میں بلند کیے ہوئے... میری جانب آئی اور اس ہار کو میرے گلے میں ڈال دیا.. ایک سوئمبر جیتنے والے شخص کی مانند..

وہ پیچھے ہوئی تو وہ دادی اماں لچکتی بل کھاتی رقص کے دائرے میں سے نکلی اور اس نے بھی میرے گلے میں ایک گل بوٹوں سے آراستہ مالا ڈال دی.. نہ میں جانتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور نہ تماشائی اس کھیل کو سمجھ سکتے تھے.. اسلام آباد کی اس بہار یہ شب کی خنکی میں... جب شکر پڑیاں کی پہاڑی کو زرد چنبیلی کے انبار ایک ایسے بدن کی طرح ڈھکتے تھے جس کے برہنہ رہ جانے سے امن عامہ میں خلل پڑ جانے کا خدشہ پیدا ہو سکتا تھا۔ کافر جناح مائیک پر آیا اور اپنی شکستہ اردو میں کہنے لگا.. "یہ تارڑ صاحب اچھا آدمی ہے.. ہم سے محبت کرتا ہے.. ہم کالاش لوگ ہیں جب کسی شخص کو بہت پسند کرتا ہے تو اس کے گلے میں ایسے ہار ڈالتا ہے.. یہ اب ہمارے قبیلے کا ہے.. ایسا ہار ہم ہر کسی کے گلے میں نہیں ڈالتا.."

میں ٹین ایج کے شرمیلے برسوں کے بعد اب پہلی بار اس عمر میں آکر پھر سے شرمیلا ہوا اور میرے رخسار یقیناً سیبوں کی طرح سرخ ہو گئے..

یہ ہار ایک عرصے تک میری سنڈی میں لٹکتے رہے، ڈھول جمع کرتے رہے اور پھر میری بیگم نے کہا کہ ان میں سے ہمہ وقت بو آتی ہے اور صفائی کرنے والی لڑکی فوزیہ کے حوالے کر دیے..

چنانچہ میں جناح کو جانتا تھا.. وہ ایک بہت عمدہ کافر تھا..

ان کفار میں ریت ہے کہ وہ اپنے بچوں کے نام قدرت کے مظاہر پر رکھتے ہیں.. وہ کالاشی زبان میں "زم گھاس" بھی ہو سکتے ہیں.. "ندی کا پانی" بھی ہو سکتے ہیں اور اس میں تیرنے والی مچھلی بھی ہو سکتے ہیں... مینڈک اور سرد ہوا بھی مناسب ہے اور ان زمانوں میں جو بھی معروف شخصیت ہے، اس کا نام بھی رکھا جا سکتا ہے.. چنانچہ آپ کافرستان میں جاتے ہیں تو وہاں آپ کو جناح بھی ملے گا. نواز شریف یا بھٹو سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے اور یہ سب کافر ہوں گے.. ہمارے علماء کرام کو سنجیدگی سے اس بات کا نوٹس لینا چاہیے کہ ہمارے زعماء کافر ہو رہے ہیں..

اور وہاں وادی بمبوریت کا اولین ہوٹل "ہوٹل بے نظیر" ہے..

ریہرسل کے بغیر.. سب کے سامنے ہو رہا تھا..

میں ان کے دائرے میں شامل ہو گیا..

یعنی کفر کی ریت کا ایک حصہ بن گیا..

میں ہوا کافر.. لیکن وہ کافر.. کافر ہی رہا..

اور میں ان دنوں پچاس کی قربت میں تھا.. آخری وقت تھا.. عشق بتاں میں گزری عمر کے بعد.. اب آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے..

تو میں ان کافروں میں صرف ایک شب کے لیے کافر ہو گیا..

ڈھول کی تھاپ تیز ہونے لگی.. ہنری نواز کے پھیپھڑے پھونک کو سہار نہ سکتے تھے.. تب ایک کافر لڑکی اپنے دائرے سے الگ ہوئی اور اس کے ہاتھوں میں ایک ہار نما رنگین پٹی تھی اور وہ اسے دونوں ہاتھوں میں بلند کیے ہوئے... میری جانب آئی اور اس ہار کو میرے گلے میں ڈال دیا.. ایک سوئمبر جیتنے والے شخص کی مانند..

وہ پیچھے ہوئی تو وہ دادی اماں لچکتی بل کھاتی رقص کے دائرے میں سے نکلی اور اس نے بھی میرے گلے میں ایک گل بوٹوں سے آراستہ مالا ڈال دی.. نہ میں جانتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور نہ تماشائی اس کھیل کو سمجھ سکتے تھے.. اسلام آباد کی اس بہار یہ شب کی خنکی میں.. جب شکر پڑیاں کی پہاڑی کو زرد چنبیلی کے انبار ایک ایسے بدن کی طرح ڈھکتے تھے جس کے برہنہ رہ جانے سے امن عامہ میں خلل پڑ جانے کا خدشہ پیدا ہو سکتا تھا.. کافر جناح مائیک پر آیا اور اپنی شکستہ اردو میں کہنے لگا.. "یہ تارڑ صاحب اچھا آدمی ہے.. ہم سے محبت کرتا ہے.. ہم کالاش لوگ ہیں جب کسی شخص کو بہت پسند کرتا ہے تو اس کے گلے میں ایسے ہار ڈالتا ہے.. یہ اب ہمارے قبیلے کا ہے.. ایسا ہار ہم ہر کسی کے گلے میں نہیں ڈالتا.."

میں ٹین ایج کے شرمیلے برسوں کے بعد اب پہلی بار اس عمر میں آ کر پھر سے شرمیلا ہوا اور میرے رخسار یقیناً سیبوں کی طرح سرخ ہو گئے..

یہ ہار ایک عرصے تک میری سٹڈی میں لٹکتے رہے، دھول جمع کرتے رہے اور پھر میری بیگم نے کہا کہ ان میں سے ہمہ وقت بو آتی ہے اور صفائی کرنے والی لڑکی فوزیہ کے حوالے کر دیے..

چنانچہ میں جناح کو جانتا تھا.. وہ ایک بہت عمدہ کافر تھا..

ان کفار میں ریت ہے کہ وہ اپنے بچوں کے نام قدرت کے مظاہر پر رکھتے ہیں.. وہ کالاشی زبان میں "نرم گھاس" بھی ہو سکتے ہیں.. "ندی کا پانی" بھی ہو سکتے ہیں اور اس میں تیرنے والی مچھلی بھی ہو سکتے ہیں... مینڈک اور سرد ہوا بھی مناسب ہے اور ان زمانوں میں جو بھی معروف شخصیت ہے، اس کا نام بھی رکھا جا سکتا ہے.. چنانچہ آپ کافرستان میں جاتے ہیں تو وہاں آپ کو جناح بھی ملے گا.. نواز شریف یا بھٹو سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے اور یہ سب کافر ہوں گے.. ہمارے علماء کرام کو سنجیدگی سے اس بات کا نوٹس لینا چاہیے کہ ہمارے زعماء کافر ہو رہے ہیں..

اور ہاں وادئ بمبوریت کا اولین ہوٹل "ہوٹل بے نظیر" ہے..

”ریسٹ ہاؤس میں بنگالی بابا... اخروٹ کا درخت اور برفیں“

دائیں جانب کھیتوں سے پرے.. اور ان کھیتوں میں کالاش سٹیج کے چند کردار کندھوں پر مکئی کے ٹانڈے اٹھائے جھکے ہوئے چلے جا رہے تھے.. وہاں ”جناح ہوٹل“ تھا.. اپنے جناح صاحب کا.. لیکن ہم نے ادھر کا رخ نہ کیا کیونکہ چترال میں نادر جان صاحب نے ہمارے لیے بمبوریت کا واحد ریسٹ ہاؤس بُک کروا رکھا تھا اور یہ قیام گاہ وادی سے دور جہاں اس کی وسعت کو برف پوش پہاڑ روکتے تھے اور ان کے پار افغانستان تھا.. وہاں واقع تھی..

لیکن ابھی ہم بمبوریت کے بازار میں تھے.. ٹورسٹ ہوٹل.. دکانیں.. پاکستانی سیاح گمشدہ ڈھور ڈنگروں کی طرح.. غیر ملکی ٹورسٹ.. نہایت غلیظ اور بدبودار.. اور ان سب پر حاوی بمبوریت کے خنک اور خوشگوار موسم.. چترال کی نسبت یہاں ایک ٹھنڈک بھری آسودگی بدن پر اپنے سرد ہاتھ رکھتی تھی..

بازار کے آغاز میں ”باشالی“ تھا..

یہاں ہم نے سڑک کے برابر میں ایک گھاس بھرے میدان میں چپکے سے بہتی ندی کے کنارے ایک چوبی عمارت کے آس پاس چند کالاشی خواتین کو سر جوڑے محوِ گفتگو پایا.. ان میں ایک واضح گریز تھا اور وہ ہماری جانب دیکھنے سے کتراتی تھیں.. صرف اس لیے کہ یہ دن ”ایام“ کے دن تھے اور کالاش میں قدیم روایت ہے اور جس پر سختی سے عمل ہوتا ہے کہ جن خواتین کے ایام کے دن ہوتے ہیں، انہیں وہ مدت یہاں

اس باشالی گھر میں گزارنی ہوتی ہے کہ وہ ناپاک ہوتی ہیں.. اس طور اگر کسی خاتون کو بچہ ہونے والا ہو تو وہ بھی اپنا گھر چھوڑ کر اس باشالی ریسٹ ہاؤس میں آ کر استراحت فرمائے گی.. اس کے لواحقین اسے تین وقت کا کھانا پہنچائیں گے.. یہیں وہ بچہ جنے گی.. شاید جنے گی شاید مر جائے گی..

کالاش خواتین اپنے ایام کے حوالے سے از حد بے باک ہیں..

وہ ابھی تہذیب یافتہ نہیں ہوئیں کہ ایک قدرتی تبدیلی کو چھپاتی پھریں اور اس کے بارے میں شرمندہ ہوں..

ہم جو تہذیب یافتہ کہلاتے ہیں، قدرت سے دور چلے گئے ہیں.. اپنے بدن میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ انہیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں.. کالاش نہیں کرتے!

امریکہ میں مقیم نفسیات دان اور پنجابی شاعر ڈاکٹر اختر احسن نے اسی موضوع پر.. ایام کے موضوع پر ایک پوری کتاب لکھی ہے.. جس کا نام اتنا طویل اور ثقیل ہے کہ اس کا حوالہ دینا ممکن نہیں.. ان کا نکتہ نظر یہ ہے کہ غیر تہذیب یافتہ معاشروں میں جب ایسی خواتین کو بستی سے الگ کر دیا جاتا تھا تو اس لیے نہیں کہ وہ ناپاک ہوتی تھیں بلکہ اس لیے کہ وہ اس حالت میں ایک کلب میں آرام کر سکیں اور دوسری خواتین کے ساتھ اطمینان سے گپ شپ کر سکیں۔ جب کہ تہذیب یافتہ معاشرے میں اب بھی ان ایام کو گردشِ ایام ہی سمجھا جاتا ہے اور خواتین کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس تبدیلی پر کیا ردعمل ظاہر کریں.. ڈاکٹر احسن تو اسے نسوانی خوبصورتی کے ایک ”گلابی پھول“ سے تشبیہ دیتے ہیں جو خوشبو دیتا ہے.. جب میں نے انہیں بتایا کہ پاکستان کی وادی کالاش میں ”بشالی“ نام کی ایک ایسی ہی کلب اب بھی موجود ہے تو وہ از حد حیران ہوئے.. ان کے خیال میں یہ رسم ہزاروں برس پیشتر متروک ہو چکی تھی..

چنانچہ ہم اپنے بدن میں رونما ہونے والی قدرتی تبدیلیوں سے خوفزدہ رہتے ہیں.. انہیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں.. کالاش نہیں کرتے!

بازار سے آگے ”کالاش ہوٹل“ کا بورڈ نظر آیا..

میں اس کے مالک عبدالخالق کو بھی اسلام آباد میں مل چکا تھا.. اس کا نام

اگرچہ سراسر مسلمان تھا لیکن خصلت میں وہ بدنصیب سراسر کافر تھا۔۔

اس ہوٹل کے دوسری جانب۔۔ سڑک سے اوپر ایک اور کالاش گاؤں تھا جس کے چولہوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔۔ اور دن بھر کی مشقت کے بعد عورتیں اور مرد جھکے ہوئے ان گھروں کو لوٹ رہے تھے جن میں سے رات کی روٹی۔۔۔ گھی اور پنیر میں گندھی ہوئی روٹی کے چولہوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔۔

بمبوریت کی آبادی بکھرتی ہوئی ختم ہونے لگی۔۔ ہم آگے چلے گئے۔

پھر ایک اور گاؤں۔۔ نہائت سہما ہوا اور پہاڑوں کی گود میں دبکا ہوا روڈ کے دائیں جانب نظر میں داخل ہوا۔۔۔ یہ شیخان دیہہ تھا۔۔ ان کے بزرگ بھی کافر تھے اور سیاہ نہیں سرخ کافر تھے۔۔ پھر مسلمان ہوئے تو ہمارے ہاں کی طرح شیخ کہلائے۔۔ کالاش میں قیام کے دوران مجھے ایک شیخ نوجوان نے بتایا تھا کہ ان کے گھروں میں قدیم صندوق ہیں اور ان میں ایسی پرانی پوشاکیں محفوظ ہیں جو ان کے کفر کے ایام سے وابستہ ہیں اور وہ اب بھی کافر تہواروں کی آمد پر انہیں زیب تن کر کے رقص کرتے ہیں۔۔

جہاں وادیٔ بمبوریت اختتام کو پہنچتی ہے۔ وہاں روڈ بھی ختم ہو جاتی ہے کہ اس کے سامنے فلک کے ویری پہاڑوں کی برفانی فصیل ہے جس کے پار افغانستان ہے۔۔ افغانستان کا وہ حصہ جہاں ایک زمانے میں کافروں کے قبیلے اور کنبے ہوا کرتے تھے۔۔ ان کی بستیاں ان کے جنگل اور قبرستان ہوا کرتے تھے۔۔ جہاں محقق رابرٹسن قیام پذیر ہوا اور اپنے تجربات کی بنیاد پر تحریر کی۔۔ اور جن بستیوں کو پھر امیر افغانستان نے تاراج کیا۔۔ قبرستانوں کو ملیامیٹ کیا۔۔۔ بیشتر کافروں کو تہہ تیغ کیا اور جو بچ گئے، وہ خود بخود مسلمان ہو گئے۔۔ کافرستان کا اسلامی نام "نورستان" رکھ دیا گیا۔۔

کیا نور ایسی شے ہے کہ وہ صرف ایک مخصوص عقیدہ رکھنے والوں کے دلوں کو ہی منور کرتی ہے۔۔

یا کوئی کافر بھی اس سے آشنا ہو سکتا ہے۔۔ اپنا کفر ترک کیے بغیر۔۔ میں تو ہرگز منصف ہونے کا اہل نہیں ہوں کیونکہ میں ایک بنیاد پرست مسلمان ہوں۔۔ اگرچہ کفر اور تشکیک کی سرگوشیاں ہمہ وقت مجھے پریشان رکھتی ہیں۔۔

جہاں روڈ کا اختتام ہوتا تھا۔۔ وہاں بمبوریت کا ریسٹ ہاؤس تھا۔۔ کفر کی

کائنات کا اختتام ہوتا تھا۔۔

ریسٹ ہاؤس کی ٹین کی چھتوں، سیب اور اخروٹ کے درختوں کے اوپر برف براجمان تھی اور اس میں سے جو پانی پگھلتے تھے، وہ خاموش نہیں تھے، پرشور ہو کر پتھروں کے ابھاروں میں سے ریسٹ ہاؤس کے پہلوؤں سے نیچے اترتے تھے۔۔

اور وہاں نہ صرف برفوں کے پانی تیز دھاروں کے ساتھ اترتے تھے بلکہ اب گہری اور سرد شام بھی اترتی تھی جو ریسٹ ہاؤس پر چھاؤں کرتی ہوئی وادیٔ بمبوریت کی جانب ایک آسیب کی طرح اترتی تھی۔۔

"شندور ہٹ" کے چوکیدار کی طرح یہاں کے ریسٹ ہاؤس کا رکھوالا بھی ہماری آمد سے متاثر نہ ہوا تھا۔ مہمانوں کی آمد کا رجسٹر بغل میں دابے ہمارے وجود سے لاتعلق ہمارے آگے آگے چلتا تھا۔ "ہاں صاحب آپ کا بکنگ ہے۔۔ جان صاحب نے کروایا ہے۔۔ ادھر دو کمرہ ہے جو آپ کے لیے تیار ہے۔۔ ادھر بہت بڑا بڑا لوگ آتا ہے۔۔ ایس ڈی او صاحب کی مہربانی ہے کہ آپ کو ادھر آنے دیا ہے۔ نہیں تو ادھر صرف بڑا بڑا لوگ آتا ہے۔۔ گورا لوگ آتا ہے۔۔ افسر لوگ آتا ہے۔۔ آپ کیا ہو؟ افسر لوگ ہو؟۔۔"

ریسٹ ہاؤس کی سب سے بڑی سجاوٹ ایک نہائت پرشکوہ گھنے گھیر والا شاندار اخروٹ کا درخت تھا جس کے نیچے کچھ آرام کرسیاں دھری تھیں۔۔ آئندہ دنوں میں ہم سب نے اس کے سائے میں بیٹھ کر یہ فراموش کر دیا تھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں۔۔ اور کیا بمبوریت کے علاوہ بھی اس کائنات میں کچھ اور ہے۔۔

اخروٹ کے اس گھنی کائنات درخت سے پرے چند کھنڈر ہوتی رہائش گاہیں تھیں۔۔ مسمار ہوتی چند کوٹھڑیاں تھیں۔۔

"ادھر گورا صاحب کا گھوڑا باندھا جاتا تھا۔۔ اور اس کا سائیس ادھر رات کرتا تھا۔۔ اس زمانے میں ادھر روڈ نہ تھا۔۔ گورا لوگ ادھر افغانستان کے راستے سے اترتا تھا۔۔ یا لواری سے گزر کر یہاں پہنچتا تھا۔۔ بہادر لوگ تھا۔"

شکستہ کوٹھڑیوں کے اندر چند زنگ خوردہ نعلیں تھیں اور شاید گورا لوگ کی بو تھی۔

اس شام ریسٹ ہاؤس کے ڈائننگ روم میں ایک بنگالی بابو۔۔ سالن کے

ڈونگے میز پر دھرتا ہوا.. نیم سیاہ رنگت اور چپٹی ناک کے ساتھ ایک عجیب مکائی اور لاتعلقی انداز میں خوراک سجاتا تھا.. چکن ہے سر.. روٹی ہے سر.. دال بھی ہے سر..

''آپ ادھر کالاش کی وادی میں کیسے آگیا بنگالی بھائی؟''

''کیا پتہ کیسے آگیا.. ادھر آگیا تو شادی بنایا.. اب بہت سارا بچہ ہے.. اوپر بمبوریت میں اپنا گھر ہے.. کچھ پتہ نہیں کیسے آگیا۔''

''بنگلہ دیش نہیں جائے گا؟''

''وہ کدھر ہے..'' اس نے پہلی بار ہنس کر جواب دیا۔ ''ادھر تو سب کچھ بھول گیا ہے.. بس ہم بہت مصیبت میں تھا.. روٹی روزگار کے لیے ادھر آنکلا.. ادھر شادی بنایا تو ادھر گھر بنایا.. اب ریسٹ ہاؤس میں کُک ہے.. اب کدھر جائے گا.. ادھر فش فارم بھی ہے.. ایسا اچھا تو نہیں جیسا بنگال میں ہوتا ہے لیکن اچھا ہے.. ٹراؤٹ کا فارم ہے.. کل لائے گا اور دال بھات کے ساتھ مچھلی بنائے گا..''

''بنگالی بابا ادھر کافروں میں کیسے رہتا ہے؟''

''ہمارا بیوی کافر ہے.. توبہ توبہ'' اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''پہلے کافر تھا.. بچہ لوگ پکا مسلمان ہے... بمبوریت کی مسجد میں نماز پڑھتا ہے۔''

ریسٹ ہاؤس کی قربت میں ایک نہایت دل کش مسجد تھی..

عصر کی نماز کے لیے ہم تینوں.. اس وادی کفار میں.. اس مسجد میں گئے تھے.. اور جب ہم مسجد کو جارہے تھے تو افغانستان کی جانب سے اترنے والی برفانی ندی کا شور ہمارے کانوں کو فنا کرتا تھا.. اتنا شور تھا..

میں اپنی حیات میں بہت زیادہ سجدے نہیں کر سکا..

پر جتنے بھی کیے من مرضی سے کیے..

میری پیشانی چٹائیوں کی سختی سے ایسے مسلسل آشنا نہیں ہوئی کہ اس پر جنت کا وہ ویزا ثبت ہو جاتا جسے محراب کہتے ہیں.. لیکن میں نے جب بھی سجدہ کیا، میرے اندر نے پکار کی کہ.. تینوں کافر کافر آکھدے، توں آہو آہو آکھ.. اور اپنی رضا اور رغبت سے کیا، ثواب عذاب کا حساب کر کے نہیں کیا.. مول تول، لین دین نہیں کیا.. وہ ترشنگ کی بھوڈانما مسجد ہو یا استنبول کی نیلی مسجد.. وہ سنولیک کی برف کا نات ہو جسے

شاید آج تک صرف میری جبیں نے ہی چھوا ہو.. یا برجی لاء درے کی ٹاپ پر ہمالیہ کے سب سے پرشوکت منظر کے سامنے.. وہاں میں نے ایک ہی رمز پائی ہے.. جہاں برف کا ہو یا پتھر کا.. آس پاس کفر ہو، اسلام ہو یا کچھ نہ ہو.. جب آپ سجدے میں جاتے ہیں تو سب کچھ معدوم ہو جاتا ہے اور آپ کی ناک چاہے کچی مٹی سے مس ہو، برف میں دھنسے، یاک کی کھالوں کی بو میں اترے یا وادی کالاش کے ریسٹ ہاؤس کے برابر میں پانی کے شور میں ڈوبی کسی مسجد میں اترتی شام میں... ہر جگہ ہر مقام پر اس ناک کے راستے اندر جانے والی مہک ایک سی ہوتی ہے.. وہ جو غالب کی گونہ بے خودی ہے، وہ کہیں سے در آتی ہے.. حسب نسب اور مقام تحلیل ہو جاتے ہیں.. عقیدہ کوئی ایک نہیں رہتا.. عقیدے محمود و ایاز کی مانند ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں.. وہ بدھ، ہندو، عیسائی، یہودی یا آتش پرست بھی ہو سکتے ہیں.. تشکیک کے ستائے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں.. اور تب اس کا جلال اور جمال براہ راست اس جبیں کے لمس میں اترنے لگتا ہے.. ایک وحی کی صورت..

ریسٹ ہاؤس کے کشادہ کمرے.. مناسب باتھ روم.. شیشے کی بڑی کھڑکیاں.. باہر تاریکی میں اپنا وجود گم کیے اخروٹ کا کل کائنات درخت..

ہم نیند میں چلے گئے..

اور نیند میں اور کچھ نہیں ہوتا.. ایک عارضی موت ہوتی ہے.. کوئی کفر کوئی ایمان نہیں ہوتا.. اور کوئی پاکستان کوئی کافرستان نہیں ہوتا..

”ندی کنارے کالاش لڑکیوں کے سنگھار آئینے“

وادیٔ بمبوریت میں افغانستان سے اترتی ایک ندی.. اس کے کناروں پہ اونچے نیچے کھیتوں کے ساتھ ایک روڈ ہے.. جس پر بیک وقت صرف ایک جیپ ہی کندھے مارتی ہوئی چل سکتی ہے.. اور اسی روڈ پر ہماری جیپیں رواں تھیں..

ناشتے کے بعد ہم وادی کالاش کی تفصیلی تلاش میں نکلے تھے..

بمبوریت کی روڈ کے اوپر جو پہاڑ تھے، جھکے ہوئے.. ان کے دامن میں وہی بستیاں تھیں جو وقت کی غار میں پیچھے کی طرف سفر کرنے کے بعد ہی نظر آتی ہیں.. کھیتوں سے اوپر جہاں چنار میں سایہ کرتی تھیں، وہاں متعدد گاؤں تھے.. ان کے گھر تہہ در تہہ اور سمٹے ہوئے.. تہذیب کے اس لاوے کے خوف سے سمٹے ہوئے جو ان کے نیچے بمبوریت کے بازار میں بہہ رہا تھا.. گاؤں جو گئے وقتوں کی پرچھائیاں تھے اور نیچے بازار جو موجود میں سانس لے رہا تھا.. وادیٔ بمبوریت لمبائی میں تقریباً دس کلومیٹر کے آس پاس ہے..

اور اس میں جو گاؤں ہیں وہ کفر اور ایمان کی آمیزش ہیں..

وادس، پہلوانڈہ، شیخان دہ اور کندی سار میں آبادی مسلمان ہے..

بتریک ایسا گاؤں ہے جس میں بت کدے بھی ہیں اور کعبے بھی.. اور دونوں میں کوئی تفرقہ نہیں.. شانتی سے ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں..

البتہ انیش، بروِن اور کراکار... سراسر کفر کی بستیاں ہیں..

وادیٔ بمبوریت کی روڈ کے اوپر چٹانوں کے سائے میں یہ تین بستیاں ایسی ہیں جن میں کفر ٹھہرا ہوا ہے اور ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں..

ریسٹ ہاؤس نکلنے کے بعد ہمارا پہلا سٹاپ.. عبدالخالق کا ”کالاش ہوٹل“ تھا..

ایک نیم شکستہ چوبی عمارت کے سامنے گھاس اور ٹیلوں کا ایک وسیع علاقہ تھا جس کے پس منظر میں برفوں کے انبار سجے تھے.. اور ہوٹل سے ذرا ہٹ کر نشیب میں وہ ندی تھی جس کے کناروں تک کالاش خواتین کنگھی پٹی کرنے کے لیے اترتی تھیں.. وہ اپنی کنگھی، چھوٹا آئینہ اور سنگھار کا سامان کسی ایک پتھر کے نیچے سٹور کرتی تھیں.. ہر لڑکی کا پتھر الگ تھا.. آئینہ الگ اور سنگھار الگ..

وہ جب سنگھار کرتی تھیں تو اوپر سے دیکھنے والا یہی سمجھتا تھا کہ وہ ندی سے باتیں کر رہی ہیں.. اور شاید وہ کرتی بھی تھیں..

چنانچہ ندی کے کناروں پر جتنے بھی پتھر ہیں، ان کے نیچے کسی نہ کسی کافر لڑکی کے سنگھار کا سامان پوشیدہ ہے..

اور کون ہے جو سنگھار کرتا ہے؟

اور کون ہے جو اپنی من مرضی سے محبوب پر نثار ہونے کے لیے اپنے آپ کو سجاتا ہے..

وہ منصور حلاج بھی ہو سکتا ہے.. انا الحق کے آئینے کے ساتھ.. جس میں وہ اس کو دیکھتا ہے لیکن اپنے آپ کو بھی دیکھتا ہے.. میں ہی تو خدا ہوں کے سنگھار کے ساتھ... ہاتھ قلم ہونے پر وہ اپنے ہی لہو کے ساتھ اپنے آپ کو سرخی سے سنگھارتا ہے..

شاہ حسین بھی کہتا ہے کہ انسان اندر باہر لال ہے.. اساں مرشد نال پیار ہے.. یہ لال سنگھار اس نے راوی کی ندی کے کنارے کیا اور سرخ لباس میں کفر کی ریت میں رقص کیا..

عبدالخالق مجھے اور میرے خاندان کو دیکھ کر پریشان ہو گیا.. کفار کی ریت ہے کہ وہ اہل ایمان کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں..

اس کے ہوٹل کے مختصر کمرے بہت آرام دہ نہیں ہیں اور چوبی برآمدے کے آخر میں صرف ایک مشترکہ غسل خانہ ہے لیکن اس عمارت کی سب سے بڑی کشش وہ وسیع سبزہ زار ہے جس کا پس منظر برف کا ہے.. دامن وہی ندی ہے ہار سنگھار والی اور اس کے پار کالاش کا سب سے قدیم اور متروک شدہ قبرستان ہے جس میں صرف ایک

صورت لالہ و گل میں نمایاں ہوتی تھی..

سبزہ زار کے کناروں پر خالق کی کافر خالائیں اور پھپھیاں وغیرہ اپنے بچے کھلاتی تھیں اور گھریلو کام کاج میں مصروف تھیں اور ٹورسٹ لوگ دھڑادھڑ ان کی تصویریں اتار رہے تھے..

"صاحب آپ کدھر آگیا.." خالق پریشان تو ہوا لیکن خوش بھی ہوا۔ "مجھے خبر مل گئی تھی کہ آپ ادھر ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا ہے.. اُدھر تو کچھ نہیں ہے۔ ادھر حویلی کے اندر میرے ہوٹل میں ٹھہرو.. ادھر میرا بیوی اور رشتے دار عورت سب بیٹھا ہے اور کنگھی کرتا ہے اور وہ ہار بناتا ہے جو اسلام آباد میں آپ کے گلے میں ڈالا تھا.. بہت کلچر ہے صاحب۔"

"ہم کلچر کو ایک محفوظ اور آرام دہ فاصلے سے دیکھتا ہے خالق.. کلچر کے ساتھ جڑ کر نہیں رہ سکتا.. صرف دور سے اس کا مطالعہ کرتا ہے اور واہ واہ کرتا ہے.." میں نے ہنس کر کہا۔ "ہم کسی روز تمہارے ہاں کھانے کے لیے آئے گا.."

"ادھر پرانے ہوٹل کے ساتھ میں نے دو ماڈرن کمرہ بھی بنایا ہے.. قالین اور فلش سسٹم کے ساتھ.. آپ آؤ تو ادھر بٹھا کر کھانا کھلائے گا.."

"تھینک یو عبدالخالق.."

بہت آگے.. بمبوریت کا بازار تھا.. جس میں سے گزر کر ہم ریسٹ ہاؤس پہنچے تھے.. وہی ٹورسٹ ہوٹل.. دکانیں، سٹور.. سیاح اور آوارہ گرد.. زیر تعمیر شاندار ہوٹلوں کے ڈھانچے.. جن کے بارے میں افواہ ہے کہ یہ بلیک منی کو وائٹ کرنے کے لیے تعمیر کیے جا رہے ہیں ورنہ یہاں اس مختصر وادی میں کتنے لوگ آئیں گے.. کتنے ان کے فائیو سٹار کرائے افورڈ کر سکیں گے.. منافع حاصل کرنے کی گنجائش بہت کم ہے.. تو پھر کروڑوں روپوں کی لاگت سے یہ ہوٹل کیوں تعمیر کیے جا رہے ہیں..

سیاح.. کچھ غیر ملکی.. زیادہ تر ملکی.. جن میں سے بیشتر کافر حسیناؤں کے حسن کے فریب میں مبتلا.. ان کے "آسان" ہونے کی افواہیں سن کر ادھر آئے تھے.. خوب رونق تھی..

پرانی ساخت کے نیم تاریک چوبی ہوٹلوں میں جو چہرے نظر آتے تھے، وہ کچھ

کچھ نشئی لگتے تھے.. یہ غیر ملکی سیاح ان سستے ہوٹلوں میں مہینوں پڑے رہتے تھے.. اور واقعی "پڑے" رہتے تھے کہ انہیں یہاں چترال کی بین الاقوامی شہرت یافتہ چرس وہیں پڑے پڑے مل جاتی تھی.. ان ہوٹلوں میں برادر پاکستانی بھی تھے جن کی آنکھیں صرف کالاش کی لڑکیوں کو تلاش کرتی تھیں اور وہ ان آنکھوں کو ان پر رکھ کر سینکتے تھے.. اور باری باری سینکتے تھے۔ چنانچہ جو جل اٹھتی تھی یہ آنکھ تو دوسری آنکھ بدلتے تھے..

ہم بمبوریت کے بازار میں سے چپس اور چیونگم خرید رہے تھے کہ علی نے ہمیں گھیر لیا.. وہ بہت چلبلا.. کچھ پُتقد سا اور اعصاب پر سوار ہو جانے والا شخص تھا.. ہمیں دامن چھڑانا نہ آتا تھا اور اس نے دامن چھوڑنا سیکھا نہ تھا.. زبردستی ہمارا اگائڈ بنا اور چیونگم کی طرح چپک گیا۔ "تارڑ صاحب میں نے آپ کو پہچان لیا ہے.. میں پشاور میں پڑھتا ہوں۔ بمبوریت کا رہنے والا ہوں.. ادھر گرمیوں کی چھٹیوں میں آیا ہوں.. آپ کو اسپرین چاہیے؟"

"اسپرین...؟" میں نے حیران ہو کر کہا..

"ہاں.. دو دو گولی اسپرین.. چاہیے؟"

"نہیں.."

"ادھر میرے بھائی کا میڈیکل سٹور ہے.. وہاں اسپرین ملتی ہے.. چاہیے تو ابھی پیش کر دوں۔"

"نہیں.."

"آپ کے گلے میں خراش ہے؟"

"نہیں بھئی.."

"اگر ہے تو میں آپ کو لوزنجس لا کر دوں.. میرے بھائی کے میڈیکل سٹور میں ہے.. لا دوں؟"

"بھئی میں نے کہا جو ہے کہ میرے گلے میں خراش نہیں ہے——"

"اچھا تو پھر آپ ٹیلی ویژن پر میرا نام لے کر کہو گے کہ وادی بمبوریت میں علی کے پاس اسپرین اور لوزنجس ہے جو وہ اپنے بھائی کے میڈیکل سٹور سے لاتا ہے۔"

"کہوں گا.."

اس کے فقروں کی ادائیگی میں حماقت کی طرف لڑھکتا ایک بھولپن تھا جو آپ کو زچ بھی کرتا تھا اور لبوں پر زبردستی کی مسکراہٹ بھی لاتا تھا..

وہ مسلسل بولتا تھا..

"صاحب آپ ادھر کدھر آگئے ہو؟"

"کیوں؟"

"یہ تو سخت بدمعاش لوگ ہے.."

"کون؟"

"یہی کالاش کافر.. آپ کو علم ہے کہ یہ لوگ شراب پیتے ہیں؟"

"سبحان اللہ.."

"جی.."

"میرا مطلب ہے لاحول ولا..."

"اور ان کی لڑکیاں اپنی پسند سے شادی کرتی ہیں اور... بہت بے باک ہیں۔"

"نہایت معیوب بات ہے۔" میں نے ادھر ادھر دیکھ کر تسلی کر لی کہ میرے خاندان کے دیگر افراد تو نہیں سن رہے.. وہ دکانوں میں جھانک رہے تھے..

"اور جناب اگر ایک شادی شدہ لڑکی اگر کسی اور مرد کے ساتھ جانا چاہے تو اپنے خاوند کو چھوڑ کر جاسکتی ہے۔"

"یہ تو نہایت مخرب الاخلاق حرکت ہے.."

"لیکن جو مرد اس شادی شدہ لڑکی کے ساتھ میل جول بڑھا کر اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے، اسے تاوان ادا کرنا پڑتا ہے.."

"کس قسم کا تاوان؟"

"جرمانہ ہوتا ہے صاحب.. قبیلے کا رواج ہے.. زواج پورا کرو تو لڑکی کو لے جاؤ.. لڑکی کا خاوند کہتا ہے کہ ٹھیک ہے میری بیوی اگر تمہیں پسند کرتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں... میں نے اپنی شادی پر پچاس بھیڑیں قربان کی تھیں۔ دو ٹین گھی اور پنیر کا خرچ کیا تھا اور قبیلے والوں کو دو دن دعوت کیا تھا تو تم اب سو بھیڑیں قربان کرو اور قبیلے والوں کو چار دن کھانا کھلاؤ.. اور میری بیوی کو لے جاؤ.."

"تو پھر؟"

"تو اکثر اوقات وہ عاشق یا تو تائب ہو جاتا ہے یا یہ شرائط پوری کرنے کے بعد عمر بھر مقروض رہتا ہے اور اپنے عشق کو گالی دیتا ہے.. اسی لیے نوجوان لوگ شادی شدہ لڑکی سے بچ کر رہتا ہے.. اور جناب یہ لوگ جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کی لاش کھلی فضا میں رکھ کر تین روز کے لیے ماتم کرتا ہے، ناچتا ہے اور اس کی زندگی کے کارنامے گیتوں کی صورت میں بیان کرتا ہے.. کہ اس نے اتنا شکار کیا اور اتنے لوگوں کا دعوت کیا.. اتنا بھیڑ قربان کیا.."

"اور تین روز کے بعد کیا ہوتا ہے علی.." مجھے یقین تھا کہ وادی کالاش کے بارے میں جو معلومات وہ مجھے فراہم کر رہا تھا، ان میں اس کی حماقت کی آلودگی بھی شامل تھی لیکن... وہ دلچسپ تھیں..

"اسے قبرستان میں چھوڑ آتے ہیں.. اور نیچے سے.. آئیون کی طرف سے لوگ آتے ہیں اور مردے کے کپڑے اتار کر لے جاتے ہیں.. اسی لیے یہ لوگ اب اپنے مردے کھلے تابوتوں میں رکھ کر قبرستان میں نہیں چھوڑتے بلکہ انہیں زمین میں دفن کر دیتے ہیں اور جس چارپائی پر تابوت لے کر جاتے ہیں، وہ اس مقام پر اوندھی رکھ دیتے ہیں.. تارڑ صاحب آپ کدھر آگیا، یہ تو سخت بدمعاش لوگ ہے.."

"یار غلطی سے آگیا.."

میرے "یار" کہنے پر وہ مزید فرینڈلی ہو گیا.. یوں بھی میں اس کی رفاقت کو انجائے کرنے لگا تھا.. سفر کے دوران نارمل لوگ بے حد ڈل اور شریف ہوتے ہیں اور آپ ان سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے.. لیکن علی ایسے کردار اگرچہ اعصاب پر سوار ہو جاتے ہیں لیکن مدتوں یاد رہتے ہیں.. وہ بنیادی طور پر ایک سادہ شخص تھا، چالاک نہ تھا.. وہ مجھے دیکھ کر قدرے پرجوش ہو گیا تھا اور مجھے متاثر کرنا چاہتا تھا..

بمبوریت کے مقامی مسلمانوں کا یہی المیہ ہے کہ ان کا روزگار مکمل طور پر کالاش کافروں کا مرہون منت ہے.. ان کے ہوٹل، دکانیں اور دیگر کاروبار صرف اس لیے چلتے ہیں کہ روڈ کے اوپر کفار کی بستیاں اور ان کے کافر رواج ہیں ورنہ... بمبوریت سے بہتر اور آسان در جنوں وادیاں ہیں.. سیاح اُدھر کیوں نہ جائیں.. ادھر آتے ہیں تو

کالاشیوں کے لیے آتے ہیں.. چنانچہ ایک محبت اور نفرت کا رشتہ ہے... محبت روزگار کی اور نفرت ان کے کافر ہونے کی.. ان میں سے بیشتر آبادی ایسی ہے جو نیچے چترال سے آکر یہاں آباد ہوئے لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو مقامی ہیں اور مدتوں سے یہیں رہائش پذیر ہیں.. ان کے آباؤاجداد کافر تھے.. ایسے مسلمانوں کا رویہ بہت ہمدردانہ ہے.. وہ ان کے مذہب اور قدیم رسوم کی تضحیک نہیں کرتے.. ان کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں.. جیسے میرے سسرال والے نہایت مذہبی اور کسی حد تک بنیاد پرست مسلمان ہیں لیکن وہ سکھ سائیکی کو سمجھتے ہیں کیونکہ میری ساس صاحبہ کے سگے نانا جان سکھ تھے..

”برون گاؤں اور بے شرم کافر لڑکیاں“

”جناب اب آپ کدھر جائیں گے؟“ علی نے پوچھا..

”بازار کی سیر بہت ہو چکی، اب اوپر برون گاؤں تک جانے کا ارادہ ہے۔“

”تو میں لے کر جاتا ہوں.. چڑھائی بہت ہے.. اور مجھے راستہ آتا ہے..“

بازار کے کناروں پر دکانیں اور چند مکان تھے اور ان کے پیچھے کھیت اور درخت تھے اور چڑھائی تھی جو برون گاؤں تک لے جاتی تھی..

کھیتوں میں.. اپنے فل فینسی ڈریس میں کالاش عورتیں مشقت کرتی تھی.. کمر توڑ مشقت کرتی تھیں.. چارہ کاٹتی تھیں اور اپنی کمر پر بوجھ کر کے گھروں تک لے جاتی تھیں.. کھدائی اور گوڈی کرتی تھیں.. اور کچھ اخروٹ کے درختوں تلے آرام کرتی تھیں..

علی صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ کافروں کی زبان جانتا ہے اور ان کے ساتھ اس کے نہایت دوستانہ روابط ہیں۔ ان خواتین کے پاس جاتا اور نہایت فرینڈلی ہو جاتا لیکن ان خواتین کے ردعمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے برداشت کر رہی ہیں، صرف اس لیے کہ اس کے ساتھ ایک پاکستانی خاندان ہے اور وہ ایک مقامی ہے..

اور یہیں پر وہ سانحہ ہوا جس کا میں سرسری ذکر کر چکا ہوں..

ہم ہانپتے ہوئے برون گاؤں کی طرف جا رہے تھے.. ایک چھتنار اخروٹ کے درخت تلے دو نہایت دیدہ زیب ننھی منی نیلی آنکھوں والی کالاش لڑکیاں سستا رہی تھیں.. ان کے چہرے ایسے تھے کہ میں انہیں محفوظ کرنا چاہتا تھا.. قریب سے ان کی تصویر اتارنا چاہتا تھا.. میرا خیال ہے کہ مارلن منرو یا کیٹ ونسلو کی اتنی تصویریں نہیں

اتری ہوں گی جتنی کہ ایک عام کالاش لڑکی کی اترتی ہیں... وہ مسلسل کیمروں کی کلک کلک کی زد میں رہتی ہیں اور یہ ان کا روزگار بھی ہے.. خاص طور پر گرمیوں کے موسم میں.. اس سیزن میں بیشتر کالاشی خواتین پورے رچاؤ کے ساتھ اس لیے تیار ہوتی ہیں کہ ان کی تصویریں اتاری جائیں.. لیکن مفت میں نہیں.. طے شدہ ادائیگی کے ساتھ.. آپ اگر مذاکرات کے بغیر کیمرے کا رخ ان کی جانب کریں گے تو وہ منہ چھپالیں گی یا ہو سکتا ہے سنگ زنی بھی شروع کر دیں.. چنانچہ میں نے علی سے کہا کہ آپ ان خواتین سے جاکر درخواست کریں کہ میں ان دنوں رائج دس روپے فی تصویر کے حساب سے ادائیگی پر آمادہ ہوں... اور ان کی چند تصویریں اتارنا چاہتا ہوں..

علی نے "ابھی جاکر ان کی زبان میں بات کرتا ہے" کہا اور اڑتا ہوا ان کے ہاں پہنچا.. وہ مذاکرات کرنے لگا اور ہم منتظر رہے.. پھر وہ خوش و خرم واپس آیا اور کہنے لگا۔ "نہیں صاحب مجبوری ہے، ان کا تصویر نہیں اُتر سکتا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ان کو حیض آرہا ہے—"

"ہیں؟" میں گڑبڑا گیا۔

"میں نے ان سے پوچھا ہے.. اور وہ کہتی ہیں کہ ہم ناپاک ہیں.. ہمیں حیض آرہا ہے اور اس حالت میں ہم تصویر نہیں اتروا تیں.. اور..."

میری حالت قدرے ناگفتہ بہ ہو گئی کیونکہ.. عینی اور میمونہ بھی میرے ہمراہ تھیں اور سلجوق اور سمیر یہ گفتگو سن کر منہ اٹھائے آسمان کو تک رہے تھے.. اگر یہ مکالمے انگریزی زبان میں ادا ہوتے تو میں بچاؤ کے لیے کہہ سکتا تھا کہ یہ دراصل "ہمپٹی ڈمپٹی" والا "ہمپٹی" ہے.. لیکن یہ زبان اردو کوئی بچاؤ نہ تھا..

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے.." میں نے علی کو فوراً روک دیا۔ مبادا وہ کوئی اور تفصیل نہ بیان کرنے لگے.. میں نے یہ بھی مناسب سمجھا کہ اس مخدوش کردار کو یہیں سے رخصت کر دیا جائے.. اس کا کچھ پتہ نہیں یہ کفار سے گفتگو کے بعد کوئی اور خجالت آمیز رپورٹ نہ پیش کر دے..

برون گاؤں... ایک سہا ہوا.. ٹائم ٹنل کے آخری سٹاپ پر رکا ہوا ایک

گاؤں۔ ڈربہ نما چوبی گھروں کے اوپر چٹانوں کا جھکاؤ..

اخروٹ کے گھنے درخت جن میں سے سورج کی روشنی بمشکل اترتی تھی.. اور نیچے خودرو گھاس اور جنگلی بوٹے..

ایک بوڑھی عورت ایک پتھر پر بیٹھی سیاہ رنگ کے ایک کپڑے پر کشیدہ کاری کرتی ہوئی.. ہمیں اپنی جانب آتے ہوئے دیکھتی ہے تو اسے سمیٹتی ہے اور اپنے دھواں لگے گھر کے اندر روپوش ہو جاتی ہے..

چند بچے.. ہماری جانب لپکتے ہیں کہ شاید یہ تصویر اتاریں گے اور ہمارے لیے ٹافیوں اور چیونگم کا بندوبست ہو جائے گا..

اور کچھ مرد.. ٹوپیوں میں رنگین پر لگائے ایک بہت بڑے شہتیر کو آرے کی مدد سے چیر رہے ہیں..

میمونہ اور عینی کی موجودگی کے باعث ہمیں ایک کالاش گھر کے اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی..

کالاش کا لباس سیاہ ہے لیکن ان کے گھروں کے اندر زیادہ سیاہ ہیں.. ان میں سامان بہت مختصر ہے.. ایک تخت پوش.. پرانے پیڑھے.. چوکیاں.. ایک لالٹین.. چند کمبل نما چیزیں.. لکڑی کے کچھ برتن.. ایک توا.. چولہا اور دیواریں سب کی سب دھوئیں کی کالک میں سیاہی کے ذرے ٹپ ٹپ گراتی ہوئی.. ایک تین انچ کالاش لڑکی جو بہت دیر سے ایک آتش دان کی سیاہی میں پوشیدہ ہمارے سامنے آنے سے گریز کر رہی تھی عینی کو دیکھ کر... جو ایک نیلی جین، ڈھیلی ٹی شرٹ اور ایک سواتی چادر میں ملبوس تھی.. جھجکتی ہوئی سامنے آگئی..

عینی نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا..

"تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی..

عینی نے پھر اشارے سے پوچھا کہ نام.. وہاٹ از یور نیم.. کہ بیشتر کالاش انگریزی کے لفظ سمجھ لیتے ہیں..

وہ ہنستی رہی اور ہمارا جائزہ لیتی رہی اور پھر کہنے لگی.. "بی بی..." "بی بی سے پہلے

بھی اس نے کچھ کہا جو ہمارے پلّے نہ پڑا...

اس کافر بی بی کی عمر بمشکل تیرہ چودہ برس تھی.. اس کے سیاہ چوغے پر نہایت ہی دیدہ زیب برفی کے ٹکڑوں کی شکل کی کشیدہ کاری تھی.. مدھم سرخ اور بجھے ہوئے نیلے رنگ کے دھاگوں کی دل کش اور قدیم بُنت تھی۔ گلے میں موتیوں کی مالائیں تھیں۔ بال کسے ہوئے اور مینڈھیوں میں گندھے تھے۔ ان پر گھنگرو ٹانکے ہوئے تھے اور نیلے اور سرخ رنگ کی پٹیاں تھیں اور سر پر ایک کلغی تھی.. اس کی آنکھیں بہت نیلی تھیں اور ان کے کنارے سرمے کی سیاہی ان کی نیلاہٹ کو گہرا کرتی تھی.. جیسے ایک جھیل کنارے کی گھاس پانی میں لٹکتی ہے تو اس کی قربت میں نیلاہٹ گہری ہوتی ہے..

اس کے دونوں رخساروں پر کجلے کے زیبائشی تِل تھے جو اس کے جمال کو نکھارتے تھے.. وہ آمادۂ قتل تھی.. انگریزی میں جو کہا جاتا ہے کہ وہ قتل کرنے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی.. تو یہ کلاش ٹین ایجر.. اپنے حسن سے آگاہ.. جانے اپنے ہار سنگھار پر کتنا وقت صرف کر کے.. قتل کے لیے تیار ہو کر آئی تھی..

میں نے دنیا بھر میں.. کسی روم، کسی پیرس میں خواتین کو ایسے اعلیٰ ذوق جمال کے ساتھ میک اپ میں نہیں دیکھا.. جیسا کہ کافرستان میں دیکھا..

روم اور پیرس کی خواتین.. اور ان میں سے بھی معدودے چند فیشن میگزینز.. بیوٹی پارلرز اور تازہ ترین رواج کی مدد سے اپنا سنگھار کرتی ہیں لیکن کلاش خواتین.. صرف قدرت اور اپنی جبلّت پر انحصار کرتی ہیں..

ان کے لیے.. چولہے کی کالک.. نینوں کا کجلا بنتی ہے.. پرندوں کے پَر اور سیپیاں سنگھار کے سامان ہیں.. بلند چراگاہوں میں چرتی بھیڑوں کی اون لباس بنتی ہے.. اگرچہ جدید تہذیب وہاں تک پہنچ رہی ہے لیکن انہوں نے ابھی تک اس کے اثرات کو قبول نہیں کیا اور اپنے سنگھار کے قدیم طور طریقے نہیں بدلے.. سینکڑوں برس کی تہذیبی تنہائی کے باوجود وہ جانتی ہیں کہ دل کش کیسے ہوا جاتا ہے.. جیسے ہنزہ کے قصبے پسو میں.. ایک جھیل کی جانب سفر کرتے ہوئے ماسٹر حقیقت کی بیٹی نے ایک جنگلی بوٹی کو جڑ سے اکھاڑا اور اس کے پتوں کو لبوں پر مسلا تو وہ جیسے خون آلود نظر آنے لگے اور اس نے ہنسی سے کہا۔ "یہ ہماری لپ سٹک ہے۔"

بس یہ طے ہوا کہ حسین بننے کے لیے پیرس یا روم کی شرط نہیں.. ایک گم گشتہ خطے کافرستان میں بھی ایک عورت حسین ہونا چاہتی ہے.. تو ہو جاتی ہے.. اس کی خصلت نہیں بدلتی..

سلجوق اور سمیر سواتی ٹوپیاں سروں پر سجائے گھر کے باہر شہتیر کو چیرنے والے کافروں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے..

"ابو تصویر اتاریں.." انہوں نے فرینڈلی کافروں کے ساتھ ایک گروپ بنا کر بڑی اور چوڑی مسکراہٹیں نمایاں کیں..

اس تصویر میں دیگر کفار کے ہمراہ سلجوق تو درمیانے درجے کا کافر لگتا ہے لیکن سمیر اپنے چٹے گورے رنگ روپ کی وجہ سے نہایت بلند پائے کا کافر دکھائی دیتا ہے..

”کافر قربان گاہ اور گھوڑا نما خدا“

برون گاؤں میں بھٹکتے ہم عبادت گاہ تک پہنچے..

دروازے کے دونوں جانب چند ہری شاخیں لٹکتی تھیں اور اوپر چوبی گھوڑوں کے سر.. ایسے تھے جیسے ریس کے آخری لمحوں میں ہوں.. گردن کھینچتے.. آگے کو جیتنے کی کوشش میں.. اپنے بدن سے باہر آتے ہوئے..

عبادت گاہ کے اندر تاریکی تھی اور ٹھنڈک ٹھہری ہوئی تھی.. لکڑی کے بُرادے کی مہک تھی۔ شہتیروں پر کچھ نقش اور عبارتیں تھیں۔ خشک ٹہنیاں اور پتے تھے۔ فرش کچا تھا.. ہمیں گھبراہٹ سی ہوئی اور ہم باہر آ گئے.. صرف چند لمحے ہم اندر ٹھہرے تھے لیکن سورج کی روشنی میں آئے تو جیسے صدیوں کے بعد نکلے ہوں..

دھوپ میں.. ایک بڑے پتھر پر ایک کالاش بڑھیا.. سکڑی ہوئی، ضعیف اور جھریوں کی پوٹلی.. ایک مجسمے کی طرح ساکت بیٹھی تھی.. اس کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں..

”یہ مرنے کے انتظار میں ہے..“ ایک کالاش نے سرگوشی کی۔

سلجوق اس کے پاس ہوا۔ ”ہیلو....“

اور اس کے لبوں پر ایک جھریوں بھری مسکراہٹ آئی لیکن اس نے جواب میں کچھ نہ کہا.. پاکستانی شمال میں، ہندوکش اور ہمالیہ کی وادیوں میں بے شمار داستانیں ہیں.. ان کی جو موت کی راہ دیکھتے تھے.. کہیں رواج تھا کہ ایک خاص عمر کے بعد بڑا بیٹا اپنی ماں یا باپ کو کسی ویران بلندی پر تنہا چھوڑ آتا تھا.. کہیں ایسے قصے ہیں کہ بوڑھوں کو کھائیوں میں دھکیل دیا جاتا تھا، صرف اس لیے کہ وہ موت کے انتظار کی اذیت سے

دوچار نہ ہوں۔ امریکہ کے ریڈ انڈین میں بھی دستور تھا کہ کوئی بوڑھا یہ جان جاتا تھا کہ وہ مرگ کی قربت میں ہے تو بستی سے دور کسی ٹیلے پر جا بیٹھتا تھا اور اطمینان سے اپنے آخری سانس کا انتظار کرتا تھا.. بیماری یا حادثے کے نتیجے میں موت کچھ اور ہے اور اپنے حواس میں رہ کر یہ جان لینا کہ اب اجل کے اندھیروں کے سوا اور کچھ نہیں کچھ اور ہے.. میں نے بڑے شہروں میں عالی شان گھروں میں بیٹھے بوڑھوں کو بھی اس انتظار میں دیکھا ہے.. ان کی آل اولاد کو دیکھا ہے کہ وہ نہیں چاہتے کہ وہ بچھڑ جائیں اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ ان کا انتظار طول پکڑ جائے اور اذیت کا باعث بنے.. وہ کالاش ہو یا ہندوکش کی وادیاں یا بڑے شہر ہوں موت کے منتظر ہمیشہ تنہا رہ جاتے ہیں..

پتھر پر براجمان بڑھیا کی بھی آل اولاد ہوگی، کھیتوں میں کام کرتی، چراگاہوں میں بھیڑوں کے ساتھ، اپنے بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف.. لیکن وہ موت کے انتظار میں اس کی شریک نہیں ہو سکتی تھی..

شہتیر چیرنے والے کالاش مرد اب ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے..

”اوپر قربان گاہ ہے..“ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”دیکھے گا؟“

”دیکھے گا..“

برون گاؤں کے کھیتوں کو سیراب کرنے والی ایک نالی کے کنارے جھاڑیوں اور درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں میں سے راستہ بناتے وہ دونوں آگے آگے چل رہے تھے.. پھر تھوڑی سی چڑھائی شروع ہو گئی اور ہم ذرا احتیاط کرنے لگے.. درختوں کا ایک گھنا جھنڈ عبور کیا..

برون گاؤں کے اوپر.. کہیں بلندی پر.. جہاں چناروں کے سائے ختم ہوتے تھے، وہاں ایک جنگل کے اوپر.. اونچائی پر.. ایک سکوت بھرے بھید کے اندر درختوں کے چھاؤں میں وہ قربان گاہ تھی.. ایک احاطہ تھا.. جس کا چوبی پھاٹک بند تھا اور اسے دھکیل کر کھولتے ہوئے مجھے جھرجھری سی آئی..

قربان گاہ کا یہ احاطہ جو چھاؤں میں آیا ہوا تھا، زیادہ قدیم نہ تھا.. اس کے گرد دیار کی لکڑی کے تختوں سے بنائی گئی ایک ریلنگ تھی.. جیسے پارکوں اور باغوں میں ہوتی ہے.. لیکن ان تختوں پر کچھ نقش اور شکلیں کھدی ہوئی تھیں... جیو میٹرک پیٹرن۔

بھاگتے ہوئے مارخور اور ان کے سینگ، شکاری جوان کے تعاقب میں تھے اور نہ سمجھ میں آنے والی آڑی ترچھی لکیریں.. یہ نقش اور شکلیں ہزاروں برس پیشتر کے توہمات تھے.. یا ایمان تھے.. یہ عجیب بات ہے کہ قدیم ترین تصویریں جہاں کہیں بھی دریافت ہوئیں، ان میں ہمیشہ شکار کے منظر بنائے گئے اور ان میں سینگوں والے جانور ہمیشہ ایک طرح کے ہوتے تھے... یہ نقش فرانس کی غاروں میں دریافت ہوں یا سندھ کے کنارے چلاس کی چٹانوں پر کندہ ہوں.. ان کی شکل تقریباً ایک ہوتی ہے.. کالاش کی اس قربان گاہ کے تختوں اور ستونوں پر کھدی ہوئی شبیہیں اگرچہ دو چار برس پرانی تھیں لیکن انہیں بنانے والے ہاتھ ابھی تک قدامت میں تھے، اس لیے یہ فرانس اور چلاس کے نمونوں سے شدید مماثلت رکھتی تھیں.. یہ کوئی پرانے منتر تھے، خواہشیں تھیں کہ خدا تھے، ہم ان کے بھید کو نہیں پہنچ سکتے..

اس قربان گاہ کا شمالی حصہ چٹانوں کے ساتھ تھا اور وہاں کسی مقدس درخت کی شاخوں میں، مرجھائی ہوئی خشک شاخوں اور ان کے سوکھے ہوئے پتوں میں سے چار چوبی "خدا" سر اٹھائے ہم سے لاتعلق ایستادہ تھے.. ان پر سورج کی روشنی یوں ٹھہرتی تھی کہ وہ زندہ لگتے تھے.. گھوڑوں کے سروں والے چار مجسمے لکڑی سے تراشیدہ چار خدا.. جو اس قربان گاہ کا آخری بچ تھے..

برون گاؤں کی عبادت گاہ کے دروازے پر جو گھوڑوں کے سر تھے، وہ بھی یہی "خدا" تھے..

اور ان چاروں سروں کے نیچے.. شاخوں اور پتوں کے نیچے دیوار پر.. تختوں پر خون کے چھینٹے تھے..

یقیناً یہ انسانی خون کے چھینٹے نہ تھے..

کالاش کافروں کی قربان کردہ بھیڑ بکریوں کی رگوں اور نرخروں میں سے ابلنے والے خون کے چھینٹے تھے..

لیکن اس کے باوجود ان کی ایک دہشت تھی..

خون کے چھینٹوں کی ہمیشہ ایک دہشت ہوتی ہے..

قربانی کا تصور تمام مذاہب میں چلا آتا ہے.. ہمیشہ سے چلا آتا ہے..

حضرت ابراہیم نے جب حکم ربی سے اپنے فرزند کے گلے پر چھری رکھی..

جب دریائے نیل کی طغیانی روکنے کے لیے کنواری لڑکیوں کی قربانی دی جاتی تھی..

جب ہم اپنے اللہ کی خوشنودی کے لیے قربانی دیتے ہیں..

لاہور میں میرے جاننے والے ایسے ہیں جو مکان تعمیر کرنے سے پیشتر اس کی بنیادوں میں کالا بکرا قربان کرتے ہیں.. اس کا خون بنیادوں میں چھڑکتے ہیں اور اس کا سر ان میں دباتے ہیں..

خاص طور پر منگل کے دن لاہور کی سڑکوں پر صبح سویرے کہیں نہ کہیں کالے بکرے کا سر دکھائی دے جاتا ہے.. اب بھی..

کالی دیوی کے مندر میں انسان کی قربانی مستحسن ٹھہرتی تھی..

ہم نظر اتارنے کے لیے جانور قربان کرتے ہیں..

کیا عقیدے کے مختلف ہونے سے قربانی کا ثواب بدل جاتا ہے..

کالاش مذہب کا اہم ترین جز قربانی ہے.. اور پھر قبیلے کی دعوت ہے.. کچھ عرصہ پہلے تک مسلمان بھی ان کی دعوتوں میں شامل ہوتے تھے..

برون گاؤں سے اوپر چٹانوں کے سائے میں ہم پانچوں منہ اٹھا کر بلند درختوں کو دیکھتے تھے اور ان کی شاخوں میں سجے ہوئے سینگوں کو دیکھتے تھے جو قربانی کے بعد کسی قدیم رسم کی پیروی میں وہاں نصب کر دیے گئے تھے.. اور ہمارے دل میں انجانے کا ایک ڈر تھا.. آپ یقین نہ بھی رکھتے ہوں تو بھی ایک خانقاہ میں.. کسی مندر کے اندر.. کسی عجائب گھر میں رکھے گئے کسی قدیم خدا کے سامنے.. ایک وہم سرسراتا ہے.. یہ ایمان کی کمزوری نہیں ہوتی، دوسرے انسانوں کے یقین کی بلاارادہ تعظیم ہوتی ہے.. بے حد خاموشی تھی..

صرف درختوں کے گھنے وجود میں سے چند سرگوشیاں اترتی تھیں، ان میں سجے سینگوں کی چپ میں بھی کوئی آواز تھی.... اور یہ ہزاروں برس پرانی تھیں اور آگاہ نہیں تھیں کہ قربانی کا مفہوم زمانوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے..

گھوڑا نما خداؤں کے چوبی مجسموں تلے درختوں کی خشک شاخوں کے نیچے اب بھی اس خون کے چھینٹے تھے جو ہمارے نزدیک رائیگاں تھا.. شاید کوئی کالاش جب

عید قربان کی سویر میں قربانی کے بکرے کے خون کے چھینٹے دیکھتا ہے تو وہ انہیں رائیگاں جانتا ہے..

سلجوق اور سمیر گھوڑا خداؤں کے گلے میں ہاتھ ڈالے تصویریں اتروا رہے تھے.. عینی اپنی ڈرائنگ بک میں کھڑکی کے ستونوں پر کندہ جو نقش اور شبیہیں تھیں، انہیں نقل کر رہی تھی.. کیا گھوڑوں کے سروں والے یہ خدا بھی خداؤں کے کولڈ سٹوریج میں سٹور ہونے کو تھے.. کیا ان کی خدائی کے یہ آخری دن تھے..

پھر یہ متروک ہونے کو تھے..

یونانی اور مصری دیویاں اور دیوتا... بابل اور نینوا کے خدا.. بامیان کے بدھ.. گندھارا کا فاسٹنگ بدھا.. دھرتی ماں کے مجسمے.. موہنجوداڑو، ہڑپہ اور مہر گڑھ کے خدا.. انکا تہذیب کے دیوتا... سب کے سب اب خداؤں کے کولڈ سٹوریج میں.. متروک شدہ حالت میں.. شاید میری نسل کا کوئی سیاح آج سے سو برس بعد اپنے خاندان سمیت انہیں کالاش خداؤں کو لاہور کے عجائب گھر میں دیکھے گا.. متروک شدہ حالت میں..

لیکن اس لمحے.. ابھی ان کے پجاری موجود تھے..

اور یہ پجاری میرے خدا کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے..

قربان گاہ پر سایہ کرتے بلند اور گھنے درختوں میں سے چند سرگوشیاں نیچے آتی تھیں.. کس خدا نے متروک ہونا ہے، تم کیسے کہہ سکتے ہو..

ہم قربان گاہ سے نکلے.. نیچے اترے.. واپس بمبوریت بازار میں آئے اور وہاں جدید تہذیب کے تماشے دیکھے.. سیاح.. کیمروں کی فلیش لائٹس.. کیمپنگ سائٹس.. ہوٹل.. جیپیں.. کوکا کولا اور پٹیٹو چپس.. اور برگر... چکن برگر.. اس کے باوجود کہ کالاش چکن کو تقریباً حرام اور نجس سمجھتے ہیں..

پتہ نہیں برون کے اوپر قربان گاہ میں جو گھوڑا نما خدا تھے، وہ نیچے بمبوریت بازار میں جو تہذیب کے تماشے تھے، ان پر عذاب نازل کرنے کی پوزیشن میں تھے کہ نہیں تھے..

کیونکہ... یہ سب قیامت کی نشانیاں تھیں..

"کافر لڑکی پاکستانیوں کو سنگسار کرتی ہے.. ندی کے پار"

دوپہر کا کھانا ہم نے بمبوریت کے قدیم ترین "ہوٹل بے نظیر" کے چوبی برآمدے میں کھایا.. کھایا تو کیا بس نگلا کیونکہ ابلے ہوئے چاول ایک سفید لیس دار دلدل کی صورت میں تھے اور ان پر ڈالی جانے والی چنے کی دال کا ہر دانہ یگانہ تھا اور موتی ایسا تھا کہ کہ اس میں سختی بھی موتیوں جیسی تھی.. اور جیسے ہیرے کو چاٹ کر یا نگل کر خودکشی کی جا سکتی ہے تو بس یہی خصوصیت دال کے ہر دانے میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی..

ویٹر بھی ہمیں یوں بے رخی سے سرو کر رہا تھا جیسے کھانے کی قیمت اس نے اپنے پلے سے ادا کرنی ہے..

میمونہ نے تو فوراً روزے کی نیت کر لی اور بچوں نے بڑی بڑی شکلیں بنائیں، اگرچہ اللہ کے فضل سے میرے بچوں کی شکلیں ایسی ہیں یا تمام والدین کی طرح ہمیں بھی ان کی شکلیں ایسی دکھائی دیتی ہیں کہ وہ ان کو بہت بُری بُری بھی بنائیں تو بھی بہت بُری نہیں بن سکتیں..

"یہ... کھانا کون بناتا ہے؟" میں نے ویٹر سے پوچھا..

"ہم بناتا ہے.. کیوں؟" اس نے دھمکی کے انداز میں جواب دیا۔

"یونہی پوچھا تھا.. چاول عجیب سے ہیں اور دال میں پانی اور سختی بہت ہے۔"

"ادھر تو گورا لوگ بھی یہی کھاتا ہے.. وہ تو بہت لائک کرتا ہے۔"

"سوری.." میں فی الفور بیک آؤٹ کر گیا..

یہ گورالوگ کا حوالہ ہمیشہ مجھے چت کر دیتا تھا..

وادیٔ شگر کے ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار اگر ایک گورے کو تھوڑا سا آٹا گھول کر اس میں دو تین خوبانیاں شامل کر کے اس ملغوبے کو "فروٹ کسٹرڈ" کے طور پر پیش کر دیتا ہے تو گورالوگ اسے حلق سے اتارتے ہوئے صرف "سٹرینج کسٹرڈ" کہتا ہے اور شکایت نہیں کرتا.. وادیٔ ہنزہ کے ٹورسٹ کاٹج میں اگر کچھ گھاس اور گوبھی کے ڈنٹھل ابال کر آپ کے سامنے رکھ دیئے جاتے ہیں اور آپ ابکائیاں لیتے ہوئے اسے نگلنے کی کوشش کرتے ہیں اور شکایت تو نہیں یونہی تذکرہ کرتے ہیں کہ اس میں کچھ ذائقہ نہیں تو جواب ملتا ہے "گورالوگ تو اسے بہت شوق سے کھاتا ہے" اور چہرے کے تاثرات سے فقرہ یوں مکمل ہوتا ہے کہ.. تمہیں کھاتے ہوئے کیوں موت آتی ہے.. آخر پاکستانی ہو ناں..

دراصل گورالوگ سے مراد ایک انجان، حیرت زدہ، احتیاط پسند اور مقامی آبادی کا دل نہ دکھانے والا سیاح ہے.. میں بھی اپنے سفروں کے دوران کئی مقامات پر "گورالوگ" ہو چکا تھا.. دشت مرگ کے کنارے ایک ہٹی کوٹھڑی میں جب ایک افغان آپ کے سامنے پانی میں تیرتی چند بھنڈیاں رکھ دیتا ہے تو آپ انہیں چٹخارے لیتے ہوئے نگل جاتے ہیں کہ شاید یہی مقامی کلچر ہے اور یہ لوگ یہی خوراک کھاتے ہوں گے.. اگر شکایت کریں گے تو کہیں مقامی ثقافت کی توہین نہ ہو جائے.. دمشق میں آپ بدمزہ اور پھیکا لوبیا نوش کرتے ہوئے "واللہ.. سبحان اللہ" کہتے جاتے ہیں.. ایران کے شہرۂ آفاق چلو کباب کھاتے ہوئے آپ کبابوں اور چاولوں کی سختی کا ہرگز تذکرہ نہیں کرتے بلکہ ویٹر کو "میں آپ پر قربان" کہتے جاتے ہیں..

بہر حال اپنے وطن میں گورالوگ بننا.. بس کہ دشوار ہے۔

البتہ اس کھانے کا فائدہ یہ ہوا کہ خوراک کے بعد جو مستی اور نیم غنودگی طاری ہوتی ہے اور انسان قیلولے پر مائل ہوتا ہے.. اس کی بجائے ہم زیادہ ہوشیار ہو گئے اور سیر پر مائل ہوئے..

ہم پھر "باشالی" کی قربت میں سے گزرے جہاں گھنی گھاس اور چھاؤں میں سفید سانپوں کی طرح سرسراتی برفانی نالیوں کے آس پاس کالاش خواتین اپنے ایام گزار رہی تھیں.. یہ ان کے آرام اور تفریح کے دن تھے.. کھانا گھر سے آجاتا تھا اور وہ باشالی

کے ماحول کو ایک کلب کی طرح انجائے کر رہی تھیں.. بشالی کی گھاس سے پرے ذرا گہرائی میں وہ ندی تھی جو افغانستان سے اتر کر وادی بمبوریت کو پرشور اور آباد کرتی تھی.. دونوں کناروں پر پتھروں کا ایک وسیع علاقہ تھا اور ندی ان کے درمیان بہتی چلی جاتی تھی اور وادی کے منظر میں کشش بھرتی تھی..

ندی کے پار جانے کے لیے لکڑی کا ایک پُل تھا..

اس پُل کے پار... ندی کے دوسرے کناروں پر ڈھلوانیں سر اٹھاتی تھیں اور کھیت اور چراگاہیں تھیں... اس پُل کے پار صرف مقامی لوگ ہی جاتے تھے.. سیاح ادھر کا رخ کم کرتے تھے کہ وہاں ان کی دلچسپی کی کوئی شے نہ تھی.. وہ بمبوریت بازار میں ہی مٹر گشت کرتے رہتے تھے.. لیکن ہم اس کے پار جا کر بمبوریت سے الگ ہو کر ایک فاصلے سے اس وادی کو دیکھنا چاہتے تھے..

ہم پُل کے پار جانے کے لیے باشالی سے نیچے اترے تو بائیں جانب ایک عجیب ڈرامہ دیکھا.. ایک کالاش لڑکی ہاتھ میں چھڑی پکڑے پتھروں کو پھلانگتی اپنی بھیڑوں کی رکھوالی کر رہی تھی.. بھیڑیں کبھی گھاس پر سر جھکاتیں اور کبھی ندی کے پانیوں میں تھوتھنیاں ڈال دیتیں.. کوئی ایک بھیڑ اپنے گلے سے الگ ہوتی تو وہ لڑکی اپنا سیاہ لبادہ سنبھالتی اس کا پیچھا کرتی اور چھڑی سے اسے ہانکتی ہوئی واپس لے جاتی.. یہ ایک مشقت طلب نگہبانی تھی.. وہ بھیڑوں کا پیچھا کر رہی تھی اور دو تین پاکستانی نوجوان اس کا پیچھا کر رہے تھے.. وہ اس جستجو میں تھے کہ نہ صرف اس کی تصویریں اتاری جائیں بلکہ ایک کافر حسینہ کے ہمراہ پوز بنا کر اپنی تصویریں بھی اتروائیں.... وہ لڑکی ان سے خاصی عاجز آچکی تھی.. وہ جونہی کیمرے کا رخ اس کی جانب کرتے یا پنتے ہوئے اس کے ساتھ میل جول بڑھانا چاہتے تو وہ جھک کر کوئی مناسب سائز کا پتھر اٹھا کر ان کی جانب اچھال دیتی.. اور شاید اپنی زبان میں ان کی ماؤں بہنوں کی اخلاقیات پر بھی شدید حملے کرتی.... وہ نوجوان اس کے غصے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور ہنس رہے تھے.. اور جوانی کے گھمنڈ میں اور حماقت میں اس کے قریب ہوتے جاتے تھے.. کالاش لڑکی بھی شاید اپنے شکار کی قربت کی منتظر تھی۔ اس نے ایک پتھر ایسا تاک کے مارا کہ ان میں سے ایک رومیو کا ماتھا خون آلود ہو گیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا بیٹھ گیا.. اور اس کے ساتھی

اپنی خرمستیاں فراموش کر کے اسے ابتدائی طبی امداد دینے لگے..

ایسے نوجوان اس وادی کی سحر انگیزی میں زہر گھولتے ہیں.. شوخے، تیز سے عاری اور اپنے تئیں دل پھینک.. کالاش مرد اپنی فطری امن پسندی کے باعث کم ہی لڑنے مرنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور یہ نوجوان اس صورت حال کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں.. وادی کالاش میں.. خاص طور پر ٹورسٹ سیزن میں.. نوجوان لڑکیاں خاص طور پر اپنے آپ کو سنگھارتی اور ڈریس اپ کرتی ہیں، صرف اس لیے کہ سیاح ان کی تصویریں اتار سکیں.. آپ اپنے گائیڈ یا کسی مقامی شخص کے توسط سے.. یا اخلاقی حدود میں رہ کر خود بھی ان سے اجازت لیتے ہیں اور مناسب "ماڈلنگ فیس" طے کر کے اطمینان سے ان کی تصویریں بنا سکتے ہیں.. لیکن آپ ان کو بے وقوف نہیں بنا سکتے..

کسی بھی وادی کے مکینوں کو چاہے آپ نہایت دشوار اور ہلاکت خیز سفر کے بعد وہاں تک پہنچیں.. آپ بے وقوف نہیں بنا سکتے.. کیونکہ انہیں ٹورسٹوں کی عادت ہوتی ہے.. وہ ان کی روزمرہ زندگی کا معمول ہوتے ہیں.. وہ ان کی خصلت سے واقف ہوتے ہیں.. اسکولے بے شک تہذیب کا آخری گاؤں ہو.. کے ٹو کا آخری آباد پڑاؤ ہو.. وہاں بھی اگر آپ کیمرے کا رخ دور دراز کے کھیتوں میں کام کرتی کسی خاتون کی طرف کریں گے تو وہ ناگواری سے یا تو اپنا چہرہ چھپا لے گی یا جھک کر کھیت میں روپوش ہو جائے گی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ کیمرے میں دوربین بھی ہوتی ہے.. یعنی زوم لینز ہوتا ہے اور کلوز اپ بن سکتا ہے.. یہی صورت حال کالاش کی وادیوں میں ہے.. آپ ایک خاتون سے طے کر لیتے ہیں کہ ہم فی تصویر آپ کو دس روپے ہدیہ پیش کریں گے.. اور فوٹو سیشن کے بعد آپ پچاس کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہیں تو ہتھیلی بند نہیں ہوتی کھلی رہتی ہے اور وہ اطلاع کرتی ہے کہ حضور پانچ نہیں.. آپ نے آٹھ تصویریں اتاری ہیں.. کیمرے کا بٹن آٹھ مرتبہ دبایا گیا ہے..

چنانچہ آپ انہیں بے وقوف نہیں بنا سکتے..

گھاس پر خنکی اترنے لگی..

آس پاس کھیتوں میں ہریاول سیاہ ہونے لگی.. کہیں کہیں جنگلی پھول سر اٹھاتے تھے.. پتھر بھی سرد ہونے لگے..

جس گھاس پر ہم بہت دیر سے بیٹھے تھے.. پتھر ڈرامہ دیکھنے کے بعد آ بیٹھے تھے.. اور ندی کے پار بلندی پر ان کالاش بستیوں کو دیکھتے تھے جو بمبوریت روڈ سے نظر نہیں آتی تھیں.. یہاں سے وہ پورے منظر کا ایک دل کش اور شام میں گم ہوتا حصہ تھیں.. تو اس گھاس میں خنکی اترنے لگی... اور جب گھاس سرد ہونے لگتی ہے تو بہت سرد ہو جاتی ہے..

کالاش لڑکیاں جو بھیڑوں کو ندی کے کنارے چرا رہی تھیں.. وہ سیاہ پوش لڑکیاں اپنے ریوڑ ہانک کر کب کی اوپر اپنے گاؤں تک جا چکی تھیں.. اور ہم پانچوں بہت دیر سے.. جتنی دیر میں دھوپ میں زردی نمودار ہوتی ہے اور پھر وہ ضیائی ہو کر مدھم ہوتی ہے.. اس گھاس پر بیٹھے.. سیاحوں کی لاپروا آسودگی کے ساتھ کہ... نہ کوئی فون آ رہا ہے.. نہ کوئی اخبار ہے.. نہ شام کے کھانے میں کیا پک رہا ہے اور نہ ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے آنکھیں پھاڑے اس بے وقوفوں کے بوکس کو تک رہے ہیں.. نہ نو بجے کے خبرنامے میں وزیر اعظم اور دیگر حماقت آمیز سیاستدانوں کے بے مغز اور بے سروپا بیان اور آکتا دینے والے چہرے ہیں.. تو پھر کیا زندگی ہے.. ہم اس لاپروائی اور بے مثل آسودگی میں گھاس پر مخمور بیٹھے رہے.. جب گھاس سرد ہونے لگی..

جدھر ہمارا ریسٹ ہاؤس تھا.. شمال میں افغانستان کی جانب.. وہاں پہاڑی پر برف کا سفید سنگھار تھا.. اور جدھر سے ہم آئے تھے، چترال کی جانب سے.. ادھر برف کی چادر تھی.. اور کافرستان میں ایک شام.. اس کی تنہائی اور عقیدے کی پختگی میں ایک اور شام اتر رہی تھی..

ہم کچھ دیر اور بیٹھے رہتے تو ہمیں لکڑی کے پل پر سے گزرنے میں دقت ہوتی.. اتنی تاریکی ہو جاتی..

ہم سردی سے اکڑے ہوئے بدنوں کے ساتھ اٹھے.. پل کے پار گئے.. بازار میں اسلم اور غازی کہیں بکھرے ہوئے تھے، انہیں جمع کیا اور واپس ریسٹ ہاؤس کا سفر اختیار کیا..

بازار ختم ہوا.. چند ایک جو روشنیاں تھیں وہ پیچھے رہ گئیں اور جیپوں کی ہیڈ لائٹس بمبوریت روڈ کی واحد آرائش رہ گئیں..

دور رات کی تاریکی میں ایک مدھم سی روشنی جھول رہی تھی... عبدالخالق ایک لالٹین اٹھائے ہمارا انتظار کر رہا تھا..

"صاحب آپ نے بہت دیر کر دیا.." وہ ہماری جیپ کے قریب آیا۔ "آپ کو تو پورا وادی یاد کرتا ہے کہ اسلام آباد والا صاحب ادھر آیا ہے.. جس نے لوک ورثہ کے میلے میں ہمارا عزت کیا تھا.. تو رات کا کھانا آپ ادھر میرے کالاش ہوٹل میں کھائے گا.."

"نہیں خالق.." میں جیپ سے اترا نہیں کیونکہ غازی بیزاری کے عالم میں بار بار ایکسلریٹر کو دبا رہا تھا.. کہ چلیں، چلیں.. اور ہیڈ لائٹس اسی دباؤ کے حساب سے بار بار مدھم اور تیز ہوتی تھیں۔ "ریسٹ ہاؤس میں کھانا بول کر آیا ہے.. تیار ہو گا.. ادھار رہا.. کسی اور وقت سہی.. اور شکریہ!"

"ابو.. اس سے پوچھیں کہ کالاش کا رقص کب ہو گا؟" عینی نے سرگوشی کی۔

"رقص کب ہو گا خالق؟"

"وہ تو روزانہ ہوتا ہے صاحب.. باری باری.. کبھی ایک گاؤں میں، کبھی دوسرے گاؤں میں.. رقص تو نہیں ہوتا، ہم لوگ تو تھکاوٹ اتارتا ہے.. جیسے آپ لوگ دن بھر کے کام کاج کے بعد سیر کرتا ہے، ٹیلی ویژن دیکھتا ہے.. ایسے ہم لوگ اپنی تھکن اتارتا ہے.."

"تو کب ہو گا؟"

"باری باری ہوتا ہے ہر گاؤں میں.. ہر وادی میں.. آج تو بریر میں ہو رہا ہے.. کل رات انیش میں ہو گا.. پرسوں شام اپنے برون میں ہو گا.. ہم آپ کو اطلاع دے گا اور ساتھ لے کر جائے گا صاحب..."

"انکل کا فرانا ہے آپ لوگ پیسہ لے کر بھی پرفارمنس کرتا ہے؟" سمیر نے اپنی جنرل نالج میں اضافے کے لیے دریافت کیا..

"جی سر.. ایسا تو ہو گا.. اپنی من مرضی سے من کی موج میں اگر ناچتا ہے تو اس کا تو کوئی پیسہ نہیں ہوتا.. لیکن ٹورسٹ کا فرمائش ہو گا تو ڈھول والا پیسہ مانگے گا.. بنسری بجانے والا کا پیسہ دو.. عورت لوگ جو سنگھار کرتا ہے.. اچھا اچھا لباس پہنتا ہے تو اس کا

پیسہ تو ہوتا ہے.. ہم آپ کو پرسوں اطلاع کرے گا صاحب.. برون کے ڈانس کے لیے.."

غازی کے لیے یہ گفتگو کوئی معنی نہ رکھتی تھی.. اس نے جیپ کو ذرا حرکت دی تو خالق لالٹین میرے چہرے کے برابر لا کر کہنے لگا "صاحب، آپ ٹورسٹ موسم میں آیا ہے.. اچھے موسم میں نہیں آیا.. آپ کو تو ادھر موسم بہار کے جشن، چلم جوش کے ٹیم آنا چاہیے تھا.."

"چلم جوش؟"

"ہاں صاحب.. جب سردی ٹوٹتی ہے.. برفیں پگھلتی ہیں.. فصل پھوٹتی ہے.. ندی میں اتنا پانی اترتا ہے کہ اس کا پیٹ پھولتا ہے جیسے اسے بچہ ہونے والا ہو.. اور موسم ایسے بدلتا ہے کہ ہم لوگ برف کی راتوں اور دنوں سے تنگ آ چکے ہوتے ہیں.. اپنے گھروں کے اندر آگ پر جھکے، اس کی کالک سے سیاہ ہو چکے ہوتے ہیں.. رُت بدلتی ہے.. ہم باہر آتے ہیں تو اخروٹ کے درختوں میں نئے پتے پھوٹتے ہیں.. تب ادھر چلم جوش کا فیسٹیول ہوتا ہے.. ہم بہار کے گیت گاتے.. انگور کی بیلوں سے گچھے اتارتے یہ تہوار مناتے ہیں.. آپ کو تب آنا چاہیے تھا.."

ہم اگست کے دنوں میں یہاں تھے.. اور چلم جوش کا تہوار مئی کے مہینے میں ہوتا تھا.. جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا.. وادی کالاش ایک ٹائم ٹنل ہے.. وقت کی ایک غار ہے.. جس میں آپ داخل ہوتے ہیں تو پچھلے زمانوں میں چلے جاتے ہیں.. اگر ہم پچھلے زمانوں میں جا سکتے ہیں تو ظاہر ہے اس وقت کی غار میں سفر کرتے ہوئے اگلے زمانوں تک بھی تو جا سکتے ہیں.. جو آج نہیں.. آنے والے کل میں ہے، اسے بھی تو دیکھ سکتے ہیں..

تو اس لمحے جب غازی اپنی جیپ کو حرکت دینے کو ہے.. خالق کی لالٹین میرے خدوخال کو روشن کر رہی ہے.. ہم اگلے زمانوں میں چلتے ہیں..

میں نے انہی اگلے زمانوں میں وادی بمبوریت کا ایک اور سفر کیا تھا..

آج.. اس اگست کے مہینے سے کئی برس بعد..

آج سے کئی برس بعد.. مئی کے مہینے

میں جشن چلم جوش کے جوش و جنوں میں شامل ہوا تھا..

"اگلے زمانوں میں"

"ڈرامہ سیریل "کالاش" اور ہیروئن کا بغل بچہ"

کراچی سے میرے ڈرامہ سیریل "کالاش" کے پروڈیوسر نور علی کا ایک ایمرجنسی فون آگیا .. "تارڑ صاحب ہمارا سوفٹ ویئر کا سب پروگرام گڑبڑ ہو رہا ہے.. ہم نے آپ کے کہنے پر ایک ایک مختلف تھیم کے سیریل پر بہت انوسٹمنٹ کیا ہے لیکن.. ہمارا پورا یونٹ شوٹنگ کے لیے اس وقت چترال میں بیٹھا ہے.. تقریباً بیس ممبر ہے.. ایکٹرز اور تکنیکی عملہ سمیت اور ادھر سالا پرابلم پڑ گیا ہے.. مُلّا لوگ نے کالاش جانے والا روڈ بلاک کر دیا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ کافرستان میں کوئی چلم جوش کا فیسٹیول ہے اور ادھر مسلمان لوگ جا کر شراب پیتا ہے.. تو انہوں نے مُلّا لوگ نے روڈ بلاک کر دیا ہے.. چترال کے قلعے میں بھی شوٹنگ کی اجازت نہیں مل رہی.. ہمارا ٹیم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے اور روزانہ پچاس ہزار کا خرچہ پڑ رہا ہے.. بابا آپ کچھ کرو.. ادھر سے قاضی واجد لاہور آ رہا ہے.. اگر آپ اس کو لے کر چترال پہنچ جاؤ تو کچھ ہو سکتا ہے.. ورنہ ہمارا لاکھوں روپیہ ڈوبتا ہے تارڑ بھائی.."

نور علی بھائی درست کہتا تھا..

وہ ایک کھلے دل کا نہایت خوشگوار اور دوست شخص تھا.. اور میں نے ہی اسے پنگا دیا تھا کہ نور بھائی ٹیلی ویژن پر مار دھاڑ اور تشدد سے بھرپور ڈرامہ سیریل تو چلتے ہی رہتے ہیں.. ایک محبت کی کہانی بناتے ہیں جو وادی کافرستان کے پس منظر میں ہو.. ذرا مختلف کام کرتے ہیں..

چنانچہ میں آمادۂ سفر ہوا..

تو اگر ہم پچھلے زمانوں میں جا سکتے ہیں تو اگلے وقتوں میں بھی سفر کر سکتے

ہیں.. خالق جس چلم جوش جشن کی بات کرتا تھا، میں اس میں شریک ہوا تھا.. ذرا میرے ساتھ سفر کیجیے.. ہم آئندہ زمانوں میں چلتے ہیں.. آئیے!

"آپ کو تکلیف کیا ہے تارڑ صاحب.. "کراچی ٹیلی ویژن کے اداکار قاضی واجد نہایت دل آزار لہجے میں مجھ سے پوچھتے ہیں..

"مجھے... مجھے تو کوئی تکلیف نہیں۔"

"نہیں.. بہر صورت ہے.. بھئی آپ بھی دیگر ڈرامہ نگاروں کی طرح سیدھا سیدھا کوئی ڈرامہ لکھتے.. دو چار وڈیرے ڈالتے.. درجن بھر بندوقیں چلاتے یا کوئی ٹڈی گڈی ڈرامہ بناتے جس میں چند حسین و جمیل لڑکیاں ادھر ادھر کندھے مارتی پھرتیں.. واللہ لوگ بھی خوش ہوتے اور بزنس بھی اچھا مل جاتا.. اب یہ چترال کے بیک گراؤنڈ میں ڈرامہ لکھنے کی کیا تُک ہے؟ ویسے یہ چترال ہے کہاں؟"

"ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم انشاءاللہ چترال میں ہوں گے قاضی بھائی.."

ہم پشاور ایئرپورٹ پر چترال جانے والے پنکھا جہاز یعنی فوکر فرینڈشپ میں سیٹ بیلٹس باندھے بیٹھے تھے.. اور ہم سیٹ بیلٹس باندھے بیٹھے ہی رہے.. کہ ہر آدھ گھنٹے بعد اعلان ہوتا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے ہم درّہ لواری کے پار نہیں جا سکتے.. فی الحال انتظار فرمایئے..

بالآخر ہمیں جواب دے دیا گیا کہ درّہ لواری کی مرضی نہیں کہ اس کے اوپر سے آپ کا جہاز گزرے.. براہ کرم اتر جایئے اور کل صبح پھر قسمت آزمایئے..

"اب کیا کریں گے؟" قاضی واجد پریشان ہو گئے "اگر کل بھی یوں بے عزت ہو کر نکالے گئے تو کیا کریں گے.."

"ہم کل کا انتظار ہی نہیں کریں گے اے کراچی کے قاضی.. یہاں سے دیر کے لیے ٹیکسی لیں گے.. تخت بائی میں دنیا کی بہترین چپل کباب کھائیں گے۔ درّہ مالاکنڈ عبور کر کے سوات میں اتریں گے.. پھر تیمرگرہ کے راستے سیدھا دیر شہر.."

"یعنی دیر آید درست آید.." قاضی خوش ہو گیا "یہ دیر چترال میں ہے ناں"

"نہیں ناں" میں نے سر ہلایا "یہ دیر ریاست ہے اور اس کے بعد ہمیں ٹیکسی

چھوڑ کر برف پوش درہ لواری کراس کرنا ہوگا.. پھر ہم دریائے چترال کے کناروں پر سفر کرتے ہوئے بالآخر چترال شہر پہنچیں گے۔"

"یہ درہ لواری جو ہے خطرناک تو نہیں ہے؟"

"نہیں.. بس کبھی کبھار کوئی چیتا وغیرہ نکل آتا ہے وہ بھی اُس صورت میں جب بھیڑیئے نہ ہوں.. کوئی برفانی تودہ بھی گر سکتا ہے اور ان دنوں لواری کو صرف دن کی روشنی میں عبور کرنے کی اجازت ہے کیونکہ رات کے وقت وہاں ڈاکو راج ہوتا ہے.."

"آپ نے ضرور لکھنا تھا اس قسم کا ہولناک ڈرامہ جس کی لوکیشن تک پہنچنے کے لیے چیتوں اور بھیڑیوں اور ڈاکوؤں سے ملاقات کا خدشہ ہو.." قاضی ذرا اداکاری کرتے ہوئے لرزہ براندام ہوئے "میاں ہم تو کل جہاز پر جائیں گے، نہیں جائیں گے تو واپس کراچی جائیں گے"

"یہ تو میں یونہی آپ کے ساتھ مسخری کر رہا تھا.. آیئے ٹیکسی میں تو بیٹھیے ہم دوپہر تک چترال میں ہوں گے.. آیئے آجایئے"

"اور وہ درہ لواری؟"

"ہم کسی اور راستے سے نکل جائیں گے.. آجایئے"

"سچ کہتے ہیں؟"

"نہیں.."

"تو پھر چلیے.."

چترال شہر سویا ہوا تھا..

صرف پی ٹی ڈی سی موٹل کا ڈائننگ روم جاگتا تھا.. جس میں ڈرامے کے ہدایت کار بختیار احمد ایک طویل کھانے کی میز کے گرد بیٹھے.. اونگھتے.. جمائیاں لیتے.. کیمرہ مینوں اور اداکاروں.. اور اداکاراؤں کے جمگھٹ کو کوئی گانا سنا رہے تھے اور انہیں تسلی دے رہے تھے کہ دُکھ کے یہ دن ختم ہونے کو ہیں اور وہ شخص آنے کو ہے جس نے یہ واہیات ڈرامہ لکھا ہے اور اب وہ خود ہی مولوی حضرات سے گفت و شنید کرے گا کہ برادرانِ اسلام ہمیں کافرستان جانے دیں، ہم وہاں شوٹنگ کرنے جا رہے ہیں، ڈرنک ہونے نہیں جا رہے کہ ہمیں اس قسم کی خباثت آمیز سہولتیں کراچی اور لاہور

میں نہایت آسانی سے میسر ہیں.. اور چترال قلعے میں بھی شوٹنگ کا پروانہ وہی حاصل کرے گا..

میں اور قاضی واجد جب لواری ٹاپ کے ڈاکوؤں، شیروں اور بھیڑیوں کی دہشت کے ہمراہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تو کم از مجھے نہایت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا..

لیکن ہم باہر کی دنیا سے آنے والے آخری مہمان نہ تھے..

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب ہم خوابیدہ ہونے کی خواہش میں اٹھنے کو تھے.. ڈرامے کی ہیروئن مس خان کا نزول ہوا..

مس خان کے ہمراہ ان کا ایک "بغل بچہ" تھا..

اس قسم کے بغل بچے اکثر ہیروئنوں کے ہمراہ ہوا کرتے ہیں.. اور ہیروئنوں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں.. یہ وہ طوطے ہوتے ہیں جن میں ہیروئن کی جان ہوتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جن میں ان کا مال ہوتا ہے..

یہ کوئی شیخ صاحب تھے.. جنہوں نے غالباً کسی الف بے کے قاعدے کا بھی منہ تک نہ دیکھا تھا.. اپنا منہ بھی نہ دیکھا تھا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے کسی خاص فضل کے تحت کوئی ایک شے بھی نہ تھی جو دیکھنے کے لائق تھی.. اور اس سونے پر سہاگہ یہ تھا کہ موصوف قد کے معاملے میں نکلتے نکلتے رہ گئے تھے اور بہت ہی رہ گئے تھے.. چنانچہ جب اپنی گوری چٹی لمبی تڑنگی مس خان کے ہمراہ ہوتے تھے تو اس کی بغل سے بھی کہیں نیچے اختتام پذیر ہو جاتے تھے، اس لیے اتنے بھی بغل بچے نہ تھے..

چترال کی رات میں.. موٹل کے ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہی یہ شیخ صاحب سراپا احتجاج ہو گئے.. "بھاجی.. ادھر کون انچارج ہے؟"

بختیار احمد نے میری طرف دیکھا اور میں نے ان کی طرف..

"جی فرمایئے۔" بختیار نے نہایت سرد مہری سے کہا۔

"بھاجی، آپ شاہ نور سٹوڈیو میں شوٹنگ نہیں کر سکتے تھے؟.. ہم جی لاہور سے پشور آئے.. ادھر سے فلیٹ نہیں ملی.. پھر جیپ کرائی.. بہت تکلیف ہوئی ہم دونوں کو.. میرا خیال تھا کہ شوٹنگ کاغان میں ہے.. پر یہ چترال میں ہے.." وہ اپنے غضب کا ہم

پر اظہار کرنے کے بعد ہیروئن پر ریشہ خطمی ہوئے۔ "جان جی.. پیاری جی.. چلیں اپنے کمرے میں.."

جان جی.. کے لبوں پر جو مسکراہٹ آئی، وہ صرف شیخ جی کی ان فیکٹریوں کی وجہ سے تھی جن کے گھمنڈ میں.. انہوں نے ماہانہ بنیاد پر جان جی کو ہائر کیا تھا.. لیکن اس مسکراہٹ میں سے بے بسی اور بے چارگی بار بار جھلکتی تھی.. جان جی کی بھی آنکھیں اور خوبصورت آنکھیں تھیں اور وہ بھی دیکھ سکتی تھیں کہ شیخ جی میں دیکھنے کو کچھ نہیں، اس کے باوجود تن تندور بھرنے کے لیے روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر.. تندور یہ تو نہیں دیکھتا کہ اسے گرم کرنے کے لیے.. اس میں روٹی پکانے کے لیے اس کے اندر کیسا کیسا جھاڑ جھنکار پھونکا جارہا ہے.. گلاب کی کلیاں مہک آور ہوں تو ہوں لیکن.. اس تندور کو تو گرم نہیں کر سکتیں جو جان جی کا تھا.. جو ہم سب کا ہے.. اسے بھرنے کے لیے روٹی کے لیے ہم سب کو مفاہمتیں کرنی پڑتی ہیں.. لیکن جان جی نے کچھ زیادہ ہی مفاہمت کرلی تھی.. کھانے کے بعد جان جی اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوئیں اور ان کے پیچھے پیچھے شیخ جی پھدکتے ہوئے..

اس موقع پر قاضی جی نے اپنا فیورٹ شعر سنا کر اس شب چترال کا اختتام کیا کہ..

تھی حیا مانع فقط بند قبا کھلنے تک..
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا.. ایسا کھلا..

جان جی بھی بس ایسے ہی کھلی ہوں گی..

"اگلے زمانوں میں"

"ایک بہاریہ اور خماریہ شب جس میں خمار نہ تھا"

دو روز بعد چترال کے قلعے میں ڈرامہ سیریل "کالاش" کی شوٹنگ ہو رہی تھی.. پرنس اسد چترال میں نہیں تھے اور ان کی غیر موجودگی میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ان کے ملازم ایک ڈرامے میں ملوث کیمروں، تکنیکی مشینوں اور اداکاروں کی بے بہا اور بے ترتیب اور لاپرواابتری کو قلعے میں داخل ہونے دیتے.. میں نے اسلام آباد میں مقیم اس پیچی پرنس کے ساتھ رابطہ کیا اور انہوں نے شوٹنگ کی اجازت دے دی..

تو شوٹنگ جاری تھی.. اور میں خیال رکھ رہا تھا کہ شاہانہ ڈائننگ روم کے فرنیچر، قدیم کراکری، تصویروں اور قالینوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے..

جان جی یا مس خان ایک کالاش کافر لڑکی کے روپ میں لباس میں کیمرے کے سامنے تھیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ وہ سپرب تھی.. وہ ایک ایسی لڑکی لگتی ہی نہ تھی جو کسی بھی شیخ جی کی فیکٹریوں کے دام میں.. مجبوراً ہی سہی.. پھنس سکتی ہو.. وہ ایک نادان اور معصوم کافر لڑکی تھی اور زبردست اداکاری کر رہی تھی..

کیا ایک معصوم اور بھولا بھالا اور نادان شخص اداکاری کر سکتا ہے..

ٹیلی ویژن کا کوئی ایک ڈرامہ تھا.. کاسٹ میں ایک فراخ دہن فراخ بدن لڑکی بھی شامل تھی جو قیس کی طرح ہر پردے کے پیچھے ہر لباس میں عریاں ہی لگتی تھی... مبینہ طور پر اس کی والدہ ماجدہ یا شاید بڑی آپا اس کے ساتھ ساتھ تھیں اور اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں اور ہر جانب یہ سورج کی طرح روشن ہوتا تھا کہ ان کا تعلق اس محلے سے تھا..

اس کے لب تو اچھے تھے لیکن لب ولہجہ بہت برا تھا..

میں نے دل ہی دل میں ہدایت کار یاور حیات کی عقل پر ماتم کیا جس نے اس اناڑی لڑکی کو ڈرامے میں کاسٹ کیا تھا..

پھر ایک منظر میں جب وہ میرے سامنے آئی تو اس کے لب و لہجے میں تو کوئی بہتری نہ ہوئی لیکن جب وہ روئی تو گلیسرین کی مدد کے بغیر روئی.. اور اتنا روئی کہ سیٹ پر موجود سب لوگ ڈائیلاگ کی ناقص ڈلیوری کو بھول گئے کہ جو وہ لفظوں کے راستے ادا نہ کر سکی تھی، اس نے چہرے کے کرب اور بھیگی آنکھوں سے ادا کر دیا..

اور پھر یاور حیات نے میری حیرانی دیکھ کر کہا۔ "تارڑ جی.. یہ لوگ جو اس محلے سے آتے ہیں.. زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے لیکن.. یہ تجربے میں ہم سے بڑھ کر ہوتے ہیں.. ہم کیا جانیں کہ ان پر کیا کیا گزرتی ہے.. تو یہ آنسو وہ سارے غم تھے.. ساری مجبوریاں تھیں جو اس کی مختصر زندگی میں اسے سہنی پڑیں.. اور اسی لیے یہ آنسو تچل تھے.. یہ کسی پڑھی لکھی.. ماڈرن لڑکی کی آنکھوں میں نہیں آسکتے تھے۔"

جان جی بھی اپنی مجبوریوں کو زبان دے رہی تھی..

اپنی بے بسی کا اظہار کر رہی تھی..

اور زندگی نے اسے جو کچھ دیا تھا، اس کو لوٹا رہی تھی اور زبردست اداکاری کر رہی تھی..

میں مدتوں بعد اس قلعے میں واپس آیا تھا.. اس کی کچی چار دیواری کے اندر میں نے اپنے خاندان کے ہمراہ چند راتیں بسر کی تھیں.. ان راتوں میں مجھے اس کے در و دیوار پر ہیملٹ کے باپ کی فریاد کرتی روح کی پرچھائیاں نظر آتی تھیں.. اور یہیں پر اس ڈرامے کے خیال نے میرے ذہن کی کھڈی پر اپنا تانا بانا بُننا شروع کیا تھا..

شام ہوئی تو دریائے چترال کے شور کے باوجود قلعے کے بام و در سے جیپوں کے انجنوں کی آوازیں ٹکرائیں اور ہم تک پہنچیں..

خدام قلعے کے صحن کی جانب دوڑے..

"کون ہے؟" میں نے ایک سرپٹ بھاگتے ملازم کو روک کر پوچھا..

"اے سی صاحب آئے ہیں.. ایس پی صاحب آئے ہیں۔" اس نے جیسے دو خداؤں کے نام لیے اور صحن کی جانب ہانپتا ہوا لپکتا ہوا چلا گیا..

بڑے شہروں میں آپ ڈپٹی کمشنر یا آئی جی کے وجود سے آگاہ بھی نہیں ہوتے.. وزیر بھی شناخت نہیں رکھتے لیکن.. چترال ایسی گم گشتہ وادی میں.. جیسا کہ میں نے کہا ہے وہ.. منی ایچر خداؤں سے کم نہیں ہوتے..

میں باہر گیا تو وہ جیپوں سے اترے..

اسسٹنٹ کمشنر صاحب.. ایک بلند قامت.. نہایت خوش شکل.. اگر پاکستان میں کاؤبوائے ہوتے تو ایسا کاؤبوائے.. تھے!.. ان کے لہجے سے ان کے علاقے کی پہچان نہ ہوتی تھی.. وہ پٹھان اور پنجابی کی کوئی مخلوط قسم تھے.. اور انگریزی میں رواں بہت تھے.. ایس پی صاحب.. پٹھان تھے.. بُوٹے سے قد کے تھے... اپنے رویے میں ملنسار اور ڈاؤن ٹو ارتھ تھے..

میں ان کی دعوت پر ان کی جیپ میں سوار ہو گیا..

اے سی صاحب میری موجودگی سے لاپروا تھے.. اگرچہ وہ خصوصی طور پر میرے لیے چترال کے قلعے میں آئے تھے لیکن اس کے باوجود لاپروا تھے.. یہ ان کی عمر تھی اور ان کا سٹائل تھا.. انہیں خدا نے حسن دیا تھا، اس لیے نزاکت آ ہی گئی تھی.. البتہ ایس پی صاحب جیسا کہ میں نے عرض کیا، ڈاؤن ٹو ارتھ تھے۔ "تارڑ صاحب ادھر چترال میں ہمیں بہت بھوک ہوتی ہے.. ہم لوگ بہت ترسے ہوئے ہوتے ہیں کہ باہر کی دنیا سے کوئی تو آئے.. آپ آئے ہیں تو رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں.."

چترال کی رات میں جیپ جانے کن بلندیوں، کن بازاروں میں سے گزرتی رہی.. اور وہ رات گئی رات تھی جب ہم اے سی صاحب کے گھر میں.. شیشے کی ایک وسیع کھڑکی کے سامنے بیٹھے.. باہر دیکھتے تھے.. اور باہر لان میں ایک چترالی باورچی گوشت کی سیخوں کو انگاروں پر پلٹتا تھا..

کمرے کے اندر مغربی کلاسیکی موسیقی کا بلند آہنگ ترنم گونجتا تھا جس میں وائلن کا سوز اور اداسی چترال کی رات میں میرے دل میں اداسی اور گھر سے دوری کا خوف بھرتا تھا.. اے سی صاحب اپنے کاؤبوائے بوٹ ایک میز پر جمائے لنڈن میں گزارے ہوئے شب و روز کا تذکرہ کرتے تھے.. ایک مست شب میں ایک سپورٹس کار کے حادثے کی داستان سناتے تھے.. ایس پی صاحب میں کوئی جذبہ تفاخر نہ تھا، وہ اپنے

ناٹ کے سکول اور مڈل کلاس پس منظر کو بیان کرتے تھے..

شیشے کی میز پر سرخ رنگ کے مشروب کا ایک جگ دھرا تھا..

یہ وہی مشروب تھا جو میں نے برسوں پیشتر قرطبہ کی ایک شام میں.. لبنانی ناڑلا کے ساتھ ایک اندلسی شام میں.. روح افزا کی رنگت کے دھوکے میں اور ناڑلا کے حسن کے دھوکے میں.. "کبالا روخو".. یعنی "سرخ گھوڑا" کے ریستوران کے صحن میں دو گھونٹ پیا تھا. جب کہ ہوا میں مسجد قرطبہ کے صحن نارنجستان کی نارنگیوں کی مہک تھی اور بعد میں کوئی ایک بند گلی تھی جس میں ناڑلا کے سانسوں کی لبنانی اور گرم مہک تھی..

چترال کی شب میں.. یہ سرخ مشروب اندلسی نہ تھا.. کالاشی تھا.. کافرستان سے آیا تھا..

لیکن اس شام چترال میں.. یادگار بہار یہ اور خمار یہ شب میں میں خمار میں نہ تھا.. اسی لیے میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں میرے وجود سے بے خبر ہیں.. انہوں نے مجھ سے کوئی کلام نہ کیا.. نہ میری تحریروں کے بارے میں.. نہ ٹیلی ویژن کے حوالے سے.. اور نہ ایک مہمان کی حیثیت میں.. وہ.. خاص طور پر اے سی صاحب.. اپنی باتیں کرتے رہے.. اور میری موجودگی سے غافل رہے..

اور میری سمجھ میں نہ آیا.. کہ اگر ایک کیڑا آپ کے سامنے رینگنے لگے تو آپ دلچسپی سے اسے دیکھنے لگتے ہیں... اس کے وجود سے غافل نہیں رہتے.. تو وہ مجھ سے.. ہم کلام کیوں نہیں ہوتے تھے.. انہوں نے مجھے مدعو کیا تھا اور پھر بھی وہ اپنی دنیا میں تھے.. اس دنیا سے باہر بیٹھے ہوئے ایک شخص سے غافل کیوں تھے..

باہر چترال کی رات میں سلگتے کوئلوں پر پہلو بدلتے گوشت کی خوشبو....

مغربی کلاسیکی موسیقی کی گونج..

اس لمحے میرا جی چاہا کہ میں جان جی کا جی ہوتا.. شیخ جی اس کا جی نہ ہوتے.

کراچی کے ایک بڑے ہوٹل میں جب ڈرامہ سیریل "کالاش" کی لانچنگ ہوئی تو قاضی واجد نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ چترال میں ہم جس اے سی صاحب کو ملے تھے، وہ عائشہ کا بیٹا ہے؟"

"کون سی عائشہ کا؟"

"بھئی خالدہ ریاست کی بڑی بہن نہیں.. عائشہ.. ان کا."

عائشہ ان دنوں لاہور میں تھیں.. اور ان کی مست آنکھوں کی بہت دھوم تھی.. نہایت باوقار اور کلاسیکی..

میری ایکٹنگ کے بہترین زمانوں میں جو ایک بہترین ڈرامہ "نواب سراج الدولہ" تھا.. اس میں انہوں نے میری.. یعنی سراج الدولہ کی بیوی کا کردار ادا کیا تھا.. میں نہایت جھینپو اور شرمیلا سا تھا.. اداکار ہونے کے باوجود.. ڈرامے کی ریہرسل ہوتی اور میں سر جھکائے اپنے مکالمے پڑھتا اور ہدایت کار کے کمرے سے باہر آجاتا.

ایک روز میں حسب معمول سر جھکائے باہر آیا تو عائشہ میرے پیچھے پیچھے آگئیں اور میرا کندھا پکڑ کر کہنے لگی "ڈیم اٹ مستنصر.. تم میرے خاوند کا کردار ادا کر رہے ہو اور تم مجھ سے بولتے تک نہیں.. مجھ سے بات کرو."

"کیا بات کروں؟"

"کوئی بات کرو..."

وہ مجھے شملہ پہاڑی کے عقب میں اپنے گھر لے گئیں.. خالدہ ریاست بھی وہاں کسی کام میں الجھی ہوئی تھیں.. اپنے اہل خانہ سے ملوایا..

"نواب سراج الدولہ" اب بھی ٹیلی ویژن کے دو چار نمائندہ کھیلوں میں شمار ہوتا ہے. اس لیے بھی کہ عائشہ کا کردار بے حد طاقتور تھا.

اے سی صاحب نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ عائشہ کے بیٹے ہیں.. مجھے افسوس ہوا.. میں اب بھی ان کی از حد تعظیم کرتا ہوں..

وہ میرے لیے ایک یادگار شب تھی..

ان دونوں کی بے رخی کے باوجود ایک یادگار شب تھی..

اگرچہ مجھے بے رخی کی عادت نہیں..

"اگلے زمانوں میں"

"شیخ جی اور جان جی.. گندی عورت اور قلی"

اور اگلے روز ایک سکینڈل ہو گیا.. ایک عجیب و قوعہ ہو گیا.. ایک ایسا سانحہ ہو گیا کہ ڈرامہ سیریل "کالاش" کی پوری عمارت اور سیٹھ نور علی کے لاکھوں روپے کے منہدم ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا..

اس روز میں ڈرامے کی پوری کاسٹ کو مخدوش سوزوکی پک اپس میں پیک کر کے کوغزی لے گیا.. وہاں سب نے ایک برفانی اور پر شور ندی کے کنارے ایک زبردست پکنک منائی.. کوغزی کی مسجدیں دیکھیں اور شام سے واپس چترال لوٹے..

چترال لوٹے تو.. ہمیں بہ زبانی بختیار احمد خبر ہوئی کہ ایک سانحہ ہو گیا ہے..

ڈرامہ سیریل کی ہیروئن مس خان واک آؤٹ کر رہی ہے..

کل صبح واپس جا رہی ہے اور اپنے تمام عزیز و اقارب اور پیروں اور ولیوں اور انواع و اقسام کی مقدس ہستیوں کی قسمیں کھا چکی ہے کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس جا رہی ہے.. اور جو کوئی بھی اس کے ساتھ مذاکرات کرتا ہے، وہ اس پر پھنکارتی ہے اور تھکتی ہے اور جوتی اٹھا لیتی ہے..

اس صورتِ حال کو آسانی سے تشویشناک کہا جا سکتا تھا..

معلوم ہوا کہ کل وہ شوٹنگ کے لیے چترال کے قلعے میں جانے سے پیشتر شیخ جی کو ہدایت کر گئی تھی کہ جان جی تم دوپہر کا کھانا پیک کروا کے وہاں لے آنا.. دونوں جی اکٹھے کھائیں گے.. شیخ جی شاید بھول گئے..

اب اس آفت منظر کا منظر نامہ کچھ یوں بنتا ہے کہ شیخ جی موٹل کے لان میں پھولوں کی قربت میں ایک آرام کرسی پر ریلیکس کر رہے ہیں اور کوئی انگریزی اخبار

تصویریں دیکھ کر الٹا نہیں سیدھا پکڑ رکھا ہے.. موٹل کے گیٹ سے ایک جیپ داخل ہوتی ہے.. اس میں سے مس خان عرف جان جی برآمد ہوتی ہے.. ایک کالاش لڑکی کے لباس میں اور میک اپ میں اور نہایت دیدہ زیب لگ رہی ہے.. وہ ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتی ہے، لان میں ریلیکس کرتے شیخ جی کو سپاٹ کرتی ہے اور پھر ایک شیرنی کی طرح چنگھاڑتی ہوئی لان کی باڑ کو پھلانگتی ہے.. شیخ جی اسے اپنی طرف چارج کرتے ہوئے دیکھ کر اٹھتے ہیں اور جب وہ اٹھتے ہیں تو ان کے بیٹھنے اور اٹھنے کا فرق واضح نہیں ہوتا..

مس خان ان کے قریب پہنچ کر انہیں ایک پورے جوش اور قوت والا اور نہایت پورا بازو گھما کر لینڈ کرنے والا زناٹے دار تھپڑ رسید کرتی ہیں.. اور پھر ان کی ماؤں، بہنوں اور سینکڑوں برس قدیم معزز بزرگوں کے حلال اور حرام ہونے کے ایسے نقشے باندھتی ہیں کہ سننے والوں کے کان سرخ ہو جاتے ہیں..

اور انہیں شکایت صرف اتنی تھی کہ شیخ جی لنچ پیک کروا کے قلعے کیوں نہیں پہنچے.. شیخ جی اس تھپڑ کی عنایت خسروانہ سے شاید لڑکھڑائے.. شاید نزدیکی کیاری میں اوندھے منہ گرے، اس کی تفصیل مجھے یاد نہیں.. صرف یہ یاد ہے کہ اس تھپڑ کی آواز نے پوری وادیٔ چترال میں ایک گونج سی پیدا کی جو ترچ میر کی چوٹی تک گئی اور اس کی برفوں کو بے آرام کیا.. بہر حال شیخ جی اس پھنکارتی ہوئی شیرنی کی منت سماجت کرتے اس اپنے کمرے میں لے گئے.. دروازہ بند کر لینے کے باوجود اس کی دھاڑ ہم تک پہنچتی تھی.. جیسے چڑیا گھر میں شیر دھاڑتا ہے تو اس کی آواز باغ جناح میں سیر کرنے والوں تک پہنچتی ہے اور انہیں خوفزدہ کرتی ہے..

"آپ ہی کچھ کریں تارڑ صاحب.." بختیار احمد نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "بی بی اگر واک آؤٹ کرتی ہے تو نور علی کی دولت اور میری اور آپ کی محنت ڈوب جاتی ہے۔"

میں نے دروازے پر دستک کی.. کسی نے کہا "کون ہے اوئے؟"

میں نے اپنا نام بتا کر اجازت چاہی..

اور جب اس کمرے میں داخل ہوا تو گویا شیر بلکہ شیرنی کے پنجرے میں داخل ہوا.. اس کمرے میں جو کچھ کہا گیا... جو کچھ سنا گیا.. اس پر ایک ناول لکھا جا سکتا ہے لیکن

اس کی سمری بنانی ہو تو کچھ یوں ہے کہ میں نے نہایت انکساری سے اور گھگھیا کر مس خان سے کہا۔ "دیکھئے آپ واک آؤٹ نہ کیجئے۔۔ سینکڑوں لوگوں کا روزگار اس ڈرامہ سیریل سے وابستہ ہے۔۔ میں منت کرتا ہوں، میں سماجت کرتا ہوں۔۔ جو کچھ آپ کہیں گی، میں کرتا ہوں یعنی اس عمر میں جو کچھ کر سکتا ہوں۔۔ آپ کی نوازش ہو گی۔" مس خان پلنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی دھاڑتی ہیں۔ "تارڑ صاحب۔۔ مسئلہ صرف یہ نہیں کہ یعنی۔۔ شیخ میرا لنچ لے کر قلعے کیوں نہیں آیا۔۔ آپ جانتے ہیں کہ اس نے مجھ پر کیا کیا الزام لگائے ہیں۔۔ ٹھیک ہے میں ایک گندی عورت ہوں۔۔ اور جو کچھ یہ مجھے دیتا ہے، اس رقم سے نوشہرے میں میرے گھر والے دال روٹی کھاتے ہیں۔۔ یہ رقم نہ دے تو وہ بھوکے مر جائیں۔۔ میری بہنیں گلیوں میں آ جائیں۔۔ گلی میں اگر ایک بہن آ گئی ہے تو دوسری کیوں آئیں۔۔ آپ جانتے ہیں کہ اس نے کیا کہا ہے؟۔۔"

"کیا کہا ہے میڈم؟"

"یہ دلال کا بچہ کہتا ہے کہ تم تارڑ کے ساتھ ہنس کر بات کیوں کرتی ہو۔۔ کوئی بات ہے۔۔ اور یہ جو اے سی صاحب اور ایس پی صاحب اس کے واقف ہیں، یہ ان کے ساتھ تمہارا سودا کر رہا ہے۔" یہ ایک عجیب اعزاز تھا جو زندگی میں پہلی بار مجھے نصیب ہو رہا تھا۔۔

"کیوں شیخ صاحب——"

شیخ صاحب ایک ناتواں مرغی کے ہاتھوں بے عزت ہونے والے اصیل مرغ کی طرح سینہ پھلائے اپنی شرمندگی کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔۔ انہوں نے کرسی سے اٹھ کر اس منحنی سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "لو جی ہم بھی کوئی قلی نہیں ہیں۔۔"

"سر میں نے تو قطعی طور پر یہ نہیں کہا کہ آپ قلی ہیں۔۔ قلی تو ریلوے سٹیشنوں پر ہوتے ہیں۔"

"نہیں آپ سمجھتے ہو کہ ہم قلی ہیں۔۔ ہم باعزت لوگ ہیں۔۔ آپ تارڑ صاحب ہوں گے۔۔ وہ اے سی صاحب ہوں گے۔۔ ایس پی صاحب ہوں گے۔۔ لیکن ہم بھی قلی نہیں۔"

"جناب عالی میں نے کب کہا ہے کہ آپ قلی ہیں۔۔ لیکن یہ آپ کس قسم

کے الزامات لگا رہے ہیں۔۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس قسم کا تاجر نہیں ہوں کہ سودے کراتا پھروں۔۔ آپ آپ جان جی کو سمجھائیں۔۔ یہ اگر واک آؤٹ کرتی ہیں تو ہمارے ڈرامے کا جہاز ڈوب جاتا ہے۔۔ پلیز۔۔"

جان جی سامان باندھے بیٹھی تھی۔۔

"دیکھئے مس خان۔۔ ہم نے تو آپ کو کچھ نہیں کہا۔۔"

"لیکن اس شیخ کے بچے نے کہا ہے۔۔ اس نے کہا ہے کہ میں رنڈی ہوں۔۔ ہر ایک کے ساتھ فلرٹ کرتی ہوں۔۔"

"پلیز یہ تو آپ کا اور ان کا معاملہ ہے۔۔ ہمارا تو کوئی قصور نہیں۔"

یہ معاملہ اگرچہ بہت گھمبیر تھا لیکن میں پلنگ پر بیٹھے مس خان کو ایک مختلف نظر سے دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ نظر اس کے ایک زرد ہوتے پک جانے والے انگور بدن کو ہوس سے دیکھتی تھی۔۔ پلنگ کے سپرنگوں کی لچک دیکھتی تھی اور کبھی اس کی بے بسی اور مجبوری دیکھتی تھی۔۔

نصف شب تک مذاکرات جاری رہے۔۔

"میں ایک گندی عورت ہوں تارڑ صاحب۔۔" وہ بار بار اقرار کرتی۔۔

"ہم بھی کوئی قلی نہیں——" شیخ جی بھی بار بار کہتے۔۔

"میں اپنی ماں کی نہیں جو کل صبح چترال سے چلی نہ جاؤں۔۔"

"ہم بھی کوئی قلی نہیں——"

میں نے۔۔ یونہی اے سی صاحب اور ایس پی صاحب سے اس سانحے کا تذکرہ کیا۔۔

"چترال میں آنا آسان ہے۔۔ باہر نکل جانا مشکل ہے۔" انہوں نے کہا۔ "دو راستے ہیں۔۔ ایک لواری ٹاپ۔۔ وہاں جو پولیس چوکی ہے، وہ مس خان کو گزرنے نہیں دے گی۔۔ شندور کی جانب بھی فون ہو جائے گا۔۔۔۔ باقی رہ گیا ایئرپورٹ۔۔ وہاں بھی سکیورٹی کے چیف خیال رکھیں گے۔۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔۔"

"چلیے وہ چترال سے باہر نہیں جا سکتی۔۔" میں نے ان سے کہا۔ "لیکن شوٹنگ میں حصہ لینے سے انکاری ہو جاتی ہیں تو پھر۔۔ اسے مجبور تو نہیں کیا جا سکتا۔"

"یہ جو مختصر سا کردار اس کے ہمراہ ہے شیخ جی۔۔ جو بسکٹ کھاتے ہوئے پہلے

آدھا بسکٹ اس کے منہ میں ڈالتا ہے اور پھر بقیہ حصہ کھاتے ہوئے کہتا ہے۔ "جان جی سواد آگیا ہے"۔۔ یہ شخص۔۔ جو اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہائش پذیر ہے تو کیا کوئی باقاعدہ نکاح وغیرہ ہو چکا ہے۔"

"میں اتنی تفصیل میں نہیں گیا۔"

"تو جناب۔۔ ایک قانونی مسئلہ ہو جائے گا۔۔ ایک کیس ہو جائے گا۔۔ حدود آرڈیننس وغیرہ کا۔۔ تو آپ ان کو سمجھا دیں۔۔ ورنہ وہ کل صبح۔۔ دونوں۔۔ چترال کی حوالات میں ہوں گے۔۔ اور یہیں قیام پذیر رہیں گے اگلے برس، دو برس۔۔"

تو میں نے ان دونوں کو سمجھا دیا۔۔

اور وہ سمجھ گئے۔۔

گندی عورت اور قلی۔۔ دونوں سمجھ گئے۔۔

"اگلے زمانوں میں"

"جشنِ چلم جوش"

دھوپ ابھی بلند چٹانوں پر بھی نہیں اُتری تھی۔۔

اگرچہ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ ابھی بلند چٹانوں پر بھی نہیں اُتری کیونکہ میں تو وادیٔ بمبوریت کے ٹورسٹ ان ہوٹل کے ایک گیلے سیلے کمرے کے اندر۔۔ ایک کمبل کے اندر منہ سر لپیٹے خوابیدہ تھا۔۔ اور کسی گہری دھت خاموشی میں نیند کی تاریکی میں۔۔۔۔ جیسے سٹیتھو سکوپ کے راستے کانوں میں دل کی دھک دھک اور دھم دھم سنائی دیتی ہے۔۔ ایک ڈھول کی آواز تھی یا کوئی خواب تھا جو دھڑکتا تھا۔۔

جیسے ایک عقیدت مند میلہ چراغاں کی جانب بڑھتا ہے۔۔ شاہ حسین کے میلے کو جاتا ہے اور بہت دور سے اسے رات کی تاریکی میں چراغ دکھائی دیتے ہیں، سائیں کے الاؤ نظر آتے ہیں اور ڈھول کی آواز اس تک پہنچتی ہے۔۔ ایسے کوئی ڈھول بج رہا تھا۔۔ میں نے کمبل کو اپنے بدن سے الگ کیا اور کمرے سے باہر آگیا۔۔

برآمدے میں جو انگور کی بیل ہری ہوتی تھی، اس پر بھی ابھی دھوپ نہیں اتری تھی۔۔

ہوٹل کے باغیچے میں رکھی آہنی کرسیوں کو اوس گیلا اور ٹھنڈا کرتی تھی۔۔

اور ڈھول کی آواز آرہی تھی۔۔

ہوٹل میں اس سے کہیں بہتر کمرے تھے لیکن میں نے اسے پسند کیا کیونکہ ایک تو یہ الگ تھلگ تھا اور پھر اس کے برآمدے پر انگور کی ایک بیل تھی جو لٹکتی تھی اور شہتیروں سے لپٹتی تھی۔۔ قاضی واجد نے بعد میں مجھے بہت مطعون کیا کہ صرف انگور کی ایک بیل کی خاطر تم نے ایسے گیلے سیلے کمرے کو پسند کر لیا۔۔

دھوپ بلند چٹانوں پر اترنے والی تھی.. ان چٹانوں کے عین نیچے برون کا گاؤں سمٹا ہوا تھا جو لان میں کھڑے ہونے سے دکھائی دیتا تھا.. اور گاؤں کی ہموار تہہ در تہہ چھتوں کے آگے جو کھلی جگہ تھی وہاں ایک کافر کالاش ڈھول بجا رہا تھا.. کالاش کی مخصوص اور متواتر دھن میں ڈھول بجا رہا تھا.. اس کی آواز فاصلے کی وجہ سے مجھ تک ذرا دیر بعد پہنچتی تھی.. وہ ڈھول پر ضرب لگاتا تو چند لمحوں بعد وہ سنائی دیتی..

میں ایک اوس بھری گیلی کرسی پر بیٹھ کر اوپر دیکھنے لگا..

پھر کالاش کے سیاہ چوغوں میں، سیپیوں اور رنگین پروں کی کلغی والی ٹوپیوں میں اور ہاروں موتیوں سے لدی پھندی پانچ لڑکیاں کہیں سے نمودار ہوئیں اور ڈھولی کے سامنے ایک قطار باندھ کر ناچنے لگیں..

کیا یہ منظر ناقابل یقین نہ تھا؟

ہوٹل کے مہمان ابھی نیند کی راحت میں گم تھے.. کوئی ویٹر کوئی کارکن ابھی آنکھیں ملتا ہوا ظاہر نہیں ہوا تھا..

تاریکی میں ابھی سفیدی گھل رہی تھی..

لان کی آہنی کرسیاں شبنم سے نچڑتی تھیں..

اور بلندی پر چٹانوں کے نیچے جو گاؤں تھا، وہاں ڈھول بج رہا تھا اور پانچ لڑکیاں رقص کر رہی تھیں..

وہ سیاحوں کو خوش کرنے کے لیے نہیں.. اپنے فن اور بدن کی داد چاہنے کے لیے نہیں، صرف اپنے لیے رقص کر رہی تھیں.. وہ نہیں جانتی تھیں کہ ڈھلوان کے نیچے بمبوریت روڈ کے کنارے جو ہوٹل ہے، اس کے لان میں اوس سے ٹھنڈی ہوتی ایک کرسی پر ایک شخص بیٹھا انہیں حیرت سے تک رہا ہے..

میرے دیکھتے دیکھتے دھوپ بلند چٹانوں پر اتر گئی..

جونہی دھوپ پھیلی.. ڈھول کی آواز پہلے سے مدھم ہوئی کہ اب کہیں کہیں وادی اور اس کے لوگ جاگتے تھے.. لیکن وہ پانچ لڑکیاں اپنے آپ میں مگن.. ڈھول کی تال پر کبھی جھکتی، کبھی گھومتی اور کبھی چیخیں مارتی ناچتی چلی جاتی تھیں..

دھوپ چٹانوں سے اتر کر نیچے ہوٹل ٹورسٹ ان کے اس کمرے تک آگئی

جس کے برآمدے میں انگور کی بیل ہری ہوتی تھی..

میں ناشتہ کر رہا تھا.. لیکن آہنی کرسی کے وجود سے ٹھنڈک اور اوس کی نمی رخصت ہو چکی تھی..

میں نے آج تک ایسا طلسم ہوش ربا ناشتہ نہیں کیا تھا کہ میں باسی ڈبل روٹی کو چائے کے ساتھ نگلنے کی کوشش کر رہا ہوں اور ہوٹل کی چھت سے پرے بلند چٹانوں کے سائے میں ایک کافر بستی میں صرف میرے لیے آمد بہار کا رنگا رنگ اور دل نشین رقص ہو رہا ہے..

پانچ کافر لڑکیاں صرف میرے لیے.. اگرچہ میری موجودگی سے بے خبر.. رقص کر رہی ہیں..

ہوٹل کے مالک اور نہایت دھیمے مزاج کے حاجی ابراہیم میرے برابر میں آبیٹھے..

"تارڑ صاحب.. آپ کی ٹیم تو ابھی سوئی ہوئی ہے.. آپ اتنی سویرے کیوں بیدار ہو گئے؟"

ہم پچھلے تین چار روز سے وادی بمبوریت میں تھے..

مس خان کی رخصتی موقوف ہو چکی تھی اور اطمینان سے ڈرامہ سیریل کی شوٹنگ جاری تھی.. کبھی ندی کے کنارے.. کبھی عبدالخالق کے ہوٹل کالاش کے وسیع لان میں اور کبھی قبرستان میں.. مجھے کوئی کام نہ تھا سوائے سکرپٹ میں معمولی ردوبدل کے اور اداکاروں کو تھوڑی بہت گائڈ لائن دینے کے.. بختیار انہیں ہانک کر لوکیشن پر لے جاتے اور میں اپنے سیلے کمرے میں اونگھتا رہتا اور کھڑکی میں سے انگور کی بیل کے منظر کو دیکھ کر خوش ہوتا رہتا..

اس دوران ایک مست سا منخنی اور نہایت بھلا سا کافر میرا دوست بن گیا.. وہ اپنی پوری زندگی میں ایک بار نیچے چترال گیا تھا اور وہاں اس نے صرف ایک بار ٹیلیویژن پر مجھے دیکھا تھا اور پہچان کر وہ مجھے عجیب عقیدت مندی سے ہمہ وقت تکتا رہتا تھا.. مجھے اس نے اپنے بہت سے راز بتائے۔ "شاحب.. ادھر ٹورسٹ لوگ آتا ہے تو شراب مانگتا ہے.. ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں مانگتا ہے.. اور وہ ہر وقت پیتا ہے اور

پی کر اودھم مچاتا ہے.. شراب تو شاحب ادھر ہم لوگ ہزاروں برس سے بناتا ہے اور فیسٹیول پر پیتا ہے.. دن رات تو نہیں پیتا.. تو ادھر کالوگ کافر لوگ بھی گڑبڑ کرتا ہے.. ٹورسٹ کو جو شراب سپلائی کرتا ہے، اس میں راکٹ ملا دیتا ہے.. ہم نہیں ملاتا شاحب.. شاحب آپ بہت اچھا آدمی ہے.. ہم نے تم کو ٹیلیویژن پر دیکھا ہے.. آپ ہم کو بولو کہ شراب لاؤ.. ہم اصلی انگور کا وہ شراب لائے گا جو ہمارا باپ پیتا ہے.. دادا صاحب پیتا ہے..‘‘

’’کتنا پیسہ لے گا؟‘‘ میں نے مسکرا کر پوچھا..

’’نہ نہ.. پیشہ نہیں لے گا.. صرف آپ ادھر ہوٹل والوں کو بولو کہ مجھے چکن کھلادو..‘‘

’’لیکن چکن تو کالاش لوگوں میں نجس ہے اور حرام ہے۔‘‘

’’اس لیے تو کہتا ہے صاحب.. کہ آپ مسلمان لوگ میں شراب حرام ہے لیکن آپ پیتا ہے..‘‘

’’میں تو نہیں پیتا۔‘‘ میں نے فوراً وضاحت کی—

’’آپ کا بہت بھائی پیتا ہے.. اور کافروں میں چکن حرام ہے لیکن ہم کھاتا ہے.. حساب برابر ہو گیا.. حرام شے کے بدلے میں حرام شے دو تو حساب برابر۔‘‘

اس نامعلوم کافر کے ہمراہ میں ایک شب اوپر برون کے گاؤں میں بھی گیا تھا.. کالاشی بے حد محبت کرنے والے لوگ ہیں..

ان کی لڑکیاں ان سے بھی زیادہ محبت کرنے والی اور آزاد منش روحیں ہیں.. ایک کافر گھر میں گئی رات ہونا اور نیچے وادی بمبوریت کو دیکھنا بھی ایک عجیب تجربہ تھا..

چنانچہ.. ہوٹل ٹورسٹ ان کی چھت کے اوپر گاؤں میں ڈھول بج رہا تھا اور پانچ کافر لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ جب حاجی ابراہیم میرے برابر میں آ بیٹھے اور پوچھنے لگے۔ ’’تارڑ صاحب، آپ کی میم تو ابھی سوئی ہوئی ہے.. آپ اتنی سویرے کیوں بیدار ہو گئے؟‘‘

’’یہ سویرے سویرے اوپر ڈھول کس خوشی میں بج رہا ہے؟.. انہوں نے جگا دیا۔‘‘

’’آج موسم بہار کے میلے چلم جوش کا آغاز ہو رہا ہے، اس لیے..‘‘

’’چلم جوش؟‘‘

’’کیا آپ صرف اس فیسٹیول کو دیکھنے کے لیے کافرستان نہیں آئے؟‘‘

’’نہیں حاجی صاحب..‘‘

’’تو پھر آپ خوش قسمت ہیں.. کالاش کی وادیوں میں یہ سب سے بڑا اور خوبصورت فیسٹیول ہے اور اسے دیکھنے کے لیے تو لوگ امریکہ اور یورپ سے آتے ہیں..‘‘

’’حاجی صاحب.. آپ چونکہ حاجی ہیں، اس لیے ہرگز کافر تو نہیں ہو سکتے.. تو پھر یہاں کیسے؟‘‘

’’میں تیس پینتیس برس پیشتر نیچے سے یہاں آیا تھا.. تب سے یہیں ہوں.. وادی خوبصورت ہے.. لوگ سادہ اور سچے ہیں..‘‘

’’حاجی ہو کر کفار کی تعریف کرتے ہیں..‘‘

’’ہاں.. ہم اگر سچ دیکھتے ہیں تو اس کی تعریف کرتے ہیں.. ایک زمانہ تھا کہ ہم سب.. مسلمان اور کافر ایک قبیلہ تھے.. یہ ہماری عیدوں میں شریک ہوتے تھے.. اور ہم ان کی رسموں اور قربانیوں میں شرکت کرتے تھے.. پھر ملا لوگ آ کر کہنے لگے کہ تم ان کی دعوتوں میں شامل ہوتے ہو جہاں ان بکروں اور بھیڑوں کا گوشت پکتا ہے جو بتوں پر قربان کیا جاتا ہے.. وہ حرام ہے.. کالاشیوں نے کہا کہ تم آؤ اور اپنے طریقے سے جانور قربان کرو.. لیکن.. وہ لوگ نہیں مانے.. کہنے لگے کہ جانور تو کافر ہے.. جو کھائے گا اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا.. تو اب ہمارا میل جول اتنا نہیں رہا..‘‘

’’حاجی صاحب.. اگر ان لوگوں کی بات مانیں تو پاکستان میں کسی کا بھی نکاح قائم نہیں رہ سکتا.. جدھر سے میں آیا ہوں ادھر کافر نہیں ہیں لیکن نکاح ہیں کہ مسلسل ٹوٹ رہے ہیں..‘‘

وہ پانچ لڑکیاں اب دھوپ میں تھیں اور مسلسل ناچ رہی تھیں..

ہم ایسے لوگوں کے نکاح اگر نہایت آسانی سے ٹوٹ سکتے تھے تو ان پانچ لڑکیوں کے نکاح.. اگر وہ شادی شدہ تھیں.. جانے کس پوزیشن میں تھے..

بہر حال چلم جوش کا آغاز ہو چکا تھا..

بمبوریت روڈ کے اوپر جتنے بھی کافر گاؤں تھے وہاں ڈھول بج رہے تھے..

ایک بہار یہ سرخوشی ہواؤں میں تیرتی تھی..

میں نے کیمرہ سنبھالا.. اپنے پیٹ پر سے کھسکتی ہوئی نیلی جین کو سنبھالا اور ڈھول کی صدا کو ایک بانگِ درا کی طرح کانوں میں اتار کر اس کی جانب چڑھنے لگا.. کہ یہ صدا کہاں سے آتی ہے..

اوپر.. وادی کی چٹانوں میں آباد بستیوں میں میں نے ایسی خوشی اور مسرت دیکھی جو نیچے.. بہت نیچے پنجاب کے میدانوں میں ہزاروں برس پیشتر دم توڑ چکی تھی..

ایسے درخت تھے.. جن کی شاخوں سے املتاس کے پھولوں ایسے زرد گچھے لٹکتے تھے..

ہوا میں میرے لیے کم از کم اجنبی جنگلی پھولوں کی مہک تھی..

میں اوپر گاؤں تک پہنچا تو ہر دروازے کے ماتھے پر زرد پھولوں کی سجاوٹ تھی.. ہری بھری شاخیں لٹکتی تھیں اور ڈھول بجتے تھے..

کافر اپنے اپنے گھروں سے اترتے تھے..

مرد.. چترالی ٹوپیوں میں رنگا رنگ پر سجائے اور سرخ مست آنکھوں کے ساتھ۔ عورتیں.. ہاتھوں میں زرد پھولوں کے گچھے لہراتی ہوئی.. اپنی خوش رنگ قباؤں میں.. بچے کالاش لباسوں کی رنگینی اور خوش نمائی میں.. اور یہ سب کے سب.. حال ہی میں تعمیر کردہ ایک کمیونٹی ہال میں ٹین کی چھت تلے ان کافروں میں شامل ہوتے تھے جو شاید صبح سے یہاں ناچ رہے تھے..

یہ تاریخ کے آغاز سے پہلے کا منظر آسانی سے ہو سکتا تھا..

سینکڑوں کافر.. زرد پھولوں کو لہراتے ہوئے.. اپنے آپ میں گم.. اس تہذیب سے لاپروا جو انہیں فنا کر دینے کے لیے ان کے کناروں تک پہنچ چکی تھی.. خوش تھے اور رقص کرتے تھے.. اس "ڈانسنگ ہال" کے کناروں پر.. ڈھلوان مٹی پر براجمان میرے جیسے اور بھی سیاح تھے.. جو انہیں.. حیرت سے تک رہا ہے جہان وفا مجھے.. کے مصداق انہیں حیرت سے تک رہے تھے..

یہاں بی بی سی ٹیلیویژن کی ایک ٹیم بھی پہنچی ہوئی تھی۔ ہدایت کار کو جب معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں ایک ڈرامہ سیریل شوٹ کر رہے ہیں اور میں نے اسے لکھا ہے تو وہ سوال جواب کرنے لگا.. لیکن پہلا سوال میں نے کیا۔

"آپ یہاں تک کیسے پہنچ گئے؟"

"ہم ایک ڈاکومنٹری بنا رہے ہیں.. ہندوستان پر سکندر اعظم کے حملے کے بارے میں.. چونکہ یہ کہا جاتا ہے کہ کافر کالاش سکندر اعظم کی اولاد میں سے ہیں، اس لیے ہم یہاں تک پہنچ گئے.."

"لیکن سکندر اعظم تو ہوموتھا.. لڑکیوں کی بجائے لڑکوں میں دلچسپی لیتا تھا تو یہ اولاد کہاں سے آگئی؟"

"شوبزنس.. ٹیلیویژن وغیرہ بے وقوف عوام کو وہی دکھاتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں.. خواہ وہ حقائق کچھ بھی ہوں.. ہم نے یہاں آ کر اپنی جانب سے ان کافروں میں ایسے ہار تقسیم کیے ہیں جن میں پروئے ہوئے ایک سکے پر سکندر کی تصویر ہے... ہم اس پر زوم ان کریں گے اور کہیں گے کہ ذرا دیکھئے یہ لوگ ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود اب تک سکندر اعظم کی یاد کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں.. اور آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟"

"ہم تو ایک سادہ محبت کی کہانی شوٹ کر رہے ہیں.. مثلاً.. یہ جو چلم جوش کے میلے میں ناچتی ہوئی کافر دوشیزائیں ہیں.. ان میں ہم نے اپنے ڈرامے کی ایکٹریسیں بھی چھوڑ رکھی ہیں جو انہی کے لباس میں ہیں اور قطعی طور پر نہیں پہچانی جاتیں کہ یہ ہماری اداکارائیں ہیں یا کالاش لڑکیاں ہیں۔"

"پہچانی تو جاتی ہیں.." بی بی سی کے ہدایت کار نے نہایت بدتمیزی سے کہا.. اگرچہ ناچتی ہوئی مس خان اور دیگر اداکارائیں.. کالاش لڑکیوں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے انہی کے لباس میں ہم سے بھی پہچانی نہیں جا رہی تھیں..

"کیسے پہچانی جاتی ہیں؟" میں نے بھڑک کر کہا۔

"ایک تو وہ موٹی بہت ہیں.. اور پھر ان کے رقص میں ایک رکاوٹ ہے، بہاؤ نہیں ہے.."

ہم رقص گاہ کے کناروں پر بیٹھے مشاہدہ کر رہے تھے..

کچھ فیصل آبادی نوجوان بھی ناچ میں شامل ہو چکے تھے.. لیکن کفار اعتراض نہیں کر رہے تھے.. یہ سرخوشی اور بہار کا دن تھا.. انہیں کوئی پروانہ تھی۔ اگرچہ وہ اودھم مچا رہے تھے..

چلم جوش اگرچہ پوری وادی میں دھوم مچاتا تھا لیکن وہ سفر کرتا تھا.. ایک وادی سے دوسری وادی تک سفر کرتا تھا۔ خواتین، مرد، ڈھول والے بمبوریت سے بریر جاتے تھے.. رنبور جاتے تھے.....

اور خوش خوش جاتے تھے..

میں نے اپنی زندگی میں بے شمار قبیلوں اور قومیتوں کو خوشی کی تقریبات مناتے دیکھا ہے.. ان میں ہماری عیدیں بھی ہیں اور یورپ کی کرسمس بھی.. دیوالی بھی ہے اور بیساکھی بھی.. لیکن میں نے کبھی بھی کسی قبیلے کے چہروں پر اتنی معصوم اور بے اختیار خوشی اور ٹھاٹھیں مارتی ہوئی سمندر مسرت نہیں دیکھی۔

میں نے بے شمار لوگوں سے پوچھا.. ان کی خوشی اتنی زیادہ خوش کیوں اور کیسے ہے..

لیکن کسی نے بھی مجھے خاطر خواہ جواب آج تک نہیں دیا..

شاید ان کی خوشی ان کے کفر میں ہے.. لاعلمی میں ہے.. گناہ اور ثواب کے بوجھ کے بغیر ہے.. تہذیب سے دوری ہے.. نکاح ٹوٹ جانے کے خوف سے آزاد ہے.. ایک بوڑھی اماں جو ایک جوان لچکیلے بدن والی دوشیزہ کی مانند تھرکتی ناچتی تھیں.. میں نہیں جانتا کہ مجھے اسلام آباد کے لوک ورثہ کی سٹیج کے حوالے سے پہچان کر یا چلم جوش کے جوش میں میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی کافر بہار میں لے گئیں.. جہاں سینکڑوں بہاریں تھیں.. جو رقص کرتی تھیں.. اور اپنی مہک اور مستی میں ہر ایک کو شریک کرنا چاہتی تھیں...

خیر میں نے رقص کیا کرتا تھا..

میرے وہ زمانے گزر چکے تھے جب وکٹر سلوسٹر سکول آف ڈانسنگ سے میں نے ایک سرٹیفکیٹ حاصل کیا تھا کہ میں.. ٹینگو.. والٹز.. فاکس ٹراٹ اور دیگر نہائت

وکٹورین ڈانسز سہولت سے ناچ سکتا ہوں..

میرے وہ زمانے گزر چکے تھے..

وکٹر سلوسٹر سکول آف ڈانسنگ میں مجھے یہ نہیں سکھایا گیا تھا کہ کافرستان کی وادیوں میں جب چلم جوش کے بہار یہ میلے میں ڈھول بجتا ہے تو اس کی تھاپ پر قدم کیسے اٹھتے ہیں۔

اس رقص گاہ کے اوپر جو گھر تھے، ان میں سے جو مرد اترتے تھے.. جو خواتین اپنے لبادوں کو اور اپنے چہروں کو سنوارتی تھیں.. اور ہنستی ہوئی نیچے آتی تھیں... ان میں خمار کے کچھ شائبے ہوتے تھے..

جب دوپہر ہوئی..

چٹانوں پر جو دھوپ تھی، اس میں چلم جوش کی تمازت اتری..

تب.. وہ جو سینکڑوں کافر تھے، انہوں نے زرد پھولوں کے گچھوں کو لہراتے ہوئے گاؤں کی گلیوں کا رخ کیا۔

ایک انبوہ کافروں کا.. اور شاخوں پر کھلے زرد شگوفوں کا.. گلیوں میں بہنے لگا اور میں اس بہاؤ کا ایک حصہ تھا..

اگرچہ وہ نہیں جانتے تھے کہ میں ان کے ساتھ ہوں۔ ایک املتاس قسم کے گچھے کو سینے سے لگائے ان کے بہاؤ کا ایک حصہ ہوں... کافر لڑکیاں شور مچاتی تھیں.. اپنی زبان میں جانے بہار کی کیا کیا توصیف کرتی تھیں...

اور ان میں نیلی آنکھوں والی سوہنیاں تھیں..

کچھ ہیریں تھیں..

کافروں کی بھی تو سوہنیاں اور ہیریں ہوں گی۔

بلکہ سوہنی اور ہیر بھی تو کافر تھیں.. کیونکہ انہوں نے مذہب عشق اختیار کیا تھا۔

چنانچہ میں بھی چلم جوش کے بہاریہ میلے میں تھا.. اگرچہ ان زمانوں کے بہت بعد میں تھا جب.. میں اپنے خاندان کے ہمراہ پہلی بار ان وادیوں میں آرمی جیپوں میں اترا تھا..

اس شب سرد ہواؤں میں ایک کافر مہک تھی..

کافرستان میں موسم بہار کا آغاز ہو چکا تھا..

اس شب وہ چکن کا شیدائی کافر دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا اور مجھے چلم جوش کی داستانیں سناتا رہا.. وہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اپنے قبیلے کی تاریخ اور رسوم کے بارے میں بے تکان بولتا چلا جاتا تھا.. درجنوں قدیم گیت پہلے اپنی زبان میں گا کر سناتا تھا اور پھر ان کا اردو ترجمہ کرتا تھا.. غضب کی یادداشت رکھتا تھا اور صدیوں پیشتر ہونے والے واقعات کو مکمل تفصیل سے بیان کرتا تھا.. مجھے محسوس ہوا کہ اسے ہمارے علم کی ضرورت بھی نہیں.. اگر وہ عظیم ادب، سیاست، بین الاقوامی معاملات سے آگاہ نہیں بلکہ جمہوریت کے علاوہ سوائے چترال شہر کے وجود کے.. اور کچھ نہیں جانتا تو وہ گھاٹے میں نہیں.. اسے جو کچھ جاننا چاہیے تھا، وہ جانتا تھا.. اور اپنی وادی میں.. اپنی اس حیات میں خوش تھا.. اور میں آگاہ بہت تھا.. بہت کچھ جانتا تھا لیکن اپنی وادی میں اور اپنی حیات سے ناخوش تھا..

اگلی صبح برون کے گاؤں میں.. میرے ہوٹل کی چھت کے اوپر پھر ڈھول بج رہا تھا..

چلم جوش تین دن جاری رہا..

میں ناشتے کے بعد ڈھول کی تھاپ کے بلاوے پر.. کیمرہ اٹھاتا، بیگ میں کچھ خوراک رکھتا اور اوپر چلا جاتا..

کالاش میری شکل کے عادی ہو گئے..

میں ایک گاؤں کے بچے کی طرح جو شہر سے آنے والے مہمانوں کا پیچھا کرتا رہتا ہے.. ان کے لباسوں کو تکتا ہے.. انہیں ہاتھ لگا کر دیکھنا چاہتا ہے.. کھانا پینا فراموش کر دیتا ہے، منہ اٹھائے ان کی شکلیں حیرت سے دیکھتا ہے.. اس بچے کی طرح میں بھی کالاشیوں کے رقص کرتے اور خوشی سے بے قابو ہوتے ہجوم کے ساتھ ساتھ چلتا جاتا.. ان کے گھروں میں جھانکتا.. انہیں دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہتا.. جب وہ زرد پھولوں کے گچھے لہراتے ہوئے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک جاتے تو میں بھی ان میں شامل ہوتا.. ان کی خوشی اور بہار کی آمد کی مسرت سے میں بھی رنگا گیا..

اور جب چلم جوش کے آخری روز جشن کا اختتام ہوا تو مجھے یقین نہ آیا... میں

اس فریب میں تھا کہ یہ ہمیشہ کے لیے جاری رہے گا.. زندگی یہی ہے، وجود یہی ہے.. میں واپس اپنے کمرے میں آیا تو میرے ہاتھوں میں زرد پھولوں کی ایک شاخ تھی.. اسے میں نے اپنے بستر پر رکھ دیا..

اگلی صبح دیر تک میں ڈھول کی آواز کا منتظر رہا..

دھوپ چٹانوں سے اتر کر ہوٹل کے لان تک آگئی لیکن اوپر خاموشی رہی.. کالاش اپنے کھیتوں میں تھے.. مشقت کرتے تھے اور بوجھ اٹھاتے تھے.. بہار کو خوش آمدید کہنے کے بعد وہ اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو چکے تھے.. اپنے کھیتوں، بھیڑوں اور ندیوں اور چراگاہوں کو لوٹ چکے تھے..

”کالاش قبرستان ۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں“

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو..
تو یہ گردش ایام پیچھے کی طرف لوٹتی ہے..

ان ایام کی طرف لوٹتی ہے جب میں پہلی بار اپنے خاندان کے ہمراہ اس وادی میں آیا تھا.. اور جب خالق نے کہا تھا کہ صاحب آپ کو چلم جوش کے فیسٹیول کے موقع پر ادھر آنا چاہیے تھا..

اور میں ابھی ٹائم ٹنل میں سفر کرتا ہوا زمانوں کے آگے چلا گیا تھا..

اور اب واپس آتا ہوں..

اگلے روز خالق نے ہمارا کھانا کیا.. روٹی پر بلایا..

روٹی کے بعد میمونہ اور عینی ہوٹل کے لان میں ایک دوسرے کی کنگھیاں کرتی.. بچے کھلاتی.. رنگین چٹیاں اور نالے پراندے تھیں.. خالق کی کافر پھپھیوں، خالاؤں اور دیگر رشتہ دار خواتین کے ساتھ گپ لگاتی رہیں.. کچھ دیر تک وہ لاہور کی تھیں اور وہ کالاش کی اور پھر وہ صرف خواتین ہو گئیں... میمونہ نے ساس بہو کے تذکرے چھیڑ دیے اور عینی نے ان کے ہیئر ڈو اور میک اپ کے بارے میں انہیں مشورے دینے شروع کر دیے..

”صاحب.. ندی کے پاس کالاش کا سب سے پرانا قبرستان ہے.. ادھر کم لوگ جاتا ہے.. آپ دیکھے گا؟“

”ضرور دیکھے گا..“

ہم ڈھلوان سے نیچے اترے.. ندی میں ابھرے ہوئے پتھروں پر قدم رکھتے پار گئے اور دوسرے کنارے سے بلند ہونے والی پہاڑی پر چڑھنے لگے..

درختوں کے ایک جھنڈ میں وہ قبرستان خاموش تھا..

قبرستانوں کو عام طور پر شہر خموشاں کا نام دیا جاتا ہے.. لیکن یہ درست نہیں.. یہ شہر بولتے ہیں..

ان کے مکین آپ سے کلام کرتے ہیں.. اگر آپ عارضی سانسوں کے تکبر میں سے باہر آ کر کان دھریں تو ان کی آوازیں سنائی دیتی ہیں..

اس لیے آپ قبرستان میں داخل ہوں تو اہل قبور کو سلام کرتے ہیں..

دمشق کے قبرستان باب الصغیر میں جو خاک نشین تھے، میں نے ان کا کلام سنا تھا.. وہاں کربلا کے شہیدوں کے سر تھے جواب بھی اذن کلام رکھتے تھے۔

پردہ پوش ہونے کے باوجود امہات المومنین کے مقابر تھے جو اپنی پاکیزگی اور عظمت کی داستانیں کہتے تھے۔

امیر معاویہ کی قبر.. آہ و فغاں کرتی تھی..

حضرت بلال حبشی کے مدفن سے اذان کی صدا بلند ہوتی تھی..

میں نے ماکلی کے قبرستان کی دھوپ میں جلتی ویرانی اور زرد پتھر کے نقش و نگار میں سے بلند ہونے والی ماضی کی صدائیں سنی تھیں۔ لاہور کے میانی صاحب.. کے کیکر اور ببول ایسے گھروں پر چھدرے سائے کرتے تھے جن میں کیا صورتیں تھیں جو قیام کرتی تھیں.. کوئی ایک صورت... وہ سعادت حسن منٹو ہوں.. داتا بخش یا حشر کاشمیری ہوں.. مولانا احمد علی ہوں یا ان کے خلیفہ چودھری عبدالرحمٰن ہوں.. جو میمونہ کے والد تھے..

اور میرے اپنے گھر کی قربت میں.. گلبرگ کے قبرستان میں جنگلی گھاس سے اٹی ہوئی لاوارث قبر وحید مراد کی ہو.. عوامی اداکار علاؤالدین کی ہو.. یا میرے والد اور والدہ کی پہلو بہ پہلو قبریں ہوں.. سب کی سب اول و آخر فنا کی تصویریں.. کلام کرتی ہیں.. اگر کوئی سننے والا ہو تو.. زندگی کے عارضی تکبر کے شور کو خاموش کر کے

سنے تو.. کلام کرتی ہیں۔

کچھ ایسے ہی.. خالق کے ہوٹل کے نیچے.. ندی کے پار.. بلندی پر.. وہ قدیم کالاش قبرستان تھا.. جو کلام کرتا تھا..

ایک جنگل کے درختوں تلے پھیلا قبرستان.. جن درختوں کی شاخوں پر برف گرتی تھی تو وہ اس کے بوجھ سے جھک کر اسے تابوتوں پر گراتی تھیں اور انہیں بوسیدہ اور شکستہ کرتی تھیں.. ہم اس قبرستان کی تنہائی میں گمشدہ روحوں کی طرح گھومتے تھے..

عینی ایک تابوت کی شکستگی پر جھکتی تھی۔ ”ابو... اس دلہن کا سرخ جوڑا ابھی تک قائم ہے.. گوٹے کنارے سے سجے کپڑے.. سیپیاں اور منکے ابھی تک قائم ہیں.. لیکن دلہن نہیں.. اس کی ہڈیاں ہیں۔“

سلجوق اور سمیر بھی اپنی جوانی کے جوش میں نہ تھے، مدھم لہجوں میں بات کرتے تھے اور چوبی تابوتوں میں جھانکتے تھے۔ ”ان کے مکمل ڈھانچے ابھی تک اسی حالت میں ہیں جیسے انہیں کئی برس پہلے رکھا گیا تھا۔“

اور میمونہ ایک سوگواری کے عالم میں کہتی تھی۔ ”ذرا دیکھیں.. یہاں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تو ہیں.. ان کی چھوٹی چھوٹی کھوپڑیوں کے برابر میں کچھ کھلونے رکھے ہیں۔“

یہ قبرستان اب متروک ہو چکا تھا..

برفباری اور بارشوں نے تابوتوں اور ڈھانچوں کو کھوکھلا کر دیا تھا..

ادھر اُدھر بکھری ہوئی کھوپڑیوں کو جانے کس نے کسی ایک تابوت میں جمع کر دیا تھا.. اور ان میں سے کسی ایک کھوپڑی کو اٹھا کر ہیملٹ کہہ سکتا تھا کہ.. To be or not To be... کالاش لوگ ایک زمانے میں اپنے بزرگ و برتر اور معزز مردوں کے تابوتوں کے سرہانے کتبوں کی بجائے لکڑی کے مجسمے ایستادہ کرتے تھے.. تیکھی ناکوں والے گھڑ سوار.. اور ان کے سروں پر تکونی ٹوپیاں اور عجیب شکلوں والے گھوڑے..

جیسے ترکی میں مردوں کی قبروں پر ایک پگڑی تراش دی جاتی ہے.. پھر یہ نیم

تراشیدہ قدیم شکلوں کے چوبی مجسمے سیاحوں کی نظروں میں آ گئے.. انہوں نے.. یادگار اہل کفر کو گھر لے جانے کی خاطر.. ظاہر ہے کچھ کالاشیوں کی مٹھی گرم کر کے انہیں چوری کرنا شروع کر دیا..

اہل کالاش نے اسے ایک بے حرمتی جانا اور یہ رواج ترک کر دیا..

اب بھی وادیٔ رنبور میں ایک ایسا کافر موجود ہے جو روایت اور عادت سے مجبور ایسے مجسمے تراشتا رہتا ہے.. وہ کوئی ماہر مجسمہ ساز نہیں ہے.. ہمارے نزدیک ایک ان پڑھ اور سادہ شخص ہے.. لیکن وہ چراگاہوں سے اوپر جو جنگل ہیں، وہاں سے ایک شہتیر لاتا ہے اور اس میں سے ایک گھڑ سوار نکالتا ہے.. وہ رموزِ مجسمہ سازی سے آگاہ نہیں.. لیکن خود بخود شہتیر میں سے وہی شکل نکلتی ہے جو ہزاروں برس پیشتر اس کے آباؤ اجداد کی تھی..

رنبور کے اس کافر نے مجھے دوست جان کر ایک ایسا ہی چوبی مجسمہ تحفے کے طور پر دیا تھا..

یہ مجسمہ میرے گلبرگ کے گھر میں.. میری سٹڈی میں.. ایک متروک خدا کی مانند پڑا ہے.. ایک سیدھی ناک اور تکونی ٹوپی والا... گھڑ سوار اور اس کا گھوڑا.. اور اس کی آنکھیں ایک عجب حیرانی میں کھلی ہیں کہ میں کہاں کا ہوں اور کہاں آ گیا ہوں.. کیونکہ میری سٹڈی میں اور ہندوکش کی کافر وادیوں کے درمیان زمان و مکاں کے بہت طویل فاصلے ہیں..

ہم کھلے موسموں میں ادھر آئے تھے..

جب برف پگھل چکی تھی اور ندی کا پانی بڑھ چکا تھا تو ادھر آئے تھے۔

چلم جوش کو گزرے ہوئے تین ماہ گزر چکے تھے.. کونپلیں اپنے کنوارپن سے باہر آ کر پختہ اور تجربہ کار ہو چکی تھیں۔

کالاش کی مٹی میں جو بیج سرمائی نیند میں گم تھے.. وہ بیدار ہو کر اپنے گل کھلا چکے تھے اور ان میں رنگ بھر چکے تھے..

اسی لیے جب میں نے اس متروک قبرستان میں.. ایک تابوت کے اندر.. سالخوردہ... بارشوں اور برفوں سے کھوکھلے ہو کر شکستہ ہوتے کھلے تابوت کے اندر

ایک عروسی سرخ لباس دیکھا.. تابوت کی چوبی تختے سے چپٹا ہوا.. گلتا اور تار تار ہونے کو ایک لباس دیکھا۔ چند زیور، گہنے اور منکے دیکھے اور ان پر لگی ریڑھ کی ہڈیوں کو اپنے ماس کے ماتم میں برہنہ دیکھا.. اور پھر اس جواں مرگ دلہن کی کھوپڑی دیکھی.. جس میں ایک شگاف تھا جہاں اس کی مسکراہٹ ہوا کرتی تھی.. دو سوراخ تھے جہاں چشم غزال کھلتی تھیں اور اس کے نین دل نشیں ہوا کرتے تھے اور ان دو سوراخوں میں سے میں نے چند بوٹوں کو سر اٹھائے دیکھا.. اور ان میں سے ایک بوٹا ایسا تھا گھاس کے تنکوں میں سے بلند ہوتا.. اس کی آنکھ میں سے نکلتا جس پر سرخ رنگ کا ایک ننھی سا پھول کھلا تھا.. تو تب میں نے جانا کہ ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے.. اور سب کہاں.. کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں... غالب جو آخری وقت میں بھی مسلماں نہ ہوا اور کافر تھا لیکن کافرستان میں کبھی نہ آیا تھا.. اور اگر نہیں آیا تو اس نے دلّی میں بیٹھ کر اس تابوت میں رکھی کھوپڑی میں سے سر اٹھاتے لالہ و گل کو کیسے دیکھ لیا تھا... شاید اس کی روح یہاں موجود تھی جو کہتی تھی.. خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں..

"پہاڑوں پر برف گرنے لگتی ہے اور مارخور نیچے آتے ہیں"

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی..

خاک میں...

خواب میں کیا صورتیں ہوں گی..

کالاش قبرستان میں کیا صورتیں ہوں گی جو خاک ہوئیں اور خواب ہوئیں..

اور یہ صورتیں میرے خواب میں ہوئیں..

اس شب شیخان دیہہ کے گاؤں سے پرے افغانستان سے اترتی ندی کے کبھی گم ہوتے کبھی ظاہر ہوتے شور کے کنارے ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں.. وہ صورتیں میرے خواب میں تھیں.. وہ اتنی دھندلی اور بجھی بجھی تھیں کہ نہ ان کی کوئی پہچان تھی اور نہ کوئی شکل.. اور نہ وہ کلام کرتی تھیں..

وہ صرف اپنے اپنے چوبی برف اور بارش سے بُرادہ ہوتے تابوتوں میں سے اٹھتی تھیں اور ان میں بیٹھ کر بار سنگھار کرتی تھیں.. موتی منکے گلے میں ڈالتی تھیں۔ مینڈھیاں گوندھتی تھیں.. آنکھوں میں سرمہ لگاتی تھیں اور رخساروں پر نقش بناتی تھیں..

میں وادی کالاش میں سے سرسری گزر رہا تھا..

جیسے ایک شخص اس جہان سے سرسری گزر جاتا ہے..

اور یہ جہان.. کالاش کا جہان ایسا تھا کہ اس میں سے سرسری گزرنے والوں کو کچھ بھی نظر نہ آتا تھا سوائے دھندلے اور بجھے ہوئے چہروں کے..

جیسے ایک دھول اڑاتی جیپ کسی اجنبی وادی میں سے گزر جاتی ہے.. اور اگلی نشست پر براجمان ایک کوہ نورد دیکھ ہی نہیں سکتا کہ اس دھول کے پار کیا ہے.. کونسی آبشار ہے جس کے کنارے ایک گھاس کے ہرے بھور قطعے میں ایک سنو ٹائیگر اپنی شاہانہ نشست سے اس جیپ کو دیکھتا ہے جو وادی میں.. بہت گہرائی میں نیچے وادی میں دھول اڑاتی ایک جیپ کو دیکھتا ہے جس کی اگلی نشست پر ایک نابینا کوہ نورد اس کے وجود سے ناآشنا بیٹھا گزرتا ہے.. دھول کے پار ایک گلیشیر ہے، ایک گاؤں پر اُمڈا ہوا اور اس گاؤں کے کسی ایک گھر میں کچھ لوگ آگ کے سامنے بیٹھے اپنے سفید چہرے سیاہ کرتے ہیں تو وہ کون ہیں.. کیا ہیں.. ان کی حیاتی کا چلن کیا ہے.. ان کی رسمیں کیا ہیں.. ان کے عقیدے کس نوعیت کے ہیں.. ان میں کفر کی آمیزش ہے یا ایمان کی تشکیک.. وہاں اس اجنبی وادی کے اندر کسی چرواہے کے جھونپڑے کے اندر کوئی ہیر ہے.. جو رانگلے پلنگ پر دراز اس جوگی کی منتظر ہے جس نے پہاڑ سے اتر کر آنا ہے یا کوئی سوہنی ہے جس نے مہینوال کے لیے کوئی گلیشیر پار کرنا ہے..

یہ سب کچھ اگلی نشست پر براجمان کوہ نورد کو نظر نہیں آتا اور اس کی جیپ دھول اڑاتی وادی میں سے گزر جاتی ہے.. وہ سرسری گزر جاتا ہے.. میں بھی وہی کوہ نورد تھا جو وادی کالاش میں سے سرسری گزر رہا تھا.. میں اس وادی کو.. صرف ٹورسٹ بروشرز چند تحقیقی سفرناموں اور فیلسٹی کے منتشر تصورات کی محدود اور لامحدود اور قدرے پُرتکبر.. اپنی جدید تہذیب پر نازاں عینک سے دیکھ رہا تھا.. اسی لیے میں ایک ایسا نابینا تھا جو سرسری علم کی ایک نہایت قیمتی گوگلز پہنے ہوئے تھا اور حقیقت میں کچھ بھی نہ دیکھ رہا تھا..

کالاش آخری لوگ تھے..

ہماری دنیا کے آخری لوگ تھے..

وہ ایک ایسی قدیم تہذیب کے آخری لوگ تھے جن سے مہذب دنیا خائف تھی.. کہ اس مہذب دنیا کی پُرتکبر جھولی میں سوائے پختہ اور سنگلاخ عقیدوں اور تنگ نظری کے اور کچھ نہ تھا.. نہ وہ لباس تھے.. نہ گیت تھے.. نہ رقص تھے.. نہ مظاہر قدرت میں رچی ہوئی سچائیاں تھیں.. نہ رسمیں تھیں.. نہ تاریخ تھی اور.. نہ خوشی تھی..

ناخوشی... ہمیشہ عقیدے کی پختگی میں ہوتی ہے.

اور خوشی.. عقیدے کو اپنے لیے تاب کرتی ہے.

کالاش روح کے فنا ہو جانے پر یقین رکھتے ہیں.. اور اس لیے اپنے مُردوں کے گرد کئی روز رقص کرتے، ان کی خوش بختی کے لیے مخمور ہوتے ہیں.. کہ یہ شخص حیات کی قید سے آزاد ہوا..

کالاش موسم خزاں میں گائے کی قربانی کرتے ہیں..

ایک گھوڑے اور روح کے سفر کا ملاپ ان چوبی مجسموں میں ظاہر ہوتا ہے جو وہ ایک زمانے میں اپنی قبروں کے سرہانے ایستادہ کرتے تھے.. جس کا ایک نمونہ میری سٹڈی میں لاوارث اور قید ہے..

ان کا ایک دن سورج کا راستہ ہے..

اپنے گلّے کی حفاظت کے لیے دعاؤں کا.. اپنے خداؤں سے دعاؤں کا ایک دن ہے..

یہ ایک ایسا دن ہے جب وہ سب ایک دوسرے کو طعنے دیتے ہیں.. بُرا بھلا کہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوب بے عزتی کرتے ہیں.. تاکہ دل کے اندر جو کدورت ہے، میل ہے وہ صاف ہو جائے۔ اسے مہذب معاشرے کی طرح اخلاقیات کی آڑ میں چھپایا نہ جائے.. پنجاب کے دیہات میں بھی ایک قدیم رسم تھی کہ بارات کی آمد پر گاؤں کی عورتیں کوٹھوں پر چڑھ کر باراتیوں کو باقاعدہ گالیاں نکالتی تھیں، اپلوں کی بارش کرتی تھیں.. یہ رسم جہاں بیرونی حملہ آوروں کے خلاف مدافعت کی یادگار تھی، وہاں اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا بھی ایک بہانہ تھی..

ایک اور دن..

کالاش کی تہذیب میں مختلف دن ان کی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں..

ایک اور دن..

ایک ایسا دن جو کچھ بھی نہیں ہے.. جس روز کچھ بھی نہیں ہوتا..

یہ انتظار کا دن ہے کہ کچھ ہو..

جب ہر گھرانہ صرف گندم پیتا ہے اور اگر وہ گندم رات تک نہ پیسی جا سکے تو وہ کہتے ہیں کہ آج تو کچھ بھی نہیں ہوا اور پھر اگلے دن کا انتظار کرتے ہیں۔

اور اگلے دن مرد جنگلوں میں لکڑی کاٹنے کے لیے چلے جاتے ہیں۔
عورتیں کپڑے دھوتی ہیں اور اپنی جرابیں بُنتی ہیں..
پھر موسم سرما آجاتا ہے..
پہاڑوں پر برف گرنے لگتی ہے اور مارخور نیچے آجاتے ہیں۔

ایک ترکھان جو لکڑی سے چیزیں تراشتا ہے، بُت بناتا ہے، اپنے بزرگوں کی قبروں کے سرہانے ایستادہ کرنے کے لیے.. اسے شتاوک کے نام سے پکارا جاتا ہے.. اور جب وہ یہ مجسمے تراشتا ہے تو وہ اپنے کھوئے ہوئے وطن کی یاد میں محبت کے گیت گاتا ہے.. اس وطن کی یاد میں جو اب نورستان کہلاتا ہے اور جو بڑے گلیشیر کے پار افغانستان میں ہے جہاں سے اسے نکالا گیا تھا کہ وہ کافر تھا اور نور کی راہ میں حائل تھا.. اس کی بستیاں جلا دی گئی تھیں، قبرستانوں پر ہل چلا دیے گئے تھے اور اسے ایمان کی روشنی نہ دیکھنے کی سزا دی گئی تھی.. اب بھی کالاش کے لوگ اس ہجرت کو گیتوں میں یاد کرتے ہیں..

ان گیتوں میں ایک گیت محبت کا ہے..

اور جنسی عمل کی طرح... محبت ہر ذات، ہر قبیلے، ہر عہد میں.. بدلتی نہیں.. ایک ہی رہتی ہے.. اسے ہومر یا ابو نواس بیان کرے.. قرۃ العین طاہرہ چہرہ بہ چہرہ روبرو بیان کرے.. یا مجید امجد، ساحر یا گلزار اس میں ڈوبے.. وہ ایک ہی رہتی ہے.. مثلاً محبت کا یہ گیت تاریخ، زمانے اور قبیلے کی قید سے آزاد ہے..

جب کوش ہنستی ہے تو میری چھاتیوں سے دودھ بہنے لگتا ہے..
میں ساری رات چولہے پر رکھی کیتلی کی طرح اس کی یاد میں ابلتی رہتی ہوں..
اور مرد کہتا ہے..
وہ نہیں جانتی کہ میں اس کے بارے میں کیا کیا سوچتا ہوں
میں دعا کرتا ہوں کہ صرف ایک بار... میں اس کی شکل دیکھ سکوں...
کہ.. اس کی گردن ایک مینا کی طرح ہے..
اور اس کا نازک اور چھریرا بدن مجھے پاگل کرتا ہے..
اس کے بدن کے لیے میں مہنگے اور بجز کیلئے لباس خریدوں گا..

گلگت کے بازار سے..
میں اپنے آپ کو ایک زنجیر سے جکڑ کر اس کے گھر کے برآمدے میں..
بیٹھا رہوں گا.. اور اپنے آپ کو مار ڈالوں گا..
ذرا ایک لمحے کے لیے میرے پاس آجاؤ..
ذرا ایک لمحے کے لیے.. اے غزال.. تم مجھے "جنگلی جنگلی" کہو..
کیونکہ تمہاری آنکھیں مجھے قتل کر دینے کے لیے کافی ہیں..
ذرا ایک لمحے کے لیے میرے پاس آبیٹھو..
اور ایک مینا کی طرح چہچہانے لگو..

پھر ایک اور دن آتا ہے..
یہ چھوٹے مارخور کا دن ہے..
کیوں یہ دن چھوٹے مارخور کا دن کہلاتا ہے؟

اس لیے کہ.. خدا نے جس مارخور کو پہاڑوں میں اور آبشاروں کے کنارے گھنی گھاس میں بنایا ہے، انسان اس کی نقل نہیں کر سکتا.. اگر کرتا ہے تو نقل بہ مطابق اصل ہرگز نہیں کر سکتا..

کالاش کہتے ہیں "خدا نے ہر شے کو بے عیب، بے نقص اور مکمل بنایا.. لیکن انسان ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے، اس کی ہمسری کر سکتا ہے جسے اس نے بنایا.. اسی لیے جب ہم ایک جنگلی بھیڑ۔ ایک بھیڑیے یا ایک بکری کی شکل بناتے ہیں یا کسی اور جانور کی.. تو ہم اسے ویسا نہیں بنا سکتے جیسا اس نے بنایا.. اور نہایت اناڑی پن سے بناتے ہیں۔"

اسی لیے اس دن کو.. چھوٹے مارخور کے دن کو "کوتامرو" بھی کہتے ہیں.. یعنی ایک لنگڑی جنگلی بکری کا دن.. بکری جس کی ٹانگیں بہت چھوٹی ہوتی ہیں.. اس لنگڑی اور چھوٹی بکری کی تراشیدہ شکل ان کی قربان گاہوں کے ستونوں، ان کے گھروں کے باہر شہتیروں اور معبدوں میں دکھائی دیتی ہے..

دنیا بھر کے وہ انسان.. مہذب انسان.. جو مصوّر اور مجسمہ ساز کہلائے، ہمیشہ

اس زعم میں رہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا، ہم اسے ہو بہو بنا کر ایک چھوٹا خدا ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں...

مائیکل انجلو نے جب حضرت موسیٰ کا مجسمہ مکمل کیا تھا تو اپنے وجدان اور تخلیق سرمستی میں پکار اٹھا تھا کہ.. تم بولتے کیوں نہیں۔ تم ہی تو موسیٰ ہو.. اور وہ پتھر کیسے بولتا.. اگر بولتا تو بھی اس کی زبان انگاروں سے آبلہ خیز تھی اور وہ ہکلا کر بولتا.. اور جب سنگ مرمر کا موسیٰ گنگ رہا تو مائیکل انجلو نے اس کے گھٹنے پر تیشہ مار کر اپنی برہمی کا اظہار کیا کہ تم بولتے کیوں نہیں.. روم کے اس کلیسا میں جہاں حضرت موسیٰ کا یہ مجسمہ اپنی لمبی داڑھی اور پر جلال آنکھوں کے ساتھ ایک نشست پر براجمان ہے.. سیاحوں کے غول میں کم ہی دکھائی دیتا ہے.. اور جب وہ مجھے دکھائی دیا.. اور پیئر لوچی نے مجھے دھکیل کر کہا کہ.. مستنصر آگے بڑھو، موسیٰ تمہارا منتظر ہے.. تو میں نے دیکھا کہ مجسمے کے گھٹنے پر مائیکل انجلو کے تیشے کا نشان اب بھی موجود ہے.. اور اس نے ایک پرفیکٹ شاہکار کا ستیاناس کر دیا ہے... یہ مجسمہ گواہ ہے کہ انسان اللہ کی ہمسری کرنا چاہتا ہے لیکن کر نہیں سکتا..

صرف کالاش ایسے ہیں جو اقرار کرتے ہیں کہ ہم وہ نہیں بنا سکتے جو اس نے بنایا ہے اور اسی لیے جب ہم اس کی کسی تخلیق کی نقل کرتے ہیں تو اس میں خامیاں رہ جاتی ہیں.. ایک بکری بناتے ہیں تو اس کی ٹانگیں چھوٹی رہ جاتی ہیں اور وہ لنگڑی لگتی ہے..

چنانچہ خالق کی ہمسری کا دعویٰ صرف مہذب کرتے ہیں.. کالاش ہمیشہ اپنے عجز کا اظہار کرتے ہیں۔

چنانچہ چھوٹے مارخور کا دن آتا ہے۔
اس کے بعد ایک اور دن آتا ہے..
مُردوں کی واپسی کا دن..
اور عورتوں کی پاکیزگی کا دن..
اور وہ رات جب مُردوں کو پانی سے دھویا جاتا ہے..
پھر وہ دن.. جو قربانی کا دن ہوتا ہے..
قربانی کے دن خداؤں کی نعمتیں اور مہربانیاں آسمان سے اترتی ہیں..

پھر اتنے دنوں کے بعد ایک رات بھی آتی ہے..
وہ شب.. شب برات کی مانند چراغاں کی شب ہوتی ہے..
وادی کالاش میں ہر سو دیے جلتے ہیں..
اور پھر "لومڑی سے ڈرنے کی رات" بھی ہوتی ہے..
یہ وہ رات ہوتی ہے جب پاکیزگی اختتام کو پہنچتی ہے اور زمانوں کا سکوت ٹھہر جاتا ہے..

ایک اور دن آتا ہے.. جسے سفید کوّے کا دن کہتے ہیں۔

حافظ برخوردار نے کہا تھا کہ.. رات چنے دی چانی.. تے پونی ورگا کاں.. شاید کالاش کی چاندنیوں میں بھی پنجاب کی طرح ایسی سفیدی ہوتی ہے کہ کوّا بھی سفید ہو جاتا ہے..

پھر چڑیلوں کے شکار کا دن بھی طلوع ہوتا ہے..

اور آخر کار.. سوکل شائن.. وہ زمانہ جب سورج خط استوا سے بہت دور چلا جاتا ہے..

اہل کالاش کا ہر دن.. کائنات کی الجھنیں سلجھانے کا ایک دن ہوتا ہے..
اسی لیے.. میں کہتا ہوں کہ.. کہ میں اس وادی سے سرسری گزرا..
اپنی تہذیب کی دھول میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا اور میں سرسری گزر گیا..
چنانچہ اس شب..
شیخان دیہہ کے گاؤں سے پرے.. افغانستان سے اترتی ندی کے کبھی گم ہوتے کبھی ظاہر ہوتے شور کے کنارے ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں.. وہ صورتیں میرے خواب میں تھیں..

وہ اپنے اپنے چوبی برف اور بارش سے برادہ ہوتے تابوتوں میں سے اٹھتی تھیں اور ان میں بیٹھ کر بار سنگھار کرتی تھیں.. موتی منکے گلے میں ڈالتی تھیں.. مینڈھیاں گوندھتی تھیں.. آنکھوں میں سرمہ لگاتی تھیں اور رخساروں پر نقش بناتی تھیں..

میں.. وادی کالاش میں سے سرسری گزرا تھا..

”کافر ہیں.. شراب پیتے ہیں.. رقص کرتے ہیں“

کالاش کی رات میں.. ایک سیاہ سرگوشی میں.. ایک کافر بلاوے کی کشش میں..
اوپر اٹھتی.. ایک خشک ندی کے پتھروں پر پاؤں دھرتے..
ہم چلتے جاتے تھے..
رات کی سیاہی میں ایک لالٹین جھولتی ہوئی حرکت میں تھی..
اور ہم اس پر نظر رکھے چلتے جاتے تھے..
اور خاموشی نہ تھی..
رات خاموش نہ تھی..

اس میں.. ڈھکی ہوئی.. جیسے اس کے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو تو آواز ڈھک جاتی ہے.. مکمل طور پر ظاہر نہیں ہو سکتی.. ایک ڈھول کی آواز آتی تھی..

اور کافر جناح لالٹین تھامے ہمیں راستہ دکھاتا.. اوپر کالاش کی سیاہ رات میں.. ہمیں اوپر لیے جاتا تھا..

وہاں.. شہر میونخ میں ساز بجتے تھے اور برف گرتی تھی..

یہاں.. کالاش کی اندھیری شب میں.. ڈھول بجتے تھے.. اور ہم گرتے پڑتے چلتے جاتے تھے.. ہم.. یعنی.. میں.. اور.. عینی.. ایک نیلی جین اور کھلی زرد ٹی شرٹ میں.. اور سُمیر.. اپنے بڑھتے ہوئے قد کو سنبھالتا.. لچکتا اور ڈولتا ہوا.. اور ہمیں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا..

اور ڈھول کی ڈھکی چھپی تھاپ مسلسل ہمارے کانوں پر دستک دیتی تھی اور ہم بین کی لے پر مست ایک ناگ کی طرح مست جھولتے تاریکی میں ٹھوکریں کھاتے

لالٹین پر مسلسل نظریں رکھتے خشک ندی میں چلتے بلند ہوتے جاتے تھے..

ڈھول کی آواز خوشی دینے والی نہ تھی.. رقص کے لیے بے اختیار کر دینے والی نہ تھی بلکہ اس کی تھاپ دل میں خوف کی جھبیں بٹھاتی چلی جاتی تھی..

ہم آج سارا دن جمہوریت کے بازار میں گھومتے رہے تھے.. بازار کے اوپر ایک ”نئے“ قبرستان میں گئے تھے جہاں چوبی تابوت ایک کونے میں ڈھیر تھے اور کچھ ہڈیاں ایک جھاڑی میں رکھی ہوئی تھی اور چند قبریں تھیں جن پر چارپائیاں اوندھی پڑی تھیں.. قبرستان میں نہایت ناگوار بُو تھی.. یہ پتھروں کے ڈھیر تلے کسی گلتی لاش کی بُو تھی..

میرے بیٹوں نے ریسٹ ہاؤس کے برابر والی مسجد میں عصر کی نماز ادا کی تھی..

میمونہ نے کالاش ہوٹل کے لان میں ہار سنگھار کرتی اور نالے پر اندے بُنتی کافر خواتین کے ساتھ تبادلہ خیال کیا تھا اور بڑے فخر سے اعلان کیا تھا کہ یہ سب کی سب بھی اپنے خاوندوں کے ظلم و ستم کا شکار ہیں، اس لیے میری بہنیں ہوتی ہیں..

عینی.. کھیتوں میں کام کرنے والی کالاش لڑکیوں سے مینڈھیاں گوندھنے کے طریقے سیکھتی رہی تھی..

اور جب ہم بنگالی باورچی کے تیار کردہ طعام کی بدمزگی کو اپنے اندر انڈیل کر سونے کی تیاری کر رہے تھے تو عبدالخالق آ گیا ”صاحب.. آج رات برون میں رقص ہوگا.. آپ چلے گا؟“

میمونہ نے صاف انکار کر دیا ”مجھے تو نیند آ رہی ہے.. اور ریسٹ ہاؤس سے وہاں تک روڈ بھی خطرناک ہے اور غازی نے کہہ دیا ہے کہ صاحب ادھر رات کے ٹائم جیپ نہیں چل سکتا.. چلے گا تو گرے گا.. یوں بھی یہ کافر لوگ رقص کیا خاک کرتے ہیں.. بس دائروں میں گھومتے چلے جاتے ہیں.. ورزش سی کرتے ہیں.. اس لیے میں تو سو رہی ہوں.. آپ ہو آئیں..“

”رات کے اس ٹیم نہ جاؤ صاحب.. روڈ خطرناک ہے..“ غازی نے اپنی ریش سہلاتے ہوئے خبردار کیا..

”پ.. پ پرواہ نہیں صاحب.. میں میں لے جاؤں گا۔“ یہ اسلم تھا..

اور سلجوق تو ہمیشہ سے نیند پسند تھا "ابو آپ چلے جائیں.. ادھر امی کے ساتھ کوئی نہ کوئی ہونا چاہیے.. میں ٹھہرتا ہوں۔"

چنانچہ جناح.. جو خصوصی طور پر عبدالخالق کے ہوٹل کے قریب ہمارا منتظر تھا. ہمیں برون لے جانے کے لیے.. لالٹین تھامے.. خشک ندی کے پتھروں پر چلتا تھا اور ہم کالاش کی سیاہ رات میں سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلے جاتے تھے.. اور برون کے کافر گاؤں سے ڈھول کی تھاپ اترتی تھی.. ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے یہ ڈھول افریقہ کے قدیم جنگلوں کی گھنی تاریکی میں کہیں بج رہا ہے.. اور اس کی آواز درختوں، جانوروں اور دریاؤں کے اوپر سفر کرتی ہم تک پہنچتی ہے.. اور جب ہم اس کے منبے تک پہنچیں گے تو سیاہ بدن کے خوبصورت لوگ ایک الاؤ کے گرد رقص کر رہے ہوں گے..

ڈھول کی آواز بلند ہونے لگی..

کچھ آوازیں تھیں جو سنائی دینے لگیں..

اور پھر ہم کھلی فضا میں آ گئے..

ہم اندھیرے میں سے ابھر کر آئے تھے۔ اسی لیے وہاں موجود لوگوں کو ہماری آمد کا پتہ نہ چلا..

ڈھول.. دھم دھم.. بجتا تھا اور اندھیرے میں کچھ صورتیں تھیں.. کچھ سیاہ لباس تھے جو حرکت کرتے تھے اور خوشی اور مسرت کی آوازیں تھیں.. کالاش ناچ رہے تھے لیکن صاف دکھائی نہ دیتے تھے.. چند لالٹینوں کی ناکافی روشنی تھی جو کسی ایک سیاہ لبادے پر پڑتی، کسی ایک شکل کو پل بھر کے لیے اندھیرے سے الگ کرتی.. پاؤں سے اٹھتی، ڈھول پر ایک لمحے کے لیے ٹھہرتی.. البتہ رقص کے دائرے کے کناروں پر جو لوگ بیٹھے تھے.. اور ان میں سیاح بھی شامل تھے.. جب بھی ان میں سے کوئی کیمرے کا بٹن دباتا اور فلیش کی چکاچوند ہر شے روشن کرتی تو رقص کا یہ منظر صاف سامنے آتا اور آنکھ جھپکنے سے پہلے تاریکی میں مٹ جاتا..

کالاش تصویر لینے والے سیاح کو ناپسند کرتے اور فلیش کی روشنی سے سمت کا تعین کر کے اس جانب بڑھتے.. لیکن انہیں اکثر اندھیرے میں پتہ نہ چلتا کہ مجرم کون ہے۔

ہمیں رقص دیکھنے کے لیے جناح اور عبدالخالق کی وجہ سے ایک نہایت اعلیٰ اور ارفع مقام عطا کیا گیا جہاں سے ہم ان کفار کی نہایت معیوب ملحدانہ سرگرمیوں پر کڑی اور مسلسل نظر رکھ سکتے تھے..

کالاش رقص کیا ہے؟

وہی ہے جو وجد میں آ جانے والے ازل سے ناچتے آئے ہیں..

اس ڈھول کی تھاپ اگرچہ رنجیدہ تھی لیکن میرے لیے اجنبی نہ تھی..

میں نے اسے شاہ حسین کے میلے میں سنا تھا. بھٹائی کے کلام میں اس کی تھاپ تھی.. بلھے شاہ کے تیرے عشق نچایا میں اس کی دھمک تھی.. اور جب کبھی بے خوابی کی حالت میں میں نے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتیں تو تکیے میں دبے ہوئے اپنے بدن کے اندر مجھے اپنے دل کی جو دھک دھک سنی تھی، وہ یہی تھاپ تھی..

مولانا روم کے درویشوں کی مانند کالاش بھی ایک ایک دائرے میں گھومتے چلے جاتے ہیں.. اور ان کے درمیان ایک کافر داستان گو ماضی کے قصے اور کہانیاں بیان کرتا چلا جاتا ہے..

ہمارے بیشتر پاکستانی سیاح جب یہ رقص دیکھتے ہیں تو بے حد مایوس ہوتے ہیں کہ.. اپنے تئیں بے راہرو کافرستان میں وہ ایک "اورجی" میں شرکت کے لیے لواری ٹاپ عبور کر کے بمشکل ان کافر وادیوں میں پہنچتے ہیں.. ایک ایسی "اورجی" جس میں رقص و سرود کے دوران قدیم یونانی دیوتاؤں کی پرستش کی رسوم ادا ہوتی ہیں اور دیوتا بیکس کے مندر میں لوگ شراب پی کر ناچتے ہیں.. بدمست ہوتے ہیں.. رنگ رلیاں مناتے ہیں.. عیش و عشرت میں مخمور خرمستیاں کرتے ہیں.. مختصر یہ کہ پاکستانی سیاح اس یقین میں ادھر آتے ہیں کہ کم از کم ادھر کوئی مقامی صائمہ رقص کر رہی ہوگی، کسی ریما کا مجرا ہوگا اور وہ بلے بلے کے نعرے لگاتے ہوئے اس پر نوٹ نچھاور کریں گے..

اور پھر وہ یہاں پہنچتے ہیں تو بے حد مایوس ہوتے ہیں.. ان کے چہرے لٹک جاتے ہیں اور ان کی مجرا امیدوں پر اوس پڑ جاتی ہے.. کیونکہ یہاں کالاش ورزش کر رہے ہوتے ہیں.. لڑکیاں اور بڑی بوڑھیاں ایک دوسرے کے بازوؤں سے زنجیر بنائے ایک دائرے میں ڈھول کی اکتا دینے والی تھاپ کی بیٹ پر قدم اٹھاتی ہیں اور سر جھکا کر..

”ہو ہو..“ کرتی ایک دوسرے کی جانب بڑھتی جاتی ہیں اور اس کے سوا کوئی ٹھکا نہیں لگتا.. بدن اور ہوس کی کوئی نمائش نہیں ہوتی.. اور ان کے، سیاحوں کے چہرے لٹک جاتے ہیں..

لیکن میرے لیے یہ ایک خوشگوار حیرت کا تجربہ تھا.. کیا اس مملکت خداداد میں.. اب بھی ایسے لوگ ہیں.. بے شک کافر ہی سہی.. جو اپنے من کی موج میں اپنی مسرت کے لیے ناچ سکتے ہیں..

میں پنجاب کا باسی تھا.. اور پنجابی ہمیشہ رقص کرنے سے گریز کرتے ہیں.. اگر کرتے ہیں تو ان کے بدن ان کا ساتھ نہیں دیتے.. جب کہ بلوچستان، سندھ اور سرحد کے باشندوں کے لیے رقص کرنا ایک قدرتی عمل ہے.. بے شک فی زمانہ پنجاب کی بھنگڑا بیٹ پوری دنیا میں گونج رہی ہے اور ہر جانب ”ہو جائے فیر بلے بلے“ ہو رہی ہے لیکن اس کے باوجود پاکستانی پنجاب میں رقص کے لیے ایک جھجک ہے ..

”عینی..“ تمیر نے سرگوشی کی۔ ”تم چپکے سے ان میں شامل ہو جاؤ، میں تمہاری تصویر اتاروں گا..“

عینی نے میری طرف دیکھا.. اور پھر جھجکتی ہوئی آگے بڑھی.. کالاش لڑکیوں نے ہنستے ہوئے اپنی زنجیر کو توڑا اور اس میں عینی کو شامل کر لیا..

میں اور تمیر ایک سیاہ رات کی تاریکی میں پوشیدہ.. ایک ٹیلے پر بیٹھے انہیں دیکھتے تھے.. ڈھول بج رہا تھا.. پاؤں دھول اڑاتے تھے.. مسرت کی چیخیں تھیں اور تمیر تصویریں اتار رہا تھا..

وادی کالاش کی سیاہ اور اب ٹھنڈک میں اترتی رات میں ہم اس دائرے کو تکتے تھے جس میں لمبے لبادوں والی سیاہ پوش کافر لڑکیاں سر جھکائے ایک میکانکی انداز میں ڈھول کی تھاپ پر جھکتی تھیں اور اپنی زبان کو ایک خاص انداز میں لپکا کر ”اولو.. لولو..“ کی صدائیں بلند کرتی مسرت میں ڈوبتی ہوئی ناچتی تھیں..

وہ کھیتوں میں مشقت کر کے آتی تھیں..

چارے کے بوجھل گٹھے سارا دن اٹھاتی رہی تھیں..

تو وہ اپنے بدن کی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے.. بیرون گاؤں کے درمیان

میں ایک وسیع پلیٹ فارم میں سایوں کی طرح حرکت کرتی تھیں..

کالاش کے ہر گاؤں میں.. ایک ایسا پلیٹ فارم.. ایک ہموار قطعہ زمین ہوتا ہے جہاں شام ڈھلے لوگ رقص کے لیے جمع ہوتے ہیں..

وہ سوگواری میں ہوں یا سرخوشی میں.. اسی میدان میں آتے ہیں اور اپنی سوگواری کو رقص میں ڈبوتے ہیں.. اپنی سرخوشی کو ناچ میں اجاگر کرتے ہیں..

ان میں سے کچھ کافر مخمور بھی ہوتے ہیں..

اس لیے کہ کالاش میں انگوروں کو صرف ایک سویٹ ڈش کے طور پر.. ایک پھل فروٹ کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا.... جیسے جنوبی فرانس میں جب سرِ شام انگوروں کے باغوں میں اتنے جھینگر بولتے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، میں نے ایک مقامی کسان سے کہا۔ ”کیا آپ مجھے کچھ انگور دے سکتے ہیں؟ میں ان کی ادائیگی کروں گا۔“

”تم ان انگوروں کا کیا کرو گے؟“

”کھاؤں گا—“

”انگور کھانے کی نہیں.. پینے کی چیز ہوتے ہیں..“

چنانچہ جنوبی فرانس کے اس کسان اور کالاش لوگوں کا نکتۂ نظر ایک تھا کہ.. انگور کھانے کی نہیں، پینے کی چیز ہوتے ہیں..

کہا جاتا ہے کہ انگوروں کے موسم میں ایک لڑکی ان وادیوں میں اترتی ہے جہاں ان کی بیلیں ہوتی ہیں اور پھر انگوروں سے بھرا ایک ٹوکرا اٹھائے اوپر آتی ہے.. صرف ایک نہیں.. کئی لڑکیاں..

اور ان انگوروں کو لکڑی کے ایک ٹب میں انڈیلا جاتا ہے اور پھر ایک بڑے پاؤں والے موٹے تازے اور طاقت ور کافر کو ذرا ہنستے ہوئے، مذاق کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ تم ان انگوروں کو مسل سکتے ہو.... پہلے اس کی ٹانگیں دھوئی جاتی ہیں.. اس کے پاؤں صاف کیے جاتے ہیں اور تب وہ انگوروں کے ٹب میں اترتا ہے اور وہ اس اعزاز پر اتنا اتراتا ہے، مسرت سے مغلوب ہوتا ہے کہ بے تحاشا انگوروں پر کودنے لگتا ہے اور پھر اسے سختی سے خبردار کیا جاتا ہے کہ تمہارے اچھلنے سے اور مسلنے سے انگوروں کا

رس چھلک چھلک جاتا ہے، اس لیے تم بندے بن جاؤ.. اور وہ بندہ بن جاتا ہے اور نہایت سنجیدگی سے اپنے پاؤں سے انگوروں کو کچلنے لگتا ہے۔

جب رس نکلتا ہے تو اسے بکری کی کھال کے مشکیزے میں بھرا جاتا ہے..

پہلے روز.. وہ رس بہت شیریں ہوتا ہے..

اور پھر.. آٹھ دس روز گزرتے ہیں تو اس کا ذائقہ ترش ہونے لگتا ہے.. اور وہ شراب میں بدل جاتا ہے..

شراب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی ارتقاء کی..

بائبل کے مطابق حضرت نوح جب طوفان سے فارغ ہوئے اور ایک فاختہ کی چونچ میں دبی زیتون کی پتی سے خشکی کی خبر پا کر زمین پر قدم رکھا تو سب سے پہلے انہوں نے انگور کی بیلیں کاشت کیں.. اور اس کے بعد حضرت نوح کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ میں بیان کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا.. حوالے کے لیے بائبل ملاحظہ کیجئے... کہ کیسے انہوں نے اس کے رس کو نوش کیا اور کیسے ان کے بیٹوں نے ان کی بے حجابی دیکھی اور ہمیشہ کے لیے ملعون ہوئے..

اگرچہ بائبل کا حوالہ ہمارے نزدیک معتبر نہیں..

سرخ وائن کلیسا کی تقدیس میں اہم کردار ادا کرتی ہے..

اور ہم مومنین پر بھی یہ شے تب تک حرام نہ ہوئی جب تک ہم عبادت کے دوران بدمست ہو کر جب سجدے میں گئے تو تادیر وہیں رہے..

لیکن کالاش نہ بدمست ہوئے نہ لاپرواہ ہوئے.. اور نہ برہنہ ہوئے..

ان کے بارے میں رابرٹسن نے بھی اقرار کیا کہ.. میں نے کبھی کسی کافر کو شراب پینے کے بعد ہوش کھوتے نہیں دیکھا.. وہ مخمور اور پر مسرت ہوتے ہیں لیکن بدمست نہیں ہوتے..

تو وادی بمبوریت میں.. اس شب میں جتنے چہرے تھے.. ان میں سے بیشتر گلنار تھے لیکن بدمست نہ تھے..

گلنار چہرے.. جنہوں نے بالآخر خاک کی صورتیں ہونا تھا..

ان کے موتیوں اور مالاؤں نے بوسیدہ تابوتوں میں فنا کے سنگیت سے آشنا

ہو کر ہڈیوں میں بدلنا تھا..

ان رقص کرتی شکلوں میں کوئی ایک تو ہو گی.. جس نے لالۂ و گل میں نمایاں ہونا تھا۔

رات بھیگنے لگی..

ہم بھیگتی رات کی سردی میں کپکپانے لگے..

ہم تھک گئے.. لیکن وہ نہ تھکتے تھے جو مسلسل رقص کرتے تھے..

اور ڈھول کی تھاپ وادی میں گونجتی تھی.. شاید بمبوریت کے بازار میں واقع مسجد کے میناروں تک پہنچتی تھی..

جناح نے لالٹین بجھا دی تھی.. گلنار چہروں کی روشنی بہت تھی..

کبھی کبھار فلیش کی روشنی ان رقص کرتی دوشیزاؤں پر کوندجاتی اور پھر تاریکی ان کو روپوش کر دیتی..

یہ روشنی زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی تھی.. چمکتی تھی اور چلی جاتی تھی کیونکہ ایمان ان کافروں کے تعاقب میں تھا.. وہ گلنار ہوتے اور سرخوشی میں ڈوبتے چہروں کو برداشت ہی نہیں کر سکتا..

وادی بمبوریت میں ہم ایمان والوں کی یہ آخری شب تھی۔

کافروں کے دائرے تھے.. اور ہم ان دائروں کی گرفت میں سے نکل آنے کی کوشش میں تھے... اپنے ایمان کو سلامت رکھنے کی کوشش میں تھے.....

کالاش لڑکیاں دائروں میں حرکت کرتی.. خوشی سے چیختیں.. ناچ رہی تھیں.. ان کے درمیان میں ان کا ایک بزرگ قصے بیان کر رہا تھا اور خود بھی مولانا روم کے ایک درویش کی مانند اپنا سنہری لبادہ گھماتا گھومتا جاتا تھا..

بیشتر سیاح بور ہو کر جا چکے تھے..

عینی، کالاش کی لڑکیوں کی زنجیر میں شامل ہو کر چند تصویریں اتروا چکی تھی اور اب جمائیاں لے رہی تھی..

ان میں تھکاوٹ کے کوئی آثار نہ تھے.. وہ آپس میں چہلیں کرتے، چیختے، باتیں کرتے.. ایک دوسرے کے ساتھ فلرٹ کرتے.. لڑکیاں اپنے من پسند لڑکے

کی جانب سُرے کی دھار کی کٹار چلاتی.. اور کافر نوجوان.. اپنے دل کو موہ لینے والی حسینہ کو اشارے کرتے.. ناچتے چلے جاتے تھے..

وہ ہم جیسے دین دار لوگوں کی موجودگی سے غافل ہو چکے تھے..

چنانچہ ہم نے بھی یہ مناسب جانا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے.. یہ لوگ قطعی طور پر بخشے نہیں جا سکتے.. کافر ہیں.. شراب پیتے ہیں.. رقص کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں تو کیسے بخشے جا سکتے ہیں.. پل صراط پر پہلا قدم رکھتے ہی دو ٹکڑے ہو جائیں گے تو ان سے کیا لینا دینا.. ہم رخصت ہو جائیں تو بہتر ہے.... ڈھول بجانے والے جانے کونسا کشتہ کھا کر آیا تھا کہ تھکتا ہی نہ تھا.. اور رقص کرنے والے ہماری موجودگی سے غافل ہو چکے تھے..

اور کالاش کی سیاہ رات میں سردی بھی اترتی تھی..

ہم اس کفر کی بستی.. سے اٹھے.. آنکھوں میں نیند لیے.. تھکے ہوئے.. پژمردہ اور جناح نے لالٹین پھر سے روشن کر لی اور سوکھی ہوئی ندی کے پتھروں پر پاؤں دھرتا نیچے اترنے لگا..

ہم.. اپنی تہذیب.. ایک اعلیٰ تہذیب کی گہرائیوں میں واپس جا رہے تھے.. جہاں ہم اس قسم کے مخمور کفر اور الحاد سے محفوظ ہو سکتے تھے جس کا مظاہرہ ہم نے اس شب دیکھا تھا..

ہم گئی رات نیچے پہنچے..

اسلم ہمیں ریسٹ ہاؤس واپس لے جانے کے لیے منتظر تھا..

برون کے گاؤں سے ابھی تک ڈھول کی تھاپ نیچے وادی بمبوریت میں گونجتی تھی اور مسجد کے میناروں کے آس پاس گونجتی تھی..

وادی کالاش میں یہ.. ہماری آخری شب تھی..

”ہیملٹ کا قلعہ اور ایک پرنس کی قید میں“

ہم پرنس اسد الرحمٰن کی قید میں تھے..

دریائے چترال کے کناروں پر بلند قدیم قلعے کے اندر.. دنیا جہان سے پوشیدہ.. ایک شیش محل ڈائننگ روم.. نایاب کتابوں اور نسخوں سے بھری لائبریری.. راہداریاں جن پر ماضی کے مہتروں کی بھوری تصویریں جھکتی تھیں، غلام گردشیں اور پرانی ڈھالیں اور بندوقیں اور ان کے اندر ایک سبزہ زار تھا جس کے کناروں پر دبیز فصیل نما کچی دیواریں اتنی بلند ہوتی تھیں کہ سرو کے درخت نیچے رہ جاتے تھے اور آسمان مختصر ہوتا تھا اور ان کے باہر اگر کوئی دنیا تھی تو واہمہ لگتی تھی.. کچی دیواروں کے اندر جو سبزہ زار تھا.. اس کی گھاس بڑھ چکی تھی، کہیں کہیں سفید پھول تھے اور اس میں سے ٹڈے ایک تواتر کے ساتھ اچھلتے تھے.. تو اس چار دیواری کے آخری سرے پر قلعے کی قدیم عمارت کے پہلو میں وہ مہمان خانہ تھا جو ایک مدت کے بعد ہمارے لیے کھولا گیا تھا.. جھاڑ پونچھ کی گئی تھی اور بستر لگائے گئے تھے اور ترچ میر کی ہوا جو پہلے اس کے بند دروازوں پر دستک دے کر لوٹ جاتی تھی، اب اس کے اندر داخل ہوتی تھی اور مہمان خانے کی دیواروں، آتش دان اور پرانے فرنیچر کو اپنے سرد لمس سے آشنا کر کے کسی اور دروازے سے نکل جاتی تھی..

ہم اسی فٹ بال کی گراؤنڈ جتنے کچی اور بلند دیواروں میں گھرے صحن کے کنارے اس مہمان خانے میں قید تھے..

مہمان خانے کے پار ایک کونے میں چند جھاڑیاں اور پھلدار درخت تھے جو نظروں سے چھپاتے تھے اُس دروازے کو جو زنان خانے کے اندر کھلتا تھا.. ان جھاڑیوں

کی قربت میں دو ملازم دم سادھے بیٹھے رہتے تھے اور جونہی کوئی خواہش سر اٹھاتی، کوئی طلب ہوتی تو وہ جان جاتے اور وہ خواہش، وہ طلب فوراً پوری کر دیتے..

میں عام چترالیوں کی مہمان نوازی کے قصے بیان کر چکا ہوں اور یہاں تو سابقہ رائلٹی سے سابقہ تھا..

ہمارے سامنے ایسے ایسے چترالی پکوان سجتے کہ ہم ان کے ذائقے کو دیر تک منہ میں سنبھالتے سوچتے رہتے کہ آخر یہ ہے کیا جو ہم کھا رہے ہیں.. شاید پنیر کی روٹیاں ہیں جن پر کوئی بدخشانی مرغ نہایت خستہ حالت میں فروکش ہے.. اور یہ جو دم پخت گوشت ہے، اس میں جو سبز مرچیں ہیں، ان میں کڑواہٹ کیوں نہیں.. جو سوئیٹس ہیں، وہ ایسی سوئیٹس کیوں ہیں جو ہم نے آج تک نہیں چکھیں..

چنانچہ گوشے میں قفس کے ہمیں آرام بہت تھا..

اور ہم وہ پکھیرو تھے جو اس قید سے آزاد نہیں ہونا چاہتے تھے.. بلکہ ہمیشہ کے لیے قفس میں قیام کرنے کے متمنی تھے..

پرنس اسد چھڑی ٹیکتے ہوئے، مسکراتے اپنی سنہری عینک سنبھالتے آجاتے اور پھر بدخشانی سردے کو اتنی نفاست سے تراشتے کہ ان پر کسی صنم تراشنے والے کا شبہ ہوتا اور وہ بچوں کو سردے کی قاشیں پیش کرتے جاتے کہ ذرا چکھئے نہایت شیریں ہے.. اور بچے جو ابھی ابھی کسی قیمہ بھرے چترالی نان سے فارغ ہوتے تھے ان قاشوں کو انتہائی رغبت سے کھاتے تھے اور اس پیپی پرنس کو محبت سے دیکھتے تھے..

ہم ان سے آج تک سنو ٹائیگر جو بہترین تصویریں اتری ہیں اور نیشنل جیوگرافک میگزین میں شائع ہوئی تھیں، ان کے بارے میں پوچھتے.. کہ یہ تصویریں چترال شہر کے اوپر ان کی شکارگاہ میں اتاری گئی تھیں..

اس کچے حصار کے اندر.. سویر بہت دیر سے اترتی.. اور شام یکدم جدائی کی مانند ہر شے تاریک کر دیتی..

سلجوق اکثر ایک لالٹین اٹھا کر برآمدوں اور محل کے تاریک گوشوں کے اندر.. زرہ بکتروں، قدیم لباسوں اور حنوط شدہ مارخوروں کو دھندلائی ہوئی مٹی کے تیل کی روشنی میں دیکھتا رہتا.. ان میں کھویا رہتا..

ٹمیر کے لیے کوئی ایک بھنورا.. کوئی ایک ٹڈا درکار ہوتا اور وہ اس پر جھکا ہوا اس کی حرکت اور خصلت کا بغور مطالعہ کرتا رہتا..

عینی.. اپنی سہیلیوں کو یاد کرتی، موسیقی سنتی اور پرنس اسد کے ساتھ گپیں لگاتی..

میمونہ کے پاس کتابوں کی رفاقت تھی..

اور میں کچی دیواروں میں گھرے صحن اور سبزہ زار میں ایک آرام کرسی پر دراز.. چپ بیٹھا رہتا.. کچھ نہ کرتا.. کیونکہ میرے لیے چپ رہنا اور کچھ نہ کرنا ایک مکمل عیاشی تھی.. جس شخص کا کاروبار بولنا ہو.. اور لکھنا ہو.. اس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا آرام ہوگا کہ وہ اپنے ذہن کو خالی کر کے کچھ نہ بولے.. کچھ نہ لکھے اور ایک آرام کرسی پر بس بیٹھا رہے.. اور بیٹھا رہے..

ایک شام.. اور ابھی فصیل کے اندر قید صحن میں مدھم شناخت جتنی روشنی تھی.. اور سب لوگ مہمان خانے کے اندر جا چکے تھے.. مجھے ہلسنور یاد آیا.. ڈنمارک کا وہ قلعہ ہلسنور جہاں ایک روایت کے مطابق ولیم شیکسپیئر اپنی تھیٹر کمپنی کے ساتھ ایک اداکار کے طور پر آیا تھا اور وہاں پرفارم کیا تھا اور اس قلعے کے ماحول نے اس پر اتنا اثر کیا تھا کہ اس نے اپنے ڈرامے ہیملٹ کے پرنس آف ڈنمارک کو اس کا باسی بنا دیا..

میں نے بھی ایک شام قلعہ ہلسنور میں گزاری تھی اور یقیناً اس کے در و دیوار بے حد ڈرامائی تھے لیکن رانی کوٹ، لاہور یا روہتاس قلعوں سے بڑھ کر نہیں.. ان قلعوں کی بدنصیبی صرف یہ ہے کہ انہیں کوئی شیکسپیئر نہیں ملا اور ہلسنور کو مل گیا.. ان قلعوں کو ہم جیسے درمیانے درجے کے لکھاری ملے.. گائیڈ ہمیں وہ فصیل دکھاتا جس پر ہیملٹ کے باپ کی روح نمودار ہوتی تھی.. وہ آتش دان جس کے سامنے بیٹھ کر ہیملٹ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے شعلوں میں گھورتا رہتا..

ہیملٹ جو کالاش کے تابوتوں میں پڑی کھوپڑیوں میں "ٹو بی اور ناٹ ٹو بی" کی شکل میں موجود تھا..

اب یہاں قلعہ چترال کی چار دیواری میں تھا.. اس کی کچی دیواروں پر اپنے باپ کی مضطرب روح کو اپنے سے مخاطب پاتا تھا..

مہمان خانے کے آتش دان کے سامنے وہ بھی ہمارے ہمراہ موجود ہوتا..

آتش دان میں لپکتے شعلوں اور جلتی آگ کی سرخ زبانوں کو گھورتا رہتا..

قلعۂ چترال کا ماحول ہلسنور سے کم ڈرامائی نہ تھا.. صرف میں کم تھا.. مجھ میں تخلیق کا وہ جوہر موجود نہ تھا جو اس کی بے مثال اثریت کو اپنے اندر اتار کر ہیملٹ ایسا کوئی کردار تخلیق کر سکتا.....

ہماری بھاگ بھریاں دم توڑ دیتی ہیں اور ہم ان کے لیے وارث شاہ نہیں ہو سکتے..

ایک سویر.. قلعے کے برآمدے میں.. ناشتے کے بعد.. دریائے چترال ہلکے شور میں کہ اسے بلند فصیلوں کو عبور کرنا پڑتا تھا اور ترچ میر پر بادل تھے تو میمونہ نے کہا "یہ ہم کہاں آگئے ہیں؟"

چمن سے نکل کے..

گھر سے نکل کے..

اور ہمیں گھر یاد آنے لگا..

گھر کا ایک ایک گل بوٹا یاد آنے لگا..

اری و کیریا کی اپنے سبزے کے بوجھ سے گرتی شاخیں.. چیڑ کا بلند درخت.. کیکٹس کا کالا پہاڑ.. اپنے صوفے.. استاد محمد علی کا بنایا ہوا پلنگ... استاد اللہ بخش... چغتائی... ایم ایف حسین.. خالد اقبال اور صادقین کی تصویریں.. اپنے فرش.. مختصر باتھ روم.. یہاں تک کہ مالی شریف اور صفائی کرنے والی بڑی اماں.. لاہور کی گرمی اور دھول.. دال ماش اور فوارے میں ٹرّاتے مینڈک.. سب کے سب یاد آنے لگے..

اور ہم ایسے آزردہ ہوئے کہ وہ محل اور قلعہ ہمیں زہر لگنے لگا..

وہ معلوم نہیں کن زمانوں کا قصہ تھا جب ہم اپنے گھر سے نکلے تھے.. شاید تب.. جب اہرام مصر تعمیر کیے جا رہے تھے.. یا ایسٹر آئی لینڈ کے بڑی ناکوں والے پتھریلے مجسمے تراشے جا رہے تھے اور کالاش کے قبرستانوں میں ایستادہ کیے جانے والے چوبی گھڑ سواروں کی ناکیں بھی حیرت انگیز طور پر ان سے مشابہ تھیں.. یا ہڑپہ اور موہنجو ڈارو کے آس پاس آریائی حملہ آوروں کے گھوڑوں کی دھول تھی... سکندر حیرت سے چناب کو تکتا تھا کہ اس کے پار کیسے اتروں.... اور سوہنی ایک کچے گھڑے پر اسی دریا میں اتر گئی تھی.. تو یقیناً یہ انہی زمانوں کا قصہ ہو گا جب ہم نے گھر چھوڑا تھا..

گھر سے نکل کے ہم کہاں کہاں نہیں گئے تھے..

ہم سب الف لیلے کے کسی داستان گو کی طرح داستانیں بیان کرنے لگے....

صبح سویرے ناشتے کے بعد.. پھر دوپہر میں.. پھر رات کو آتش دان کے پاس ہیملٹ کی موجودگی میں..

"ابو شملہ پہاڑی پر.. ایبٹ آباد کا وہ ریسٹ ہاؤس یاد ہے.. پچھلی رات تو ہم وہیں ٹھہرے تھے.."

"اور پھر شاہراہ قراقرم پر.. پتن کی ایک رات.. گلگت میں.. گوپس اور یاسین میں.. اور پھر وادی پھنڈر میں.. یاد ہے ابو؟"

"ہاں.. جب میں نے ریسٹ ہاؤس کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے چوکھٹے میں سے وادی پھنڈر کی تصویر دیکھی تھی... اور مجھے مغالطہ ہوا تھا کہ یہ ایک فریم شدہ تصویر ہے.."

"اور ابو میری ٹراوٹ مچھلی.."

"اور ابو جب آپ لوگ لنگر کی ندیوں میں نہاتے تھے اور ہم سیون اپ پی کر اس کی جھاڑیوں میں.. میں اور امی لڈو کھیلتے تھے.."

"شندور ہٹ کی میز میں جو کرنٹ تھا اور ہم نیچے ہر چلین میں اتر گئے تھے.."

اور میں نے ذرا الگ ہو کر اس اندھیری شب کو یاد کیا جو ایک کچے قلعے کے ایک کچے کمرے میں.. پرانی بندوقوں اور تصویروں تلے شہتوت کی تیز دھار سفیدی والے مشروب میں گزری تھی..

مستوج کا قلعہ.. کوغزی کے انار اور مسجد.. کالاش کے قبرستان اور ڈھول کی دھمک.. اور اب ایک پیپی پرنس کی مہمان نواز قید میں..

میں نے ایک ایسا سفر کیا تھا.. دریائے سندھ کے کناروں پر.. دشوار ترین راستوں پر.. دور دراز کی وادیوں تک.. بلند دروں سے پرے.. کافروں کی بستیوں تک.. جو کوہ نورد کرتے رہتے ہیں لیکن اپنے بچوں کی متاع کے ساتھ بیوی کے ہمراہ تو ہرگز نہیں کرتے.. ہم سب جان گئے تھے کہ.. اب کسی تاج محل میں بھی ایک پل نہیں ٹھہرا جا سکتا.. ہمیں اپنا جھونپڑا درکار تھا..

ہمارے خیموں کے گرد گھاس اگنے لگی تھی اور ہمیں ہر صورت کوچ کر جانا

تھا.. یہ درست نہیں کہ خانہ بدوش کا کوئی گھر نہیں ہوتا..

ہوتا ہے..

وہ اگر موسموں کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے تو جانتا ہے کہ اس ندی کے پار.. اس درّے کی برفوں سے پرے.. اور اس جنگل کے آخر میں.. ہم خیمہ زن ہوں گے.. اور ہماری اگلی منزل فلاں چشمے کے کنارے ہوگی..

تو یہ سب اس کے گھر ہوتے ہیں..

وہ بار بار اپنے طے شدہ مقامات پر خیمہ نصب کرتا ہے.. جہاں پانی ہو.. خوراک ہو.. دودھ ہو..

بس وہی گھر ہوتا ہے..

اور ہم اپنے پانی کے لیے.. اپنی خوراک اور اپنے دودھ کے لیے اداس ہو چکے تھے اور اب ایک لمحہ بھی ٹھہرنے کے روادار نہیں ہو سکتے تھے..

چنانچہ اگلے روز ہم اس پچی پرنس کی قید سے فرار ہو گئے.. اگرچہ اس سے اجازت لے کر.. اس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر کے لیکن ہم فرار ہو گئے..

ابھی قلعہ چترال کے در و دیوار شب کی سیاہی میں سے نکلے نہ تھے.. جب ہم نکلے.. دریائے چترال کے کنارے جو بلند راستہ تھا، وہ ہماری دونوں جیپوں کی ہیڈ لائٹس سے روشن ہوتا تھا..

تاریکی میں بھی ترچ میر ایک برہنہ تلوار کی طرح سفید اور دل کش تھی اور نظر آتی تھی..

اور جب روشنی اتری تو لواری ٹاپ کی جانب جانے والی سڑک کے کنارے آیون کا سنگ میل دکھائی دیا.. اور ایک راستہ نیچے اترتا تھا.. دریائے چترال کے پار جاتا تھا اور وادی کالاش کو جاتا تھا.. لیکن ہم گزر گئے.. سرسری گزر گئے..

ہم جانتے تھے کہ چند روز میں وادی کالاش کے پہاڑوں پر برف گرنے لگی اور مارخور نیچے آنے لگیں گے..

اور.. یہ چھوٹے مارخور کا دن ہو گا..

اور جب کوش ہلتی ہے تو میری چھاتیوں سے دودھ بہنے لگتا ہے..

میں ساری رات چولہے پر رکھی کیتلی کی طرح اس کی یاد میں ابلتی ہوں..

اور مرد کہتا ہے..

وہ نہیں جانتی کہ میں اس کے بارے میں کیا سوچتا ہوں..

میں دعا کرتا ہوں کہ صرف ایک بار.. میں اس کی شکل دیکھ سکوں کہ.. اس کی گردن ایک مینا کی طرح ہے..

اور اس کا نازک اور چھریرا بدن مجھے پاگل کر دیتا ہے..

ذرا ایک لمحے کے لیے میرے پاس آؤ..

ذرا ایک لمحے کے لیے.. اے غزال تم مجھے "جنگلی جنگلی" کہو..

ذرا ایک لمحے کے لیے میرے پاس آ بیٹھو..

اور ایک مینا کی طرح چہچہانے لگو..

کیونکہ پہاڑوں پر برف گرنے لگی ہے..

اور مارخور نیچے آ رہے ہیں....

اور جب روشنی اتری تو درّہ لواری کی پُر پیچ بلندی جیپوں کے سامنے تھی..

اس درے کے پار دیر کی ریاست تھی.. سوات تھا.. درّہ ملاکنڈ تھا.. تخت بائی تھا.. نوشہرہ.. اٹک.. اسلام آباد.. اور لاہور تھا.. جہاں ہمارا اپنا پانی تھا.. خوراک تھی اور دودھ تھا..

شاید ہم سب نے.. میں نے، میمونہ نے، سلجوق، سمیر اور عینی نے درّہ لواری سے پلٹ کر ان طویل مسافتوں پر نگاہ کی جو ہم طے کر کے آئے تھے..

ہم ان کو بیان نہیں کر سکتے تھے..

تو کون بیان کر سکتا تھا؟..

کوئی جہاں گرد...

کوئی صحرا نورد.. کوہ نورد.. خانہ بدوش.. آوارہ گرد..

نہیں!

صرف ایک طوائف..

جس نے کبھی صحرا نہ دیکھا تھا.. کوہ نوردی سے ناآشنا تھی.. خانہ بدوشی سے

ناواقف تھی.. آوارگی جانتی تھی، آوارہ گردی کو نہیں..

لیکن.. جس کے تجربوں میں صحرا بھی تھے اور کوہ بھی.. اگرچہ وہ صحرا اور کوہ الگ تھے.. تنہائی اور بے بسی کے صحرا تھے.. بدنامی کے کوہِ گراں تھے..

اور اس کا نام.. امراؤ جان ادا تھا..

تو صرف اس نے.. کسی بڑے ادیب یا شاعر نے نہیں.. ایک طوائف نے ان مسافتوں اور اذیتوں کو بیان کیا.. جو ہم طے کر کے آئے تھے۔

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے اداؔ
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی